بسا اوقات انسان لاعلمی میں دوسروں کو تکلیف پہنچا رہا ہوتا ہے اور اُسے احساس تک نہیں ہوتا۔ اسی بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ کتاب لکھی گئی ہے

کسی کو تکلیف نہ دیجئے

اس کتاب میں قرآن کریم اور احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں اکابر کے مستند واقعات کے ساتھ مندرجہ ذیل اُمور کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔

- دوسروں کو تکلیف سے بچانے کے انداز و فوائد
- دوسروں کو خوش رکھنے اور خیر خواہی کی تدابیر
- معاشرت و معاملات کی درستگی کی ترغیب
- بُرے اخلاق سے بچنے کے نصیحت آموز مضامین

یقیناً ایک ایسی کتاب جس سے خوش گوار زندگی کا راستہ ملے۔

جمع و ترتیب

• مُحمّد حنیف عبدالمجید • مُحمّد جاوید

فضلاء جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن

بیت العلم ٹرسٹ

بسا اوقات انسان لاعلمی میں دوسروں کو تکلیف پہنچا رہا ہوتا ہے اور اُسے
احساس تک نہیں ہوتا۔ اسی بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ کتاب لکھی گئی ہے

کسی کو تکلیف نہ دیجئے

اس کتاب میں قرآن کریم اور احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں اکابر کے
مستند واقعات کے ساتھ مندرجہ ذیل اُمور کا اِہتمام بھی کیا گیا ہے۔

- دوسروں کو تکلیف سے بچانے کے انداز و فوائد
- دوسروں کو خوش رکھنے اور خیر خواہی کی تدابیر
- معاشرت و معاملات کی درستگی کی ترغیب
- بُرے اخلاق سے بچنے کے نصیحت آموز مضامین

یقیناً ایک ایسی کتاب جس سے خوش گوار زندگی کا راستہ ملے۔

جمع و تالیف
محمد جاوید
(فاضل جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی)

تقریظ
حضرت مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ
استاذ الحدیث و رفیق شعبہ تصنیف بالجامعۃ الفاروقیہ کراچی

مکتبہ بیت العلم
G-30، اسٹوڈنٹ بازار، نزد مقدس مسجد،
اردو بازار، کراچی۔ فون: 2726509

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

11020308

اسٹاکسٹ

مکتبہ بیت العلم

نزد جامع مسجد نیو ٹاؤن کراچی

فون: 021-4916690,2018342 موبائل: 0300-8213802

فیکس: 4914569-21-92+ ای میل: Sales@mbi.com.pk

کتاب کا نام: .... کسی کو تکلیف نہ دیجیے

اشاعت دوم: ...... ۱۴۲۹ھ بمطابق ۲۰۰۸ء

ناشر: .... بیت العلم ٹرسٹ

ST-9E بلاک ۸، گلشن اقبال، کراچی

فون نمبر: 4976073-21-92+ فیکس: 4972636-21-92+

ویب سائٹ: www.mbi.com.pk

ملنے کے دیگر پتے

☆ مرکز القرآن / بیت القرآن، اردو بازار کراچی۔	فون: 021-2630744
☆ مکتبہ فہیم الدین، نزد مسجد بیت السلام ڈیفنس کراچی۔	فون: 021-5392171
☆ مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار لاہور۔	فون: 042-7224228
☆ ادارہ اسلامیات، اردو بازار، لاہور۔	فون: 042-7243991
☆ مکتبہ امدادیہ، ٹی۔ بی روڈ، ملتان۔	فون: 061-4544965
☆ کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار مدینہ کلاتھ مارکیٹ، راولپنڈی۔	فون: 051-5771798
☆ اسلامیہ کتب خانہ، کاڈی اڈہ ایبٹ آباد۔	فون: 0992-340112
☆ مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ، کوئٹہ۔	فون: 081-662263
☆ کتاب مرکز، فیریئر روڈ، سکھر۔	فون: 071-5625850
☆ حافظ اینڈ کو، لیاقت مارکیٹ، نواب شاہ۔	فون: 0244-360623
☆ بیت القرآن، نزد ڈاکٹر ہارون والی گلی، چھوٹی گھٹی، حیدرآباد	فون: 022-3640875
☆ حافظ کتب خانہ، مردان۔	
☆ مکتبہ المعارف، محلہ جنگی، پشاور۔	

کسی کو تکلیف نہ دیجیے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

ضروری گزارش

اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ

حضرات علماء کرام اور معزز قارئین کی خدمت میں نہایت ہی عاجزانہ التماس کی جاتی ہے کہ حتی الامکان ہم نے کتاب میں تصحیح وتخریج کی پوری کوشش کی ہے تاکہ ہر بات مستند اور باحوالہ ہو پھر بھی اگر کہیں مضمون یا حوالہ جات میں سُقم وضُعف یا اَغلاط نظر آئیں تو ازراہِ کرم ناشر کو ضرور مطّلع فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں وہ غلطی باقی نہ رہے۔

مزید اس کتاب کے متعلق کوئی اصلاحی تجویز ہو تو ضرور بتائیں۔ اس کتاب کی تصحیح اور کتابت پر اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کافی محنت ہوئی ہے امید ہے قدردان لوگ مسلمانوں کے لئے کی گئی اس محنت کو دیکھ کر خوش ہوں گے اور اللہ تعالیٰ سے قبولیت کی دعا کرتے رہیں گے۔

جَزَاكُمُ اللّٰهُ خَيْرًا

آپ کی قیمتی آراء کے منتظر

احباب بیت العلم ٹرسٹ

فہرست مضامین

تقریظ ۱۳
مقدمہ ۱۵
تکلیف سے بچاؤ کا پہلا راستہ ۱۹
آداب معاشرت کا لحاظ ۱۹
اللہ والوں کی صحبت ۲۰
کسی کو تکلیف نہ دینے کے فوائد ۲۱
دنیا جنت بن جائے گی ۲۲
امام غزالی رحمہ اللہ کا خطاب ۲۳
انصاف، بھلائی اور صلہ رحمی ۲۳
تکلیف سے بچاؤ کا دوسرا راستہ ۲۸
گھر میں داخل ہوتے وقت اجازت طلب کرنا ۲۸
اجازت طلب کرنے کی حکمتیں اور اہم مصلحتیں ۳۰
اجازت طلب کرنے کا مسنون طریقہ ۳۳
اجازت لیتے وقت اپنا نام بھی ظاہر کرے ۳۵
دستک کے بعد خاموشی خلاف ادب ہے ۳۶
درمیانے انداز میں دستک دے ۳۷
اجازت کے لئے جدید طریقوں کا استعمال ۳۷
ملاقات کا اصرار نہ کرے ۳۸
انتظار کے بعد جواب نہ آئے تو لوٹ جائے ۳۹
عالم یا بزرگ کے دروازے پر بغیر دستک دیئے انتظار کرنا ۴۱

تکلیف سے بچاؤ کا تیسرا راستہ ۴۲

کسی کا مذاق اُڑانے اور برے القابات دینے سے بچئے ۴۲

پہچان کی غرض سے بعض القابات سے پکارنا جائز ہے ۴۷

اچھے القابات سے یاد کرنا سنت ہے ۴۸

تکلیف سے بچاؤ کا چوتھا راستہ ۴۸

بدگمانی اور غیبت کی ممانعت ۴۸

(۱) حرمتِ سوءِ ظن ۴۹

ظن کی کل پانچ اقسام ہیں ۵۰

(۲) حرمتِ تجسس ۵۲

کسی کا خط بلا اجازت دیکھنا ۵۳

کسی کا فون سننا ۵۵

(۳) حرمتِ غیبت ۵۵

غیبت کرنے والے کے لئے وعیدیں ۵۷

مسلمان کی عزت وحرمت کا مقام ۶۰

غیبت کا دُنیاوی اور اُخروی نقصان ۶۱

تکلیف سے بچاؤ کا پانچواں راستہ ۶۳

زبان اور ہاتھ کی حفاظت ۶۳

زبان سے تکلیف نہ دینے کا مطلب ۶۶

زبان کے ڈنک کا ایک قصہ ۶۷

زبان کی آفتیں ۶۸

زبان بڑی خوفناک چیز ہے ۶۹

کم گوئی اختیار کرنے کے طریقے ۷۰

(۱) تکلیف کا پہلا سبب: لاؤڈ اسپیکر کا غلط استعمال ۷۳

(۲) تکلیف کا دوسرا سبب: ناجائز تجاوزات ۷۸

(۳) تکلیف کا تیسرا سبب: گزرگاہوں میں رُکاوٹ ڈالنا ۸۰

(۴) تکلیف کا چوتھا سبب: شاہراہوں پر کھیلنا ۸۲

(۵) تکلیف کا پانچواں سبب: غلط پارکنگ ۸۳

(۶) تکلیف کا چھٹا سبب: غلط ڈرائیونگ ۸۹

(۷) تکلیف کا ساتواں سبب: اوقات ضائع کرنا ۹۱

ضیاعِ وقت خودکشی ہے ۹۷

ٹیلیفون پر لمبی بات کرنا ۹۸

(۸) تکلیف کا آٹھواں سبب: مشترک اشیاء کا غلط استعمال ۹۹

مشترک بیت الخلاء کا استعمال ۱۰۲

(۹) تکلیف کا نواں سبب: پسینے کی بو ۱۰۸

(۱۰) تکلیف کا دسواں سبب: بلا اجازت کسی کی چیز استعمال کرنا ۱۰۹

(۱۱) تکلیف کا گیارہواں سبب: کسی ادارے کی طرف سے میسر سہولیات کا غلط استعمال ۱۱۲

(۱۲) تکلیف کا بارہواں سبب: عدمِ تعاون ۱۱۷

یونین کے ساتھ تعاون ۱۱۷

شاگرد کے ساتھ تعاون ۱۱۸

(۱۳) تکلیف کا تیرہواں سبب: دیواروں پر چاکنگ ۱۱۹

(۱۴) تکلیف کا چودہواں سبب: بے موقع سلام کرنا ۱۲۳

(۱) تلاوت قرآن کے وقت سلام کرنا ۱۲۳

(۲) بغیر سلام کے مصافحہ کرنا ۱۲۴

بڑے بھائی کا ایک دل چسپ واقعہ ۱۲۴

بعض جگہ سلام کرنا مکروہ ہے ۱۲۵

سلام کی وجہ سے فرض نماز ٹوٹ گئی ۱۲۵

مصافحہ کے آداب ۱۲۵

مجلس کے دوران سلام کرنا ۱۲۶

کھانا کھانے والے کو سلام کرنا ۱۲۶
⑮ تکلیف کا پندرہواں سبب: گالم گلوچ وفحش گوئی ۱۲۷
⑯ تکلیف کا سولہواں سبب: کسی کو ذہنی تکلیف میں ڈالنا ۱۲۸
ذہنی تکلیف میں مبتلا کرنا حرام ہے ۱۲۹
ملازم پر ذہنی بوجھ ڈالنا ۱۳۰
تکلیف سے بچاؤ کا چھٹا راستہ ۱۳۱
جھوٹ سے پرہیز ۱۳۱
① جھوٹ کا پہلا وبال: فرشتوں کی نفرت ۱۳۱
② جھوٹ کا دوسرا وبال: گناہ کبیرہ کا ارتکاب ۱۳۳
③ جھوٹ کا تیسرا وبال: مال سے برکت کا خاتمہ ۱۳۴
④ جھوٹ کا چوتھا وبال: اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ۱۳۵
⑤ جھوٹ کا پانچواں وبال: جھوٹی گواہی کا ارتکاب ۱۳۵
⑥ جھوٹ کا چھٹا وبال: وعدہ خلافی کا ارتکاب ۱۳۶
⑦ جھوٹ کا ساتواں وبال: منافقت کی علامت ۱۳۶
قرض خواہ کو تکلیف پہنچانا ۱۳۷
تکلیف سے بچاؤ کا ساتواں راستہ ۱۳۹
لعن طعن سے پرہیز ۱۳۹
تکلیف سے بچاؤ کا آٹھواں راستہ ۱۴۱
تہمت والزام تراشی سے پرہیز ۱۴۱
تہمت لگانے والے کی سزا ۱۴۲
خواتین اور تہمتیں ۱۴۳
اپنے عزیز اور بیوی بچوں کو تکلیف سے بچائیے ۱۴۳
تکلیف سے بچاؤ کا نواں راستہ ۱۴۵
بغیر دباؤ کے جائز سفارش ۱۴۵

حاجت مند کی سفارش کردو ۱۴۵
سفارش کے احکام ۱۴۶
① نااہل کے لئے منصب کی سفارش ۱۴۶
② سفارش، شہادت اور گواہی ہے ۱۴۷
③ بری سفارش گناہ ہے ۱۴۷
④ سفارش کا مقصد صرف توجہ دلانا ۱۴۸
⑤ سفارش ایک مشورہ ہے ۱۴۹
تکلیف سے بچاؤ کا دسواں راستہ ۱۵۰
معاملات کی صفائی ۱۵۰
معاملات کی صفائی ـــــ دین کا اہم رکن ۱۵۰
تین چوتھائی دین معاملات میں ہے ۱۵۰
معاملات کی خرابی کا عبادت پر اثر ۱۵۱
معاملات کی تلافی بہت مشکل ہے ۱۵۱
حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ اور معاملات ۱۵۲
ایک سبق آموز واقعہ ۱۵۲
حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک واقعہ ۱۵۳
معاملات کی خرابی سے زندگی حرام ۱۵۴
حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا چند مشکوک لقمے کھانا ۱۵۵
حرام کی دو قسمیں ۱۵۶
باپ بیٹوں کے مشترک کاروبار ۱۵۶
باپ کے انتقال پر میراث کی تقسیم فوراً کریں ۱۵۷
مشترک مکان کی تعمیر میں حصہ داروں کا حصہ ۱۵۷
حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور ملکیت کی وضاحت ۱۵۹
حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی احتیاط ۱۵۹

حساب اسی دن کر لیں ۱۶۰
حقیقی مفلس کون؟ ۱۶۱
تکلیف سے بچاؤ کا گیارہواں راستہ ۱۶۳
خوش اخلاقی ۱۶۳
دین میں اخلاق کا درجہ ۱۶۵
اخلاق کے مراتب ۱۶۶
"حسنِ اخلاق" کسے کہتے ہیں؟ ۱۶۸
"بَذْلُ الْمَعْرُوْف" کی صورتیں ۱۶۹
"کف الأذیٰ" کی تفصیل ۱۷۰
گھریلو آداب معاشرت کی رعایت نہ رکھنے کی مثالیں ۱۷۱
ہمیشہ کا لفظ بڑا خطرناک ہے ۱۷۲
کفُّ الاذیٰ کی مثالیں ۱۷۳
تبسم ...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص سنت ۱۷۳
بعض لوگوں کے نہ مسکرانے کی وجوہات ۱۷۴
مسکرانے کے فوائد ۱۷۵
مسکرانے کے معاشرتی اثرات ۱۷۸
خندہ پیشانی سے ملاقات کرنا "صدقہ" ہے ۱۷۸
دوسروں کو خوش رکھئے ۱۷۹
دوسروں کو خوش کرنے کا نتیجہ ۱۸۰
گناہ کے ذریعے دوسروں کو خوش نہ کریں ۱۸۱
فیضی شاعر کا واقعہ ۱۸۱
اللہ والے دوسروں کو خوش رکھتے ہیں ۱۸۲
امر بالمعروف کو نہ چھوڑے ۱۸۳
نرم انداز سے نہی عن المنکر کرے ۱۸۴

نظم وضبط کی پابندی تکلیف سے بچنے کا ایک حل ۱۸۴
تکلیف سے بچاؤ کا بارہواں راستہ ۱۸۶
مخلوقِ خدا سے ہمدردی وخیر خواہی ۱۸۶
دین اور خیر خواہی لازم وملزوم ۱۹۰
مخلوق سے ہمدردی خالق سے محبت کی علامت ۱۹۲
حضرت یوسف علیہ السلام کی خیر خواہی ۱۹۳
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی اُمت کے ساتھ خیر خواہی وشفقت ۱۹۶
خاموش خدمت ۲۰۸
حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ۲۱۰
ایثار وہمدردی کی تین بہترین مثالیں ۲۱۲
نصیحت آموز پہلو ۲۱۶
نفرت گناہ سے ہو گناہ کرنے والے سے نہ ہو ۲۱۷
حیوانات کے ساتھ خیر خواہی کی مثالیں ۲۱۸
باندی کے ساتھ بھلائی وخیر خواہی ۲۲۲
غیر مسلموں سے ہمدردی وبھلائی ۲۲۲
دو سوکنوں کی ہمدردی ۲۲۳
سوکن کا سبق آموز خط ۲۲۷
ایثار وہمدردی کی جیتی جاگتی تصویر ۲۲۹
حاجت مندوں کے ساتھ بھلائی وخیر خواہی ۲۳۳
ضعیفوں کے ساتھ خیر خواہی ۲۳۳
حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ ۲۳۵
مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی اولاد کو مشفقانہ نصیحت ۲۳۶
رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی وہمدردی ۲۳۹
تمام انسان آپس میں رشتہ دار ہیں ۲۳۹

حقوق کی ادائیگی سکون کا ذریعہ ہے	۲۳۹
اللہ کے لئے اچھا سلوک کرو	۲۴۰
شکریہ اور بدلے کا انتظار مت کرو	۲۴۱
صلہ رحمی کرنے والا کون ہے؟	۲۴۲
ہمیں رسموں نے جکڑ لیا ہے	۲۴۳
تقریبات میں "نیوتہ" دینا حرام ہے	۲۴۳
تحفہ کس مقصد کے تحت دیا جائے؟	۲۴۴
مقصد جانچنے کا طریقہ	۲۴۵
دوسروں کو تکلیف سے بچانے کا اتنا اہتمام!!!	۲۴۷
خدمت کا صلہ	۲۴۸
خدمت سے کیا ملتا ہے	۲۵۱
حضرت مولانا غلام رسول پونٹوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا مقام	۲۵۱
خدمت کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے چند ارشادات	۲۵۴
مسلمانوں کی خدمت	۲۵۴
خدمت کی تین شرط ہیں	۲۵۵

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تقریظ

حضرت مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ العالی

استاذ الحدیث، جامعہ فاروقیہ، کراچی

بیت العلم کے احباب کو اللہ تعالیٰ بہترین جزائے خیر عطا فرمائے کہ اُن کی تصانیف و تالیفات معاشرہ کے ہر فرد کے لئے مفید ہوتی ہیں اور یہ کتابیں ایک ہمدرد، مصلح وعربی استاذ کی حیثیت رکھتی ہیں جس میں عورتوں ...... نوجوانوں ...... اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ مستند اقوال و واقعات بھی ہوتے ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ حال ہی میں ان کی ایک تصنیف "اسمائے حسنیٰ" منظر عام پر آچکی ہے اور اب ان کی زیر پرستی اور مولانا اختر علی صاحب (سابق استاذ، جامعہ فاروقیہ) کی نگرانی میں یہ نئی تالیف "کسی کو تکلیف نہ دیجئے" منظر عام پر آرہی ہے۔

ایذاء مسلم یعنی کسی مسلمان کو تکلیف و اذیت میں مبتلا کرنا حرام اور گناہ کبیرہ ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی تکلیف سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں ...... ہمارا آج کا معاشرہ جن آفتوں اور کمزوریوں کا شکار ہو چکا ہے ان میں "اذیت رسانی" سرفہرست ہے رشتہ دار، رشتہ داروں سے شاکی ہے اور پڑوسی کو پڑوسیوں سے گلہ ہے، محلے کے چند اوباش اودھم مچاتے ہیں تو سارا محلہ کرب و اذیت کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے، سارا مسئلہ اصل میں تربیت کا ہے آج اگر ہم اپنی نئی نسل کی تربیت کی ذمہ داری کو محسوس کریں اور

اسلامی خطوط پر ان کی تربیت کی فکر اور اس کے لئے سنجیدہ کوشش میں لگ جائیں تو ان شاء اللہ معاشرے کی یہ کمی دور ہو سکتی ہے...... یہ کتاب اسی فکر اور کوشش کی ایک کڑی ہے، اللہ کرے یہ بارآور ہو اور جس مقصد کے لئے یہ مرتب کی گئی ہے وہ اس سے حاصل ہو جائے۔ آمین

ابن الحسن عباسی
۲۸ محرم ۱۴۲۷ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مقدمہ

تمام تعریفیں اُس ذات پاک کے لئے ہیں جس نے اس کائنات کو عدم سے وجود بخشا اور اسے انسان کے رہنے کے لئے عارضی مسکن بنایا، پھر اس عارضی قیام گاہ میں انسان کی تعلیم و تربیت و اصلاح کے لئے انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات مبعوث فرمائے۔

درود و سلام نازل ہو اس عظیم ہستی پر جس نے اس کائنات میں حق کا بول بالا کیا اور انسان کو تعلیماتِ ہدایت اور آدابِ معاشرت کے نور سے منور فرمایا۔

رحمتِ کاملہ نازل ہو اُن عظیم اور پاک باز ہستیوں پر جنہوں نے اسلام کے لئے اپنا وقت، جان اور مال وقف کر دیا اور اسلام کی خاطر ہر قسم کی ''تکلیف'' کو برداشت کرتے رہے۔

دینِ اسلام کے پانچ شعبے ہیں: عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاقیات جو ان پانچوں پر عمل کرے گا وہی پورا دین دار کہلائے گا۔

دین کے ایک اہم شعبے ''معاشرت'' کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے یہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔

''کسی کو تکلیف نہ دیجئے'' ایک ایسا عنوان ہے جس میں ایک معاشرتی نظام کے تحت زندگی گزارنے کے تمام زریں اصول آجاتے ہیں جو اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے اس دنیا میں متعارف کرائے۔ اسلام کا یہ معاشرتی نظام جس نے مختلف طبقات میں بٹی ہوئی انسانیت کو اخوت اور بھائی چارگی کی دولت عطا کی، جس نے جاہلیت کی تمام خود ساختہ قدریں ختم کر ڈالیں، جس نے علاقائی و جغرافیائی،

رنگ و نسل کے درجات کی مکمل نفی کی اور ایک ایسے معاشرے کو جنم دیا جس میں کسی عربی کو عجمی پر اور کسی گورے کو کالے پر کوئی فوقیت نہیں۔

چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ﴾[1]

ترجمہ: ”اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک (ہی) مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور اس لئے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو تمہارے قبیلے اور کنبے بنا دیئے ہیں بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ دانا اور باخبر ہے۔“

جس انسان کو معاشرے میں ذلیل سمجھا جا رہا ہے اور جو اُسے ذلیل سمجھ رہے ہیں دونوں ایک آدم علیہ السلام ہی کی اولاد ہیں۔

لہٰذا حقیر سمجھ کر کسی کی بات پر توجہ نہ دینا اور کسی کو اہمیت نہ دینا انسانیت کا شیوہ نہیں۔

نبی اکرم ﷺ نے اپنے ارشاد مبارک میں بھی اسی بات کی خوب وضاحت کی ہے آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

”اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں سے زمانہ جاہلیت کا فخر اور اپنے آباو اجداد کی وجہ سے تکبر کرنا دور کر دیا ہے، اب دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو اللہ کے نزدیک نیک متقی اور کریم ہیں۔ دوسرے وہ جو اللہ کے نزدیک بدکار، بدبخت اور ذلیل ہیں تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور

[1] الحجرات: ۱۳

اللہ تعالیٰ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔“[1]

جب انسان کو اُس کا اصل مقام یاد دلایا جائے تب ہی وہ معاشرے میں دوسرے انسان کا خیال رکھ سکتا ہے۔ اور اُس کے مسائل زیادہ اچھے انداز میں سمجھ سکتا ہے، دوسرے کے دُکھ، درد اور تکلیف کا احساس کر سکتا ہے۔ کیوں کہ معاشرے میں رہتے ہوئے ہر فرد کے عمل کا اثر دوسرے افراد پر پڑتا ہے گھر میں رہتے ہوئے، بازار میں چلتے ہوئے، خرید و فروخت کرتے ہوئے، تعلیمی اداروں میں پڑھتے ہوئے یا پڑھاتے ہوئے، انتظامیہ میں کام کرتے ہوئے، عدلیہ میں انصاف دیتے یا طلب کرتے ہوئے، تجارت میں لین دین کرتے ہوئے، کارخانے میں انتظام چلاتے یا کام کرتے ہوئے، سفر کرتے ہوئے، سڑک پر گاڑی چلاتے ہوئے یا فٹ پاتھ پر پیدل چلتے ہوئے، دوستوں سے ملتے ہوئے، مخالفین سے بات کرتے ہوئے، یہاں تک کہ بہت سے نجی کام کرتے ہوئے ہر فرد کا دوسرے فرد پر اثر پڑتا ہے، یہ اثر اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی، اس اثر کو اچھا بنانے کے لئے یا اس کے تکلیف دہ اثرات کو کم کرنے کے لئے اسلام نے کچھ اصول اور قوانین بتائے ہیں۔

چناں چہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

”اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ.“[2]

ترجمہ: ”کامل مسلمان وہی ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔“

اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے کامل مسلمان اُس شخص کو فرمایا جس کی زبان و ہاتھ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے، یعنی کسی کو تکلیف نہ دینا اور تکلیف سے بچانا اسلام کے کامل ہونے کی نشانی ہے۔

[1] ترمذی، تفسیر: ۱۶۳/۲

[2] بخاری: ۱/۶، کتاب الإیمان

اور رسول کریم ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے: "اللہ کے بندوں کو تکلیف مت پہنچاؤ اور نہ انہیں عار دلانا اور نہ ہی اُن کے عیوب تلاش کرنا اس لئے کہ جو اپنے مسلمان بھائی کی پردہ دری کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی پردہ دری فرماتے ہیں یہاں تک کہ گھر بیٹھے اس کو رُسوا کرتے ہیں[1]۔"

ایسے ہی ارشادات مبارکہ کے پیش نظر بندے نے کچھ مضامین ساتھیوں کو دیئے اور پھر مولانا اختر علی صاحب (استاذ جامعہ فاروقیہ) کی زیر نگرانی مولانا محمد جاوید، مولانا ارشد محمود اور مولانا ارشد اقبال (زید مجدہم) نے تصحیح و ترتیب، عنوانات کی تسہیل، حوالہ جات اور تخریج احادیث میں تعاون فرمایا فَجزَاهُمُ اللّٰهُ خَيْرَ الْجَزَاء۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم سب کو ایک دوسرے کا حق پہچاننے اور ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے کہ کسی کو ہم سے تکلیف نہ پہنچے، اس کتاب کی تیاری کے سلسلے میں بندہ اپنے معاونین کا بھی بہت ہی دل سے شکریہ ادا کرتا ہے۔ اور دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو مؤلف، معاونین اور تمام مسلمانوں کے لئے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمِیْن یَا رَبَّ الْعٰلَمِیْن۔

محمد حنیف عبدالمجید

۲۴ محرم الحرام ۱۴۲۷ھ ۲۳ فروری ۲۰۰۶ء

[1] مسند احمد: ۵/۲۷۹، رقم: ۲۱۸۹۶، ثوبان رضی اللہ عنہ

تکلیف سے بچاؤ کا پہلا راستہ

آداب معاشرت کا لحاظ:

دین کے پانچ شعبوں (عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاق) میں سے چوتھے شعبہ یعنی معاشرت سے متعلق کئی احادیث میں ہدایات بیان فرمائی گئی ہیں۔ یوں تو معاشرت کے بے شمار مسائل ہیں لیکن ان مسائل اور آداب کی بنیاد ایک بنیادی اصول اور قاعدہ کلیہ ہے۔ اس قاعدہ کلیہ کے تحت ہی سارے مسائل آجاتے ہیں۔ اگر اس قاعدہ کلیہ پر عمل کیا جائے تو معاشرت کے تمام احکامات پر عمل ہو جائے گا اور وہ قاعدہ یہ ہے جو اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"تَكُفُّ شَرَّكَ عَنِ النَّاسِ"[1]

تَرجَمَۂ: "اپنے شر کو دوسرے لوگوں سے روکو۔"

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"جو دنیا میں کسی مسلمان کی تکلیف دور کرے گا آخرت میں اللہ تعالیٰ اس کی تکالیف کو دور فرمادے گا[2]۔"

صرف اسی بنیاد پر اس کی تکلیف کو دور کیا جائے گا کہ اس نے دنیا میں لوگوں کی تکلیف کو دور کیا تھا۔

ایک اور حدیث میں فرمایا: جو شخص اپنے بھائی کی حاجت کے لئے چلے تو وہ اس کے لئے دس سال کے اعتکاف سے بہتر ہے، جو شخص اللہ کی رضا کے لئے ایک

[1] مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون الایمان ......: ۱/۶۲

[2] ترمذی، باب ماجاء فی الستر علی المسلم: ۲/۱۴

دن اعتکاف کرے، اللہ تعالیٰ اُس شخص اور جہنم کی آگ کے درمیان تین خندقیں بنا دیتے ہیں، ہر خندق کے درمیان مشرق و مغرب کے فاصلے سے زیادہ فاصلہ ہے۔[1]

معاشرت کے تمام احکام کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ کے کسی قول و فعل سے دوسرے کو ادنیٰ تکلیف نہ پہنچے۔ اس سے مراد ناحق تکلیف ہے یعنی کسی کو ناحق تکلیف نہ پہنچے۔ بعض مرتبہ حق کی وجہ سے دوسرے کو تکلیف پہنچتی ہے وہ اس میں داخل نہیں مثلاً قاضی سزائیں جاری کرتا ہے، عدالتوں میں ہاتھ کاٹے جاتے ہیں اور قصاص کے فیصلے بھی ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔[2]

اللہ والوں کی صحبت:

کسی کو تکلیف سے بچانے کے لئے جتنی باتیں اس کتاب میں مذکور ہیں اگر انہیں عمل میں لانے کی کوشش نہ کی گئی تو کچھ عرصہ بعد بھول جائیں گی اور عمل کرنے کی عادت ایسے ماحول میں رہنے سے پڑتی ہے جہاں ان چیزوں کی پابندی کی جائے، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اللہ والوں کی صحبت میں رہا جائے کیوں کہ وہاں پر عمل کرنے کا ماحول ہوتا ہے۔ اس لئے وہاں رہنے سے اس کی عادت پڑتی ہے، اور یہ عادت بنانے سے زندگی خوش گوار بن جاتی ہے جب کہ اس کی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے زندگی جہنم بن جاتی ہے۔

تکلیف سے بچانا ایک ایسا عمل ہے کہ اس میں کچھ کرنا نہیں پڑتا، بل کہ اس میں نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور نہ کرنے کے لئے نہ طاقت کی ضرورت ہے، نہ پیسوں کی، نہ وقت کی اور نہ محنت کی لیکن یہ عمل بہت بڑا ہے اور اس کی فضیلت نبی اکرم ﷺ نے یہ بیان فرمائی: "فَاِنَّهَا صَدَقَةٌ مِنْكَ عَلٰى نَفْسِكَ"[3]

---

[1] الترغیب والترهیب، الترغیب في قضاء حوائج المسلمین: ۳/۲۶۳

[2] اصلاحی تقریریں: ۵/۶۵

[3] مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون الایمان ......: ۱/۶۲

"یہ تمہاری طرف سے اپنے اوپر صدقہ ہے"۔ اگر آپ اپنے شر کو دوسروں سے روکیں گے تو یہ خود آپ کا اپنی نفس پر صدقہ ہے، گویا کہ آپ نے نفس کی طرف سے صدقہ ادا کر کے اُسے مصائب و آفات سے بچا لیا، دوسروں کو تکلیف نہ پہنچانے کا فائدہ خود اپنے آپ کو ہوا۔

کسی کو تکلیف نہ دینے کے فوائد:

دوسروں کو تکلیف نہ دینے سے کون کون سے فوائد حاصل ہوں گے؟ یہ فوائد بہت زیادہ ہیں:

① بڑے بڑے کبیرہ گناہوں سے بچے رہو گے۔

② آخرت کے عذاب سے بچ جاؤ گے۔

③ جب اپنے آپ کو اس گناہ سے روکنے کی کوشش کرو گے تو یہ خود ایک نیکی ہے۔

شریعت کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ آدمی کے دل میں گناہ کا ارادہ پیدا ہو اور پھر اللہ کے خوف سے اُسے چھوڑ دے تو یہ خود ایک نیک عمل ہے۔ مثلاً یہ خیال آیا کہ نامحرم کو دیکھوں لیکن اللہ کے خوف سے نظریں نیچی کر لیں تو صرف یہ نہیں کہ گناہ نہیں ہوا بل کہ اللہ کے خوف کی وجہ سے اس گناہ کا چھوڑنا خود ایک نیکی ہے جو نامۂ اعمال میں لکھی جائے گی۔

اسی طرح آپ کے دل نے چاہا کہ آپ کسی کو گالی دیں لیکن اللہ کے خوف کی وجہ سے آپ نے اپنی زبان مبارک کو روک لیا تو یہاں دو فائدے حاصل ہوئے، ایک تو یہ کہ بڑے کبیرہ گناہ سے بچ گئے اور دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ تمہارے نامۂ اعمال میں ایک نیکی کا اضافہ ہو گیا۔

حضور ﷺ کا بیان کردہ یہ حکم اتنا عجیب و غریب ہے کہ اس پر جتنا بھی

اللہ کا شکر کریں کم ہے اس لئے کہ اس میں محنت کچھ نہیں کرنی پڑتی، دولت کچھ نہیں لگانی پڑتی اور بھی کچھ نہیں کرنا پڑا لیکن فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی گناہوں سے بچ جاتا ہے اور نیکیوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

دنیا جنت بن جائے گی:

اگر سب لوگ حضور ﷺ کے اس ارشاد پر عمل کرلیں تو یہ دنیا کی زندگی جنت بن جائے گی۔ ہر شخص اس بات کا اہتمام کرے کہ میرے کسی فعل سے دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے۔ ہمارے معاشرے میں ہونے والے کتنے جھگڑے، فساد، مصیبتیں، اذیتیں اور پریشانیاں صرف اسی وجہ سے کھڑی ہوتی ہیں کہ ایک سے دوسرے کو تکلیف پہنچی، جھگڑا کھڑا ہوا، دشمنی پیدا ہوگئی، مقدمہ بازی کا سلسلہ چل پڑا یہاں تک کہ قتل وغارت تک نوبت پہنچ گئی۔

لیکن اگر شروع سے ہی ہر شخص اس بات کا اہتمام کرے کہ اس سے کسی دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے تو یہ دنیا جنت بن جائے۔ جنت کے بارے میں یہ شعر مشہور ہے:

بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد
کسے را با کسے کارے نہ باشد

ترجمہ: "جنت وہ جگہ ہے جہاں کسی کو کسی سے تکلیف نہیں پہنچے گی اور کسی کو کسی دوسرے سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔"

کسی کو تکلیف نہ دینا ایسا عظیم الشان عمل ہے کہ اگر لوگ اس پر عمل کرنے لگیں تو ہر ایک کو اس کی وجہ سے ایسی راحت اور آرام ملے کہ اس سے پہلے ایسی راحت و آرام کا تصور نہیں کیا ہوگا۔ آج کل ہمارے راحت و آرام کے اندر ایک بہت بڑی رکاوٹ اس حدیث پر عمل نہ کرنا ہے، اور درحقیقت پورے اسلامی معاشرے کا روح

رواں اس حدیث کا یہ جملہ ہے کہ "اپنے شر کو لوگوں سے روکو۔"

امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ کا خطاب:

امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ انسان سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے: اے انسان! تم تو انسان تھے، تمہیں تو جانوروں سے بلند و بالا ہونا چاہئے تھا، لیکن اگر تم نے انسانیت سے گر کر جانور ہی بننا تھا تو پھر گائے، بھینس اور بھیڑ بکری کی طرح بن جاتے کہ تم سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا، تکلیفیں نہ پہنچتیں اور اگر یہ نہیں بن سکتے تو پھر ایسے جانور بن جاتے جن سے نہ انسان کو راحت پہنچتی ہے اور نہ نقصان ہوتا ہے جیسے جنگلوں میں رہنے والے جانور کہ انسانوں سے دور ہونے کی وجہ سے انسان کو نقصان نہیں پہنچاتے لیکن اس سے کم درجے والے جانور یعنی ڈنگ مارنے والے جانور جیسے سانپ اور بچھو تو نہ بنو۔[1]

یہ تو امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ کی بات ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی حدیث کے اس آخری جملے کا حاصل یہ ہے کہ اگر تم بیان کردہ افضل اعمال میں سے بعض عمل کرنے سے عاجز ہو یا تمام پر عمل کرنا دشوار ہے تو کم از کم اتنا تو کرو کہ لوگوں کو اپنی تکلیفوں سے بچاؤ، یہ خوش گوار زندگی گزارنے کا ایک بہترین نسخہ ہے۔ اللہ رب العزت ہمیں اس پر عمل کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ (آمین)

انصاف، بھلائی اور صلہ رحمی

بھلائی کے کچھ کام ایسے ہوتے ہیں اگر انسان ان پر عمل پیرا ہو جائے تو تکلیف کے اسباب و ذرائع خود بخود ختم ہو جاتے ہیں، کیوں کہ انسان اگر مثبت اعمال میں مشغول ہو تو اس کا قیمتی وقت منفی اعمال میں ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے، انصاف بھلائی اور صلہ رحمی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

[1] اصلاحی تقریریں: ۷۹/۳

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾[1]

ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ انصاف کا، بھلائی کا اور قرابت داروں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اور بے حیائی کے کاموں، ناشائستہ حرکتوں اور ظلم و زیادتی سے روکتا ہے، وہ خود تمہیں نصیحتیں کر رہا ہے کہ تم نصیحت حاصل کرو۔“

اس آیت میں حق تعالیٰ نے تین چیزوں کا حکم دیا ہے۔ (۱) عدل (۲) احسان (۳) اہلِ قرابت کو بخشش، اور تین چیزوں سے منع فرمایا ہے: (۱) فحش کام (۲) ہر برا کام (۳) ظلم و تعدی، ان کا شرعی مفہوم اور اس کے حدوں کی تشریح یہ ہے:

پہلا حکم جو اس آیت میں دیا گیا وہ ”عَدْل“ ہے اس لفظ کے اصلی اور لغوی معنی برابر کرنے کے ہیں، اسی کی مناسبت سے حکام کا لوگوں کے نزاعی مقدمات میں انصاف کے ساتھ فیصلہ عدل کہلاتا ہے، قرآن کریم میں ﴿أَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ﴾[2] اسی معنی کے لئے آیا ہے، اور اسی لحاظ سے لفظ عدل افراط و تفریط کے درمیان اعتدال کو بھی کہا جاتا ہے، اور اسی کی مناسبت سے بعض ائمہ تفسیر نے اس جگہ لفظ عدل کی تفسیر ظاہر و باطن کی برابری سے کی ہے، یعنی جو قول یا فعل انسان کے ظاہری اعضاء سے سرزد ہو اور باطن میں بھی اس کا وہی اعتقاد اور حال ہو۔ اصل حقیقت یہی ہے کہ یہاں لفظ عدل اپنے عام معنی میں ہے، جو ان سب صورتوں کو شامل ہے، جو مختلف ائمہ تفسیر سے منقول ہیں، ان میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں۔

علامہ ابنِ عربی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ فرماتے ہیں:

[1] نحل: ۹۰
[2] النسآء: ۵۸

لفظ عدل کے اصلی معنی برابری کرنے کے ہیں، پھر مختلف نسبتوں سے اس کا مفہوم مختلف ہو جاتا ہے۔

(۱) **عدل کا پہلا مفہوم:** انسان اپنے نفس اور اپنے رب کے درمیان عدل کرے، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کے حق کو اپنے حظِ نفس پر اور اس کی رضا جوئی کو اپنی خواہشات پر مقدم جانے، اور اس کے احکام کی تعمیل اور اس کی ممنوعات و محرمات سے مکمل اجتناب کرے۔

(۲) **عدل کا دوسرا مفہوم:** آدمی خود اپنے نفس کے ساتھ عدل کا معاملہ کرے، وہ یہ ہے کہ اپنے نفس کو ایسی تمام چیزوں سے بچائے جس میں اس کی جسمانی یا رُوحانی ہلاکت ہو، اس کی ایسی خواہشات کو پورا نہ کرے جو اس کے لئے انجام کار مضر ہوں، اور قناعت و صبر سے کام لے، نفس پر بلاوجہ زیادہ بوجھ نہ ڈالے۔

(۳) **عدل کا تیسرا مفہوم:** اپنے نفس اور تمام مخلوقات کے درمیان انصاف کرے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ تمام مخلوقات کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی کا معاملہ کرے، اور کسی ادنیٰ و اعلیٰ معاملہ میں کسی سے خیانت نہ کرے، سب لوگوں کے لئے اپنے نفس سے انصاف کا مطالبہ کرے، کسی انسان کو اس کے کسی قول و فعل سے ظاہراً یا باطناً کوئی ایذاء اور تکلیف نہ پہنچے۔

(۴) **عدل کا چوتھا مفہوم:** جب دو فریق اپنے کسی معاملہ کا محاکمہ اس کے پاس لائیں تو فیصلہ میں کسی کی طرف میلان کے بغیر حق کے مطابق فیصلہ کرے۔

(۵) **عدل کا پانچواں مفہوم:** ہر معاملہ میں افراط و تفریط کی راہوں کو چھوڑ کر میانہ روی اختیار کرے، ابو عبداللہ رازی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ نے یہی معنی اختیار کر کے فرمایا ہے کہ لفظ عدل میں عقیدہ کا اعتدال، عمل کا اعتدال، اخلاق کا اعتدال سب شامل ہیں۔[1]

[1] التفسیر الکبیر: (۸۲/۲)، نحل: ۹۰

امام قرطبی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ نے عدل کے مفہوم میں اس تفصیل کا ذکر کر کے فرمایا: یہ تفصیل بہت بہتر ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس آیت کا صرف لفظ عدل تمام اعمال و اخلاق حسنہ کی پابندی اور برے اعمال و اخلاق سے اجتناب کو حاوی اور جامع ہے۔[1]

دوسرا حکم جو اس آیت میں دیا گیا وہ "اَلْاِحْسَان" ہے اس کے اصل لغوی معنی اچھا کرنے کے ہیں، اور اس کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) فعل یا خلق و عادت کو اپنی ذات میں اچھا اور مکمل کرے۔

(۲) کسی دوسرے شخص کے ساتھ اچھا سلوک اور عمدہ معاملہ کرے، اور دوسرے معنی کے لئے عربی زبان میں لفظ احسان کے ساتھ حرف الیٰ استعمال ہوتا ہے، جیسا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ﴾[2]

تَرجَمَہ: "جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی سلوک کر۔"

امام قرطبی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ نے فرمایا: آیت میں یہ لفظ اپنے عام مفہوم کے لئے مستعمل ہوا ہے، اس لئے احسان کی دونوں قسموں کو شامل ہے، پھر پہلی قسم کا احسان یعنی کسی کام کو اپنی ذات میں اچھا کرنا یہ بھی عام ہے عبادات کو اچھا کرنا، اعمال واخلاق کو اچھا کرنا، معاملات کو اچھا کرنا۔

حضرت جبرئیل عَلَیْہِ السَّلَام کی مشہور حدیث میں خود آں حضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے احسان کے جو معنی بیان فرمائے ہیں، وہ احسان عبادت کے لئے ہے، اس ارشاد کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم خدا تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو،

[1] القرطبی: ۱۲۱/۵، نحل: ۹۰
[2] القصص: ۷۷

اور اگر استحضار کا یہ درجہ نصیب نہ ہو تو اتنی بات کا یقین تو ہر شخص کو ہونا ہی چاہئے کہ حق تعالیٰ اس کے عمل کو دیکھ رہے ہیں[1] کیوں کہ یہ تو اسلامی عقیدہ کا اہم جزء ہے کہ حق تعالیٰ کے علم و بصر سے کائنات کا کوئی ذرہ خارج نہیں رہ سکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ دوسرا حکم اس آیت میں احسان کا آیا ہے، اس میں عبادت کا احسان حدیث کی تشریح کے مطابق بھی داخل ہے، اور تمام اعمال، اخلاق، عادات کا احسان یعنی ان کو مطلوبہ صورت کے مطابق بالکل صحیح و درست کرنا بھی داخل ہے، اور تمام مخلوقات کے ساتھ اچھا سلوک کرنا بھی داخل ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر، انسان ہوں یا حیوان۔

امام قرطبی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ نے فرمایا: جس شخص کے گھر میں اس کی بلی کو اس کی خوراک اور ضروریات نہ ملیں اور جس کے پنجرے میں بند پرندوں کی پوری خبر گیری نہ ہوتی ہو تو وہ کتنی ہی عبادت کرے محسنین میں شمار نہیں ہوگا۔[2]

اس آیت میں اوّل عدل کا حکم دیا گیا پھر احسان کا بعض ائمہ تفسیر نے فرمایا: عدل تو یہ ہے کہ دوسرے کا حق پورا پورا اس کو دے دے اور اپنا وصول کر لے، نہ کم نہ زیادہ، اور کوئی تکلیف تمہیں پہنچائے تو ٹھیک اتنی ہی تکلیف تم اس کو پہنچاؤ نہ کم نہ زیادہ۔

احسان یہ ہے کہ دوسرے کو اس کے اصل حق سے زیادہ دو اور خود اپنے حق میں چشم پوشی سے کام لو، کہ کچھ کم ہو جائے تو بخوشی قبول کر لو، اسی طرح دوسرا کوئی تمہیں ہاتھ یا زبان سے ایذاء پہنچائے تو تم برابر کا انتقام لینے کے بجائے اس کو معاف کر دو، بل کہ برائی کا بدلہ بھلائی سے دو اسی طرح عدل کا حکم تو فرض و واجب کے درجہ میں ہوا اور احسان کا حکم نفلی اور تبرع کے طور پر ہوا۔

[1] بخاری، باب سوال جبرئیل النبیؐ......: ۱۲/۱
[2] القرطبی: ۱۲۲/۵، نحل: ۹۰

تیسرا حکم جو اس آیت میں دیا گیا ہے وہ ﴿اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی﴾ ہے، ایتاء کے معنی اعطاء یعنی کوئی چیز دینے کے ہیں، اور لفظ قُرْبٰی کے معنی قرابت اور رشتہ داری کے ہیں، ذی القربی کے معنی رشتہ دار، ذی رحم، اس جملے کے معنی ہوئے رشتہ دار کو کچھ دینا، یہاں اس کی تصریح نہیں فرمائی کہ کیا چیز دینا ہے، لیکن ایک دوسری آیت میں اس کی صراحت مذکور ہے ﴿وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ﴾ تَرْجَمَۃ: ”اور رشتے داروں کا حق ادا کرتے رہو۔“[1]

ظاہر یہی ہے کہ یہاں بھی یہی حقوق مراد ہیں، کہ رشتہ دار کو اس کا حق دیا جائے، اس حق میں رشتہ دار کو مال دے کر مالی خدمت کرنا بھی داخل ہے، اور جسمانی خدمت بھی، بیمار پرسی اور خبر گیری بھی، زبانی تسلی و ہمدردی کا اظہار بھی، اور اگرچہ لفظِ احسان میں رشتہ داروں کا حق ادا کرنا بھی داخل تھا مگر اس کو اس کی زیادہ اہمیت جتلانے کے لئے علیحدہ بیان فرمایا گیا۔[2]

تکلیف سے بچاؤ کا دوسرا راستہ

گھر میں داخل ہوتے وقت اجازت طلب کرنا:

کسی کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے یا کسی سے ملاقات کرنے سے پہلے اجازت لینا بہت ضروری ہے، تاکہ کسی کو تکلیف نہ ہو قرآن کریم میں کافی تفصیل کے ساتھ اس مسئلے کو بیان فرمایا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَهْلِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ

[1] بنی اسرائیل: ۲۶

[2] معارف القرآن: ۵/۳۸۹ تا ۳۹۱، نحل: ۹۰

تَذَكَّرُوْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝﴾[1]

تَرْجَمَۃ: ”اے ایمان والو مت جایا کرو کسی گھر میں اپنے گھر کے سوائے جب تک اجازت نہ لے لو، اور سلام کر لو اُن گھر والوں پر یہ بہتر ہے تمہارے حق میں تاکہ تم یاد رکھو، پھر اگر نہ پاؤ اس میں کسی کو تو اس میں نہ جاؤ جب تک کہ اجازت نہ ملے تم کو اور اگر تم کو جواب ملے کہ لوٹ جاؤ تو لوٹ جاؤ اس میں خوب ستھرائی ہے تمہارے لئے اور اللہ جو تم کرتے ہو اُس کو جانتا ہے۔“

افسوس ہے کہ شریعتِ اسلام نے جس قدر اجازت طلب کرنے کے معاملے کا اہتمام فرمایا کہ قرآن حکیم میں اس کے مفصل احکام نازل ہوئے اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے قول و عمل سے اُس کی بڑی تاکید فرمائی، اُتنا ہی آج کل مسلمان اس سے غافل ہو گئے۔ لکھے پڑھے نیک لوگ بھی نہ اس کو کوئی گناہ سمجھتے ہیں نہ اس پر عمل کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ دُنیا کی دوسری مہذب قوموں نے اس کو اختیار کر کے اپنے معاشرہ کو درست کر لیا مگر مسلمان ہی اس میں سب سے پیچھے نظر آتے ہیں۔ اسلامی احکام میں سب سے پہلے سستی اس حکم میں شروع ہوئی بہرحال اجازت طلب کرنا قرآن کریم کا وہ واجب التعمیل حکم ہے کہ اس میں ذرا سی سستی اور تبدیلی کو بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ انکارِ آیتِ قرآن کے شدید الفاظ سے تعبیر فرما رہے ہیں اور اب تو لوگوں نے واقعی ان احکام کو ایسا نظر انداز کر دیا ہے کہ گویا اُن کے نزدیک یہ قرآن کے احکام ہی نہیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔

[1] النور: ۲۷، ۲۸

اجازت طلب کرنے کی حکمتیں اور اہم مصلحتیں

❶ پہلی مصلحت: حق تعالیٰ جل شانہ نے ہر انسان کو جو اس کے رہنے کی جگہ عطا فرمائی خواہ مالکانہ ہو یا کرایہ وغیرہ پر بہر حال اُس کا گھر اُس کا مسکن ہے اور مسکن کا اصلی مقصد سکون و راحت ہے قرآنِ عزیز نے جہاں اپنی اس قیمتی نعمت کا ذکر فرمایا ہے اس میں بھی اس طرف اشارہ ہے فرمایا:

﴿جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا﴾[1] یعنی اللہ نے تمہارے گھروں سے تمہارے لئے سکون و راحت کا سامان دیا۔ اور یہ سکون و راحت جب ہی باقی رہ سکتا ہے کہ انسان دوسرے کسی شخص کی مداخلت کے بغیر اپنے گھر میں اپنی ضرورت کے مطابق آزادی سے کام اور آرام کر سکے۔ اس کی آزادی میں خلل ڈالنا گھر کی اصل مصلحت کو فوت کرنا ہے جو بڑی ایذاء و تکلیف ہے۔ اسلام نے کسی کو بھی ناحق تکلیف پہنچانا حرام قرار دیا ہے۔ اجازت طلب کرنے کے احکام میں ایک بڑی مصلحت لوگوں کی آزادی میں خلل ڈالنے اور اُن کی ایذاء رسانی سے بچنا ہے جو ہر شریف انسان کا عقلی فریضہ بھی ہے۔

❷ دوسری مصلحت: خود اس شخص کی ہے جو کسی کی ملاقات کے لئے اُس کے پاس گیا ہے کہ جب وہ اجازت لے کر شائستہ انسان کی طرح ملے گا تو مخاطب بھی اس کی بات قدر و منزلت سے سنے گا اور اگر اس کی کوئی حاجت ہے تو اُس کے پورا کرنے کا داعیہ اُس کے دل میں پیدا ہوگا۔ بخلاف اس کے کہ وحشیانہ طرز سے کسی شخص پر بغیر اس کی اجازت کے مسلط ہوگیا تو مخاطب اس کو ایک اچانک آنے والی مصیبت سمجھ کر وقتی طور پر ٹالنے سے کام لے گا خیر خواہی کا داعیہ اگر ہوا بھی تو کمزور ہو جائے گا اور اس کو ایذاء مسلم کا گناہ الگ ہوگا۔

---

[1] نحل: ۸۰

❸ تیسری مصلحت: فواحش اور بے حیائی کا انسداد ہے کہ بلا اجازت کسی کے مکان میں داخل ہو جانے سے یہ بھی احتمال ہے کہ غیر محرم عورتوں پر نظر پڑے اور شیطان دل میں کوئی مرض پیدا کر دے اور اسی مصلحت سے احکام استیذان کو قرآنِ کریم میں حدِ زنا۔ حدِ قذف وغیرہ احکام کے متصل لایا گیا ہے۔

❹ چوتھی مصلحت: انسان بعض اوقات اپنے گھر کی تنہائی میں کوئی ایسا کام کر رہا ہوتا ہے جس پر دوسروں کو اطلاع کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ اگر کوئی شخص بغیر اجازت کے گھر میں آجائے تو وہ جس چیز کو دوسروں سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا اُس پر مطلع ہو جائے گا۔ کسی کے پوشیدہ راز کو زبردستی معلوم کرنے کی فکر بھی گناہ اور دوسروں کے لئے موجبِ ایذا ہے۔ اجازت طلب کرنے کی چند مصلحتیں تو خود آیاتِ مذکورہ میں آگئی ہیں اب کچھ مزید حکمتیں ذکر کی جائیں گی۔

❶ پہلی حکمت: ان آیات میں ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ سے خطاب کیا گیا جو مردوں کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر عورتیں بھی اس حکم میں داخل ہیں جیسا کہ عام احکامِ قرآنیہ جس طرح مردوں کو مخاطب کرنے کے لئے آتے ہیں عورتیں بھی اُس میں شامل ہوتی ہیں بجز مخصوص مسائل کے جن کی خصوصیت مردوں کے ساتھ بیان کر دی جاتی ہے۔ چناں چہ صحابہ کرام کی خواتین کا بھی یہی معمول تھا کہ کسی کے گھر جائیں تو پہلے اُن سے اجازت طلب کریں۔ حضرت اُمّ ایاس رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: ہم چار عورتیں اکثر حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس جایا کرتی تھیں اور گھر میں جانے سے پہلے اُن سے اجازت طلب کرتی تھیں جب وہ اجازت دیتی تو اندر جاتی تھیں۔[1]

❷ دوسری حکمت: اس آیت کے عموم سے معلوم ہوا کہ کسی دوسرے شخص کے گھر میں جانے سے پہلے اجازت طلب کرنے کا حکم عام ہے مرد عورت محرم غیر محرم

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ۳/۲۷۴، النور: ۲۷

سب کو شامل ہے۔ عورت کسی عورت کے پاس جائے یا مرد کسی مرد کے پاس، سب کو اجازت طلب کرنا واجب ہے اسی طرح ایک شخص اگر اپنی ماں اور بہن یا دوسری محرم عورتوں کے پاس جائے تو بھی اجازت طلب کرے۔

امام مالک رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ نے موطاء میں مرسلاً عطاء بن یسار رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ سے روایت کیا ہے: ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کیا میں اپنی والدہ کے پاس جاتے وقت بھی استیذان کروں آپ نے فرمایا ہاں استیذان کرو۔ اُس شخص نے کہا یا رسول اللہ! میں تو اپنی والدہ ہی کے ساتھ گھر میں رہتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا پھر بھی اجازت لئے بغیر گھر میں نہ جاؤ۔ اُس نے پھر عرض کیا یا رسول اللہ میں تو ہر وقت اُن کی خدمت میں رہتا ہوں آپ ﷺ نے فرمایا پھر بھی اجازت لئے بغیر گھر میں نہ جاؤ تمہیں یہ بات پسند ہے کہ اپنی والدہ کو ننگی دیکھو اس نے کہا کہ نہیں۔ فرمایا اسی لئے استیذان (اجازت طلب) کرنا چاہئے کیوں کہ یہ احتمال ہے کہ وہ گھر میں کسی ضرورت سے ستر کھولے ہوئے ہوں[1]

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ آیتِ قرآن میں جو ﴿غَيْرَ بُيُوتِكُمْ﴾ آیا ہے اس میں بُيُوتِكُمْ سے مراد وہ بیوت اور گھر ہیں جن میں انسان تنہا خود ہی رہتا ہو۔ والدین، بہن بھائی وغیرہ اُس میں نہ ہوں۔

۳ تیسری حکمت: جس گھر میں صرف اپنی بیوی رہتی ہو اُس میں داخل ہونے کے لئے اگرچہ اجازت طلب کرنا واجب نہیں مگر مستحب اور سنت طریقہ یہ ہے کہ وہاں بھی اچانک بغیر کسی اطلاع کے اندر نہ جائے بل کہ داخل ہونے سے پہلے اپنے پاؤں کی آہٹ سے یا کھنکار سے کسی طرح پہلے خبر کر دے پھر داخل ہو۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رَضِیَ اللہُ تَعَالیٰ عَنْہُ کی زوجہ محترمہ فرماتی ہیں کہ عبداللہ جب کبھی باہر سے گھر میں آتے تھے تو دروازہ میں کھنکار کر پہلے اپنے آنے سے باخبر کر دیتے تھے

[1] موطأ امام مالک، باب فی الاستیذان: ص۷۲۵

تاکہ وہ ہمیں کسی ایسی حالت میں نہ دیکھیں جو ان کو پسند نہ ہو۔[1]

اور اس صورت میں طلبِ اجازت کا واجب نہ ہونا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن جریج نے حضرت عطاء رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ سے دریافت کیا کہ ایک شخص کو اپنی بیوی کے پاس جانے کے وقت بھی استیذان ضروری ہے اُنہوں نے فرمایا کہ نہیں۔ ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ اس سے مراد یہی ہے کہ واجب نہیں لیکن مستحب اور اولیٰ وہاں بھی ہے۔[2]

اجازت طلب کرنے کا مسنون طریقہ

آیت میں جو طریقہ بتلایا گیا ہے وہ یہ ہے ﴿حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا﴾ یعنی کسی کے گھر میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک دو کام نہ کر لو، اوّل استیناس، اس کے لفظی معنی طلب اُنس کے ہیں۔ مراد اس سے جمہور مفسرین کے نزدیک استیذان یعنی اجازت حاصل کرنا ہے۔ استیذان کو بلفظ استیناس ذکر کرنے میں اشارہ اس طرف ہے کہ داخل ہونے سے پہلے اجازت حاصل کرنے میں مخاطب مانوس ہوتا ہے اس کو وحشت نہیں ہوتی۔ دوسرا کام یہ ہے کہ گھر والوں کو سلام کرو۔ اس کا مفہوم بعض حضرات مفسرین نے تو یہ لیا کہ پہلے اجازت حاصل کرو اور جب گھر میں جاؤ تو سلام کرو۔ قرطبی نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ اس مفہوم کے اعتبار سے آیت میں کوئی تقدیم تاخیر نہیں پہلے اجازت طلب کی جائے جب اجازت مل جائے اور گھر میں جائیں تو سلام کریں۔ اور اسی کو حضرت ابوایوب انصاری رَضِیَ اللہُ تَعَالیٰ عَنْہُ کی حدیث کا مقتضی قرار دیا ہے۔ اور علامہ ماوردی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ نے اس میں یہ تفصیل کی ہے: اگر اجازت لینے سے پہلے گھر کے کسی آدمی پر نظر پڑ جائے تو پہلے سلام کرے پھر اجازت طلب کرے ورنہ پہلے اجازت لے اور جب گھر

[1] تفسیر ابن کثیر: ۳/۳۷۵، النور: ۲۷
[2] تفسیر ابن کثیر: ۳/۳۷۵، النور: ۲۷

میں جائے تو سلام کرے مگر عام روایاتِ حدیث سے جو طریقہ مسنون معلوم ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ پہلے باہر سے سلام کرے اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ اس کے بعد اپنا نام لے کر کہے کہ فلاں شخص ملنا چاہتا ہے۔

امام بخاری نے الادب المفرد میں حضرت ابوہریرہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جو شخص سلام سے پہلے استیذان کرے اس کو اجازت نہ دو (کیوں کہ اس نے مسنون طریقہ کو چھوڑ دیا)۔[1]

ابوداؤد کی حدیث میں ہے: بنی عامر کے ایک شخص نے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سے اس طرح استیذان کیا کہ باہر سے کہا "أَأَلِجُ" کیا میں گھس جاؤں۔ آپ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ یہ شخص استیذان کا طریقہ نہیں جانتا باہر جا کر اس کو طریقہ سکھلاؤ کہ یوں کہے "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَأَدْخُلُ" یعنی کیا میں داخل ہو سکتا ہوں۔ ابھی یہ خادم باہر نہیں گیا تھا کہ اس نے خود حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے کلمات سن لئے اور اس طرح کہا "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَأَدْخُلُ." تو آپ نے اندر آنے کی اجازت دے دی۔[2]

بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت جابر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت کی ہے: رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: "لَا تَأْذَنُوْا لِمَنْ لَمْ يَبْدَأْ بِالسَّلَامِ" یعنی جو شخص پہلے سلام نہ کرے اس کو اندر آنے کی اجازت نہ دو۔[3]

اس ارشادِ مبارک میں رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے دو اصلاحیں فرمائیں۔

① پہلے سلام کرنا چاہئے۔ ② اس نے "أَدْخُلُ" کے بجائے "أَلِجُ" کا لفظ استعمال کیا تھا۔ یہ نامناسب تھا کیوں کہ "أَلِجُ، وَلُوْجٌ" سے مشتق ہے جس کے معنی

[1] روح المعانی: ۱۳۴/۱۰، النور: ۲۷، الادب المفرد: ص ۲۱۷، رقم ۱۰۸۳
[2] ابوداؤد، باب في الإستيذان: ۳۴۷/۲
[3] فيض القدير: ۴۹۹/۶، رقم ۹۷۱۸

کسی تنگ جگہ میں گھسنے کے ہیں یہ تہذیبِ الفاظ کے خلاف تھا۔ بہرحال ان روایات سے یہ معلوم ہوا کہ آیتِ قرآن میں جو سلام کرنے کا ارشاد ہے۔ یہ سلام اجازت طلب کرنا ہے جو اجازت حاصل کرنے کے لئے باہر سے کیا جاتا ہے تاکہ اندر جو شخص ہے وہ متوجہ ہو جائے اور جو الفاظ اجازت طلب کرنے کے لئے کہے گا وہ سن لے۔ گھر میں داخل ہونے کے وقت حسبِ معمول دوبارہ سلام کرے۔ کسی کے گھر میں داخل ہونے سے قبل اجازت لینے کی حکمتیں اور مصلحتیں بیان ہو چکی ہیں۔ اب مزید کچھ فوائد ذکر کئے جائیں گے جس میں اجازت کے فائدے، آداب اور اس سے متعلق تنبیہات بھی شامل ہیں۔

فَائِدَہ نمبر ①: اجازت لیتے وقت اپنا نام بھی ظاہر کرے:

پہلے سلام اور پھر داخل ہونے کی اجازت لینے کا جو بیان اوپر احادیث سے ثابت ہوا اس میں بہتر یہ ہے کہ اجازت لینے والا خود اپنا نام لے کر اجازت طلب کرے جیسا کہ حضرت فاروق اعظم کا عمل تھا کہ انہوں نے آں حضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے دروازہ پر آکر یہ الفاظ کہے۔ "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَيَدْخُلُ عُمَرُ" یعنی سلام کے بعد کہا کہ کیا عمر داخل ہو سکتا ہے۔[1]

صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ حضرت عمر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کے پاس گئے تو اجازت طلب کرنے کے لئے یہ الفاظ فرمائے۔ "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ هٰذَا اَبُوْ مُوْسٰى اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ هٰذَا الْاَشْعَرِيُّ"۔[2]

اس میں بھی پہلے اپنا نام ابوموسیٰ بتلایا پھر مزید وضاحت کے لئے اشعری کا ذکر کیا۔ اور یہ اس لئے کہ جب تک آدمی اجازت لینے والے کو پہچانے نہیں تو جواب دینے میں تشویش (ذہنی تکلیف) ہوگی۔ اس تشویش سے بھی مخاطب کو بچانا چاہئے۔

[1] ابوداؤد، کتاب الأدب: ۳۵۱/۲
[2] مسلم، باب الإستیذان: ۲۱۱/۲

اس معاملہ میں سب سے برا وہ طریقہ ہے جو بعض لوگ کرتے ہیں کہ باہر سے اندر داخل ہونے کی اجازت مانگی اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔ اندر سے مخاطب نے پوچھا کون صاحب ہیں تو جواب میں یہ کہہ دیا کہ میں ہوں، کیوں کہ یہ مخاطب کی بات کا جواب نہیں، جس نے اوّل آواز سے نہیں پہچانا وہ میں کے لفظ سے کیا پہچانے گا۔

خطیب بغدادی نے اپنی جامع میں علی بن عاصم واسطی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ سے نقل کیا ہے کہ وہ بصرہ گئے تو حضرت مغیرہ ابن شعبہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ کی ملاقات کو حاضر ہوئے۔ دروازہ پر دستک دی، حضرت مغیرہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ نے اندر سے پوچھا کون ہے تو جواب دیا "أنا" (یعنی میں ہوں)

تو حضرت مغیرہ نے فرمایا کہ میرے دوستوں میں تو کوئی بھی ایسا نہیں جس کا نام "أنا" ہو پھر باہر تشریف لائے اور اُن کو حدیث سنائی: ایک روز حضرت جابر بن عبداللہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُمَا آں حضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اجازت لینے کے لئے دروازہ پر دستک دی۔ آں حضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے اندر سے پوچھا کون صاحب ہیں؟ تو جابر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ نے یہی لفظ کہہ دیا "أنا" یعنی میں ہوں۔ آپ نے بطور زجر و تنبیہ کے فرمایا "أنا أنا" یعنی "أنا أنا" کہنے سے کیا حاصل ہے اس سے کوئی پہچانا نہیں جاتا۔[1]

فَائِدَہ نمبر ۲: دستک کے بعد خاموشی خلافِ ادب ہے:

اس سے بھی زیادہ برا یہ طریقہ ہے جو آج کل بہت سے لکھے پڑھے لوگ بھی استعمال کرتے ہیں کہ دروازہ پر دستک دی جب اندر سے پوچھا گیا کہ کون صاحب ہیں تو خاموش کھڑے ہیں کوئی جواب ہی نہیں دیتے۔ یہ مخاطب کو تشویش میں ڈالنے اور ایذاء پہنچانے کا بدترین طریقہ ہے جس سے استیذان کی مصلحت ہی فوت ہو جاتی ہے۔

---

[1] بخاري، كتاب الاستيذان: ۹۲۳/۲

روایاتِ مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اجازت طلب کرنے کا یہ طریقہ بھی جائز ہے کہ دروازہ پر دستک دے دی جائے بشرطیکہ ساتھ ہی اپنا نام بھی ظاہر کر کے بتلا دیا جائے کہ فلاں شخص ملنا چاہتا ہے۔

فَائِدَہ نمبر ۳: درمیانے انداز میں دستک دے:

لیکن اگر دستک ہو تو اتنی زور سے نہ دے کہ جس سے سننے والا گھبرا اٹھے بلکہ متوسط انداز سے دے جس سے اندر تک آواز تو چلی جائے لیکن کوئی سختی ظاہر نہ ہو۔ جو لوگ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے دروازہ پر دستک دیتے تھے تو اُن کی عادت یہ تھی کہ ناخنوں سے دروازہ پر دستک دیتے تاکہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کو تکلیف نہ ہو۔[1]

جو شخص استیذان کے مقصد کو سمجھ لے کہ اصل اُس سے استیناس ہے یعنی مخاطب کو مانوس کر کے اجازت حاصل کرنا وہ خود بخود ان سب چیزوں کی رعایت کو ضروری سمجھے گا جن چیزوں سے مخاطب کو تکلیف ہو اُس سے بچے گا۔ اپنا نام ظاہر کرے اور دستک دے تو متوسط انداز سے دے یہ سب چیزیں اُس میں شامل ہیں۔

فَائِدَہ نمبر ۴: اجازت کے لئے جدید طریقوں کا استعمال:

آج کل اکثر لوگوں کی تو اجازت طلب کرنے کی طرف کوئی توجہ ہی باقی نہیں رہی جو صریح ترک واجب کا گناہ ہے اور جو لوگ استیذان کرنا چاہیں اور مسنون طریقہ کے مطابق باہر سے پہلے سلام کریں پھر اپنا نام بتلا کر اجازت لیں، اُن کے لئے اس زمانے میں بعض دشواریاں یوں بھی پیش آتی ہیں کہ عموماً مخاطب جس سے اجازت لیتا ہے وہ دروازہ سے دُور ہے، وہاں تک سلام کی آواز اور اجازت لینے کے الفاظ کا پہنچنا مشکل ہے اس لئے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اصل واجب یہ بات ہے کہ بغیر اجازت کے گھر میں داخل نہ ہو۔

اجازت لینے کے طریقے ہر زمانے اور ہر ملک میں مختلف ہو سکتے ہیں، اُن میں

---

[1] قرطبي: ۱۶۳/۶، النور: ۲۷

سے ایک طریقہ دروازہ پر دستک دینے کا تو خود روایاتِ حدیث سے ثابت ہے اسی طرح جو لوگ اپنے دروازوں پر گھنٹی لگا لیتے ہیں اُس گھنٹی کا بجا دینا بھی واجب استیذان کی ادائیگی کے لئے کافی ہے۔ بشرطیکہ گھنٹی کے بعد اپنا نام بھی ایسی آواز سے ظاہر کر دے جس کو مخاطب سن لے۔

اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ جو کسی جگہ رائج ہو اس کا استعمال کر لینا بھی جائز ہے آج کل جو شناختی کارڈ کا رواج یورپ سے چلا ہے یہ رسم اگرچہ اہلِ یورپ نے جاری کی مگر اجازت لینے کا مقصد اس میں بہت اچھی طرح پورا ہو جاتا ہے کہ اجازت دینے والے کو اجازت چاہنے والے کا پورا نام و پتہ اپنی جگہ بیٹھے ہوئے بغیر کسی تکلیف کے معلوم ہو جاتا ہے اس لئے اس کو اختیار کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

فائدہ نمبر ⑤: ملاقات کا اصرار نہ کرے:

اگر ایک شخص نے دوسرے شخص سے اندر آنے کی اجازت مانگی اور اُس نے جواب میں کہہ دیا کہ اس وقت ملاقات نہیں ہو سکتی لوٹ جایئے تو اُس سے برا نہیں ماننا چاہئے کیوں کہ ہر شخص کے حالات اور اُس کے مقتضیات مختلف ہوتے ہیں بعض وقت وہ مجبور ہوتا ہے باہر نہیں آ سکتا نہ آپ کو اندر بلا سکتا ہے تو ایسی حالت میں اُس کے عذر کو قبول کرنا چاہئے۔ آیت مذکورہ میں یہی ہدایت ہے ﴿وَاِنْ قِیْلَ لَکُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ﴾ یعنی جب آپ سے کہا جائے کہ اس وقت لوٹ جائیں تو آپ کو خوش دلی سے لوٹ جانا چاہئے اس سے برا ماننا یا وہیں جم کر بیٹھ جانا دونوں چیزیں درست نہیں بعض حضرات سلف سے منقول ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ میں عمر بھر اس تمنا میں رہا کہ کسی کے پاس جا کر اندر آنے کی اجازت طلب کروں اور وہ مجھے یہ جواب دے کہ لوٹ جاؤ تو میں اس حکم قرآن کی تعمیل کا ثواب حاصل کروں مگر عجیب اتفاق ہے کہ مجھے کبھی یہ نعمت نصیب نہ ہوئی۔

شریعتِ اسلام نے حسنِ معاشرت کے آداب سکھانے اور سب کو ایذا و تکلیف سے بچانے کا دو طرفہ معتدل نظام قائم فرمایا ہے اس آیت میں جس طرح آنے والے کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ اگر استیذان کرنے پر آپ کو اجازت نہ ملے اور کہا جائے کہ اس وقت لوٹ جاؤ تو کہنے والے کو معذور سمجھو اور خوش دلی کے ساتھ واپس لوٹ جاؤ برا نہ مانو۔

اسی طرح ایک حدیث میں اس کا دوسرا رُخ اس طرح آیا ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا"[1] یعنی جو شخص آپ سے ملاقات کے لئے آئے اُس کا بھی آپ پر حق ہے یعنی اس کا یہ حق ہے کہ اس کو اپنے پاس بلاؤ یا باہر آ کر اُس سے ملو، اس کا اکرام کرو، بات سنو بلا کسی شدید مجبوری اور عذر کے ملاقات سے انکار نہ کرو۔

فائدہ نمبر ⑥: انتظار کے بعد جواب نہ آئے تو لوٹ جائے:

اگر کسی کے دروازے پر جا کر اجازت طلب کی اور اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو سنت یہ ہے کہ دوبارہ پھر اجازت طلب کرے اور پھر بھی جواب نہ آئے تو تیسری مرتبہ کرے۔ اگر تیسری مرتبہ بھی جواب نہ آئے تو اس کا حکم وہی ہے جو اِرْجِعُوْا کا ہے۔ یعنی لوٹ جانا چاہئے۔

کیوں کہ تین مرتبہ کہنے سے تقریباً یہ تو متعین ہو جاتا ہے کہ آواز سن لی مگر یا تو وہ شخص ایسی حالت میں ہے کہ جواب نہیں دے سکتا مثلاً نماز پڑھ رہا ہے یا بیت الخلاء میں ہے یا غسل کر رہا ہے اور یا پھر اس کو اس وقت ملنا منظور نہیں دونوں حالتوں میں وہیں جمے رہنا اور مسلسل دستک وغیرہ دیتے رہنا بھی موجب ایذا ہے جس سے بچنا واجب ہے، اور اجازت مانگنے کا اصل مقصد ہی ایذا سے بچنا ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ

[1] بخاری، باب حق الضیف: ۹۰۵/۲

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اِذَا اسْتَأْذَنَ اَحَدُکُمْ ثَلَاثًا فَلَمْ یُؤْذَنْ لَهٗ فَلْیَرْجِعْ"[1]
تَرجَمَہ: "جب کوئی آدمی تین مرتبہ استیذان (اجازت طلب) کرے اور کوئی جواب نہ آئے تو اس کو لوٹ جانا چاہیے۔"

مسند احمد میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے: ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان پر تشریف لے گئے اور سنت کے مطابق باہر سے استیذان کے لئے سلام کیا اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ حضرت سعد بن عبادہ نے سلام کا جواب تو دیا مگر آہستہ کہ حضور نہ سنیں، آپ نے دوبارہ اور پھر سہ بارہ سلام کیا۔

حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سنتے اور آہستہ جواب دیتے رہے۔ تین مرتبہ ایسا کرنے کے بعد آپ لوٹ گئے جب سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیکھا کہ اب آواز نہیں آرہی تو گھر سے نکل کر پیچھے دوڑے اور یہ عذر پیش کیا کہ یا رسول اللہ میں نے ہر مرتبہ آپ کی آواز سنی اور جواب بھی دیا مگر آہستہ دیا تاکہ زبان مبارک سے زیادہ سے زیادہ سلام کے الفاظ میرے بارے میں نکلیں وہ میرے لئے موجب برکت ہوگا (آپ نے اُن کو طریقۂ سنت بتلا دیا کہ تین مرتبہ جواب نہ آنے پر لوٹ جانا چاہئے) اس کے بعد حضرت سعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھر ساتھ لے گئے اُنہوں نے کچھ مہمانی کی، آپ نے اس کو قبول فرمایا۔[2]

حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ عمل غلبۂ عشق و محبت کا اثر تھا کہ اس وقت ذہن اس طرف نہ گیا کہ سردارِ دو عالم دروازے پر تشریف فرما ہیں مجھے فوراً جا کر ان کے قدم چوم لینے چاہئیں بل کہ ذہن اس طرف متوجہ ہوگیا کہ آپ کی زبانِ مبارک سے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ جتنی مرتبہ زیادہ نکلے گا میرے لئے زیادہ مفید ہوگا۔ بہر حال

[1] بخاری، باب التسلیم: ۹۲۳/۲
[2] مسند احمد: ۱۳۸/۳، رقم الحدیث: ۱۱۹۹۸

اس سے یہ مسئلہ ثابت ہوگیا کہ تین مرتبہ اجازت طلب کرنے کے بعد جواب نہ آئے تو سنت یہ ہے کہ لوٹ جائے وہیں جم کر بیٹھ جانا خلافِ سنت اور مخاطب کے لئے تکلیف کا باعث ہے کہ اس شخص کو باہر نکلنے پر مجبور کرنا ہے۔

یہ حکم اس وقت ہے جب کہ سلام یا دستک وغیرہ کے ذریعہ اجازت حاصل کرنے کی کوشش تین مرتبہ کر لی ہو کہ اب وہاں جم کر بیٹھ جانا موجب ایذا ہے۔

فائدہ نمبر ⑦: عالم یا بزرگ کے دروازے پر بغیر دستک دیئے انتظار کرنا:

اگر کوئی شخص کسی عالم یا بزرگ کے دروازہ پر بغیر اجازت مانگے اور بغیر ان کو اطلاع دیئے ہوئے انتظار میں بیٹھا رہے کہ جب اپنی فرصت کے مطابق باہر تشریف لائیں گے تو ملاقات ہو جائے گی یہ آداب کے خلاف نہیں بل کہ عین ادب ہے، خود قرآن کریم نے لوگوں کو یہ ہدایت دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب گھر میں ہوں تو اُن کو آواز دے کر بلانا ادب کے خلاف ہے بل کہ لوگوں کو چاہئے کہ انتظار کریں جس وقت آپ خود اپنی ضرورت کے مطابق باہر تشریف لائیں اُس وقت ملاقات کریں۔ آیت یہ ہے:

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ﴾[1]

تَرجَمَہ: "اگر یہ لوگ یہاں تک صبر کرتے کہ آپ (خود) ان کے پاس آجاتے تو یہی ان کے لئے بہتر ہوتا۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں:

میں بعض اوقات کسی انصاری صحابی کے دروازہ پر پورے دوپہر انتظار کرتا رہتا تھا کہ جب وہ باہر تشریف لائیں تو اُن سے کسی حدیث کی تحقیق کروں اور اگر میں اُن سے ملنے کے لئے اجازت مانگتا تو وہ ضرور مجھے اجازت دے دیتے مگر میں اس کو

[1] الحجرات: ۵

خلافِ ادب سمجھتا تھا اس لئے انتظار کی مشقت گوارا کرتا۔[1]

تکلیف سے بچاؤ کا تیسرا راستہ

کسی کا مذاق اُڑانے اور برے القابات دینے سے بچیے:

ہر انسان اپنے بارے میں یہ سوچتا ہے کہ کوئی بھی شخص اُسے برے لقب سے نہ پکارے اور نہ مذاق اُڑائے، کیوں کہ ایسا کرنے پر اسے بہت تکلیف ہوتی ہے اور اس عمل کو وہ اپنی توہین سمجھتا ہے۔ یہ ایک فطری بات ہے۔ لیکن جب یہ شخص کسی سے مخاطب ہوتا ہے تو اُسے یہ باتیں یاد نہیں رہتیں، ان باتوں کو وہ بھول جاتا ہے کیوں کہ ہر شخص صرف اپنی تکلیف کو محسوس کرسکتا ہے دوسرے کی تکلیف کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔

اگر ہر شخص ایک دوسرے کی تکلیف کو محسوس کرے، جو باتیں اپنے لئے پسند کرتا ہے وہ دوسروں کے لئے بھی پسند کرے اور جن باتوں میں اپنی توہین سمجھتا ہے ان میں دوسروں کی بھی توہین سمجھے تو اس سے ایک پاک صاف، صحت مند اور ہمدرد معاشرہ تشکیل دیا جاسکے گا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے کا مذاق اُڑانے اور برے القابات لگانے سے منع فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ

[1] سُنن الدارمي، باب الرحلة في طلب العلم: ١/١٥٧، معارف القرآن: ٦/٣٨٦ تا ٣٩١

الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۱﴾[1]

ترجمہ: "اے ایمان والو! کوئی جماعت دوسری جماعت سے مسخرا پن نہ کرے، ممکن ہے کہ یہ اس سے بہتر ہو اور نہ عورتیں عورتوں سے، ممکن ہے کہ یہ ان سے بہتر ہوں، اور آپس میں ایک دوسرے کو عیب نہ لگاؤ اور نہ کسی کو برے لقب دو، ایمان کے بعد فسق برا نام ہے۔ اور جو لوگ توبہ نہ کریں وہی ظالم لوگ ہیں۔"

مذکورہ آیت میں اشخاص و افراد کے باہمی حقوق و آداب معاشرت کا ذکر ہے اس میں تین چیزوں کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔

① کسی مسلمان کے ساتھ تمسخر و استہزاء کرنا۔

② کسی پر طعنہ زنی کرنا۔

③ کسی کو ایسے لقب سے ذکر کرنا جس سے اس کی توہین ہوتی ہو یا وہ اُسے برا مانتا ہو۔

❶ پہلی چیز جس کی ممانعت اس آیت میں کی گئی ہے وہ سخریا تمسخر (کسی کا مذاق اُڑانا) ہے۔ امام قرطبی نے فرمایا کہ کسی شخص کی تحقیر و توہین کے لئے اُس کے کسی عیب کو اس طرح ذکر کرنا جس سے لوگ ہنسنے لگیں اس کو سخریہ، تمسخر اور استہزاء کہا جاتا ہے۔ یہ استہزاء جیسے زبان سے ہوتا ہے ایسے ہی ہاتھ پاؤں وغیرہ سے اس کی نقل اُتارنے یا اشارہ کرنے سے بھی ہوتا ہے اور اس طرح بھی کہ اس کا کلام سن کر بطور تحقیر کے ہنسی اُڑائی جائے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سخریہ و تمسخر کسی شخص کے سامنے اس کا ایسی طرح ذکر کرنا ہے کہ اُس سے لوگ ہنس پڑیں اور یہ سب چیزیں قرآن کریم کی وضاحت کی وجہ سے حرام ہیں۔[2]

[1] الحجرات: ١١

[2] قرطبی: ٨/٢٣٣، الحجرات: ١١

سخریہ کی ممانعت کا قرآن کریم نے اتنا اہتمام فرمایا کہ اس میں مردوں کو الگ مخاطب فرمایا عورتوں کو الگ، مردوں کو لفظ قوم سے تعبیر فرمایا، کیوں کہ اصل میں یہ لفظ مردوں ہی کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ اگرچہ مجازاً و توسعاً عورتوں کو اکثر شامل ہو جاتا ہے اور قرآن کریم نے عموماً لفظ قوم مردوں عورتوں دونوں ہی کے لئے استعمال کیا ہے مگر یہاں لفظ قوم خاص مردوں کے لئے استعمال فرمایا۔

اس کے بالمقابل عورتوں کا ذکر لفظ نساء سے فرمایا اور دونوں میں یہ ہدایت فرمائی کہ جو مرد کسی دوسرے مرد کے ساتھ استہزاء و تمسخر (ہنسی، مذاق) کرتا ہے اس کو کیا خبر ہے کہ شاید وہ اللہ کے نزدیک استہزاء کرنے والے سے بہتر ہو، اسی طرح جو عورت کسی دوسری عورت کے ساتھ استہزاء تمسخر کا معاملہ کرتی ہے اس کو کیا خبر ہے شاید وہی اللہ کے نزدیک اس سے بہتر ہو۔

قرآن میں مردوں کا مردوں کے ساتھ اور عورتوں کا عورتوں کے ساتھ استہزاء کرنے اور اس کی حرمت کا ذکر فرمایا حالاں کہ کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ یا کوئی عورت کسی مرد کے ساتھ استہزاء کرے تو وہ بھی اس حرمت میں داخل ہے مگر اس کا ذکر نہ کرنے سے اشارہ اس طرف ہے کہ عورتوں اور مردوں کا اختلاط ہی شرعاً ممنوع اور مذموم ہے جب اختلاط نہیں تو تمسخر کا تحقق ہی نہیں ہوگا۔

حاصل آیت کا یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے بدن یا صورت یا قد و قامت وغیرہ میں کوئی عیب نظر آئے تو کسی کو اس پر ہنسنے یا استہزاء کرنے کی جرأت نہیں کرنی چاہئے کیوں کہ اسے معلوم نہیں کہ شاید وہ اپنے صدق و اخلاص کے سبب اللہ کے نزدیک اس سے بہتر اور افضل ہو۔

اس آیت کو سن کر سلف صالحین کا حال یہ ہوگیا تھا کہ عمرو بن شرحبیل نے فرمایا: میں اگر کسی شخص کو بکری کے تھنوں سے منہ لگا کر دودھ پیتے دیکھوں اور اس پر مجھے ہنسی آجائے تو میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میں بھی ایسا ہی نہ ہو جاؤں۔ حضرت عبداللہ بن

مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں اگر کسی کتے کے ساتھ بھی استہزاء کروں تو مجھے ڈر ہوتا ہے کہ میں خود کتا نہ بنادیا جاؤں۔[1]

مسند احمد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی صورتوں اور ان کے مال و دولت پر نظر نہیں فرماتا بلکہ اُن کے قلوب اور اعمال کو دیکھتا ہے[2] امام قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس حدیث سے ایک ضابطہ اور اصل یہ معلوم ہوئی کہ کسی شخص کے معاملہ میں اس کے ظاہری حال کو دیکھ کر کوئی قطعی حکم لگا دینا درست نہیں، کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ جس شخص کے ظاہری اعمال و افعال کو ہم بہت اچھا سمجھ رہے ہیں اللہ تعالیٰ جو اس کے باطنی حالات اور قلبی کیفیات کو جانتا ہے وہ شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک مذموم ہو اور جس شخص کے ظاہری حال اور اعمال برے ہیں ہوسکتا ہے کہ اس کے باطنی حالات اور قلبی کیفیات اس کے اعمالِ بد کا کفارہ بن جائیں اس لئے جس شخص کو حقیر و ذلیل سمجھنے کی اجازت نہیں۔[3]

② دوسری چیز جس کی ممانعت اس آیت میں کی گئی ہے۔ وہ لَمز ہے، لمز کے معنی کسی میں عیب نکالنے اور عیب ظاہر کرنے یا عیب پر طعنہ زنی کرنے کے ہیں آیت میں ارشاد فرمایا ﴿لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ یعنی تم اپنے عیب نہ نکالو۔ یہ ارشاد ایسا ہی ہے جیسے قرآن کریم میں ہے ﴿لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾[4] جس کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔

دونوں جگہ اپنے آپ کو قتل کرنے یا اپنے عیب نکالنے سے مراد یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرو، ایک دوسرے کو طعنہ نہ دو۔ اس عنوان سے تعبیر

[1] قرطبی: ۸/۲۳۳، الحجرات: ۱۱
[2] مسند احمد: ۲/۵۳۹، رقم الحدیث: ۱۰۵۷۶
[3] قرطبی: ۸/۲۳۴، الحجرات: ۱۱
[4] النسآء: ۲۹

کرنے میں حکمت یہ بتلانا ہے کہ کسی دوسرے کو قتل کرنا ایک حیثیت سے اپنے آپ ہی کو قتل کرنا ہے۔[1]

کیوں کہ اکثر تو ایسا ہو ہی جاتا ہے کہ ایک نے دوسرے کو قتل کیا دوسرے کے حمایتی لوگوں نے اس کو قتل کر دیا، اور اگر یہ بھی نہ ہو تو اصل بات یہ ہے کہ مسلمان سب بھائی بھائی ہیں اپنے بھائی کو قتل کرنا گویا خود اپنے آپ کو قتل کرنا اور بے دست و پا بنانا ہے یہی معنی یہاں ﴿لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ میں ہیں کہ تم جو دوسروں کے عیب نکالو اور طعنہ دو تو یاد رکھو کہ عیب سے کوئی انسان عادۃً خالی نہیں ہوتا، تم اس کے عیب نکالو گے تو وہ تمہارے عیب نکالے گا جیسا کہ بعض علماء نے فرمایا: "وَفِيْكَ عُيُوْبٌ وَلِلنَّاسِ أَعْيُنٌ" یعنی تم میں بھی کچھ عیوب ہیں اور لوگوں کی آنکھیں ہیں جو اُن کو دیکھتی ہیں تم کسی کے عیب نکالو گے اور طعنہ زنی کرو گے تو وہ تم پر یہی عمل کریں گے اور بالفرض اگر اس نے صبر بھی کیا تو بات وہی ہے کہ اپنے ایک بھائی کی بدنامی اور تذلیل پر غور کریں تو اپنی ہی تذلیل و تحقیر ہے۔

علماء نے فرمایا ہے: انسان کی سعادت اور خوش نصیبی اس میں ہے کہ اپنے عیوب پر نظر رکھے اُن کی اصلاح کی فکر میں لگا رہے اور جو ایسا کرے گا اس کو دوسروں کے عیب نکالنے اور بیان کرنے کی فرصت ہی نہیں ملے گی۔ ہندوستان کے آخری مسلمان بادشاہ ظفر نے خوب فرمایا ہے ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر، رہے دیکھتے لوگوں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر، تو جہان میں کوئی برا نہ رہا

۳ تیسری چیز جس کی آیت میں ممانعت کی گئی ہے وہ کسی دوسرے کو برے لقب سے پکارنا ہے، جس سے وہ ناراض ہوتا ہو۔ جیسے کسی کو لنگڑا، لولا، یا اندھا، کانا کہہ کر پکارنا یا ایسے نام سے کسی کا ذکر کرنا جو اس کی تحقیر کے لئے استعمال کیا جاتا ہو یہ سب

[1] قرطبی: ۸/۲۳٤، الحجرات: ۱۱

برے لقب میں شامل ہیں۔ حضرت ابوجبیرہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: یہ آیت ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے کیوں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو ہم میں اکثر آدمی ایسے تھے جن کے دو یا تین نام مشہور تھے اور ان میں سے بعض نام ایسے تھے جو لوگوں نے اس کو عار دلانے اور تحقیر و توہین کے لئے مشہور کر دیئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم نہ تھا بعض اوقات وہی برا نام لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو خطاب کرتے تو صحابہ عرض کرتے کہ یا رسول اللہ وہ اس نام سے ناراض ہوتا ہے اُس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ آیت میں "تنابز بالالقاب" سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص نے کوئی گناہ یا برا عمل کیا ہو اور پھر اُس سے تائب ہو گیا ہو اس کے بعد اس کو اُس برے عمل کے نام سے پکارنا، مثلاً چور، زانی یا شرابی وغیرہ۔ جس نے چوری، زنا، شراب سے توبہ کر لی ہو اس کو اس پچھلے عمل سے عار دلانا اور تحقیر کرنا حرام ہے۔ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی مسلمان کو ایسے گناہ پر عار دلائے جس سے اُس نے توبہ کر لی ہے تو اللہ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے کہ اس کو اسی گناہ میں مبتلا کر کے دُنیا و آخرت میں رُسوا کرے گا۔[1]

پہچان کی غرض سے بعض القابات سے پکارنا جائز ہے:

بعض لوگوں کے ایسے نام مشہور ہو جاتے ہیں جو فی نفسہ برے ہیں مگر وہ بغیر اُس لفظ کے پہچانا ہی نہیں جاتا تو اس کو اس نام سے ذکر کرنے کی اجازت پر علماء کا اتفاق ہے بشرطیکہ ذکر کرنے والے کا قصد اس سے تحقیر و تذلیل کا نہ ہو جیسے بعض محدثین کے نام کے ساتھ اعرج یا احدب مشہور ہے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو جس کے ہاتھ نسبتاً زیادہ طویل تھے ذوالیدین کے نام سے تعبیر فرمایا

[1] قرطبی: ۸/۲۳٦، الحجرات: ۱۱

ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی سے دریافت کیا گیا کہ اسانیدِ حدیث میں بعض ناموں کے ساتھ کچھ ایسے القاب آتے ہیں مثلاً حمید الطّویل، سلیمان الاعمش، مروان الاصفر، وغیرہ، تو کیا ان القاب کے ساتھ ذکر کرنا جائز ہے؟ آپ نے فرمایا: "جب تمہارا قصد اس کا عیب بیان کرنے کا نہ ہو بلکہ اس کی پہچان پوری کرنے کا ہو تو جائز ہے۔[1]"

اچھے القابات سے یاد کرنا سنت ہے:

ایسے القابات جن سے کسی کی پہچان بھی ہوتی ہو اور عزت بھی ہوتی ہو تو ایسے القابات کے ذریعے کسی کو پکارنا عین سنت ہے۔ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: مؤمن کا حق دوسرے مؤمن پر یہ ہے کہ اس کا ایسے نام و لقب سے ذکر کرے جو اُس کو زیادہ پسند ہو، اسی لئے عرب میں کنیت کا رواج عام تھا اور آں حضرت صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بھی اس کو پسند فرمایا۔ خود آں حضرت صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے خاص خاص صحابہ کو کچھ لقب دیئے ہیں، صدیقِ اکبر کو عتیق اور حضرت عمر رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کو فاروق اور حضرت حمزہ کو اسد اللہ اور خالد بن ولید کو سیف اللہ فرمایا ہے۔

تکلیف سے بچاؤ کا چوتھا راستہ

بدگمانی اور غیبت کی ممانعت:

بدگمانی اور غیبت یہ وہ دو برائیاں ہیں جو دیگر کئی برائیوں کی جڑ ہیں یہ برائیاں جس طرح جسم میں سرایت کر کے نقصان پہنچاتی ہیں اسی طرح معاشرے میں بھی فساد پیدا کرتی ہیں۔ ان برائیوں سے بچ کر انسان اپنے ایمان کو محفوظ کر سکتا ہے، اللہ

[1] قرطبی: ۸/۲۳۷، الحجرات: ۱۱

تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾[1]

ترجمہ: "اے ایمان والو بہت بدگمانیوں سے بچو، یقین مانو کہ بعض بدگمانیاں گناہ ہیں اور راز نہ ٹٹولا کرو۔ اور نہ تم میں سے کوئی کسی کی غیبت کرے۔ کیا تم میں سے کوئی بھی اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرتا ہے؟ تم کو اس سے گھن آئے گی، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔"

مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے تین چیزیں جن سے دوسرے انسان کو تکلیف ہوتی ہے حرام فرمائی ہیں۔

① ظن یعنی بدگمانی کرنا۔
② تجسس یعنی کسی پوشیدہ عیب کا سراغ لگانا۔
③ غیبت یعنی کسی غیر حاضر آدمی کے متعلق کوئی ایسی بات کہنا جس کو اگر وہ سنتا تو اس کو ناگوار ہوتی۔

❶ حرمتِ سوءِ ظن: ظن کے معنی گمانِ غالب کے ہیں، اس کے متعلق قرآن کریم نے اوّل تو یہ ارشاد فرمایا: "بہت سے گمانوں سے بچا کرو" پھر اُس کی وجہ یہ بیان فرمائی: "بعض گمان گناہ ہوتے ہیں" جس سے معلوم ہوا کہ ہر گمان گناہ نہیں ہوتا تو یہ ارشاد سننے والوں پر اس کی تحقیق واجب ہوگئی کہ کون سے گمان گناہ ہیں تاکہ اُن سے بچیں اور جب تک کسی گمان کا جائز ہونا معلوم نہ ہو جائے اس کے پاس نہ

[1] الحجرات: ۱۲

جائیں۔

علماء وفقہاء نے اس کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں۔ امام قرطبی رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی نے فرمایا کہ ظن سے مراد اس جگہ تہمت ہے یعنی کسی شخص پر بغیر کسی قوت ودلیل کے کسی عیب یا گناہ کا الزام لگانا۔ امام ابوبکر جصاص رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی نے احکام القرآن میں ایک جامع تفصیل اس طرح لکھی ہے کہ ظن کی چار قسمیں ہیں ① حرام ہے ② مأمور بہ اور واجب ہے، ③ مستحب اور مندوب ہے ④ مباح اور جائز ہے۔

ظنِ حرام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدگمانی رکھے کہ وہ مجھے عذاب ہی دے گا یا مصیبت ہی میں رکھے گا اس طرح کہ اللہ کی مغفرت اور رحمت سے گویا مایوس ہے۔ حضرت جابر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

"لَا یَمُوْتُ اَحَدُ کُمْ اِلَّا وَھُوَ یُحْسِنُ الظَّنَّ بِاللّٰہِ"[1]

تَرْجَمَہ: "تم میں سے کسی کو اس کے بغیر موت نہ آنی چاہئے کہ اس کا اللہ کے ساتھ اچھا گمان ہو۔"

حدیث قدسی ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي"[2] یعنی اپنے بندے کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرتا ہوں جیسا وہ میرے ساتھ گمان رکھتا ہے اب اس کو اختیار ہے کہ میرے ساتھ جو چاہے گمان رکھے۔

ظن کی کل پانچ اقسام ہیں:

① فرض ② حرام ③ واجب ④ مباح ⑤ مستحب۔

① ظنِ فرض: اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن فرض ہے اور بدگمانی حرام ہے۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب الجنائز، باب ما یستحب من حسن الظن باللّٰہ عند الموت: ۸۴/۲

[2] مسند احمد: ۳۱۵/۲، مسند ابی ھریرہ: ص ۶۰۷

② ظنِ حرام: وہ مسلمان جو ظاہری حالت میں نیک دیکھے جاتے ہیں اُن کے متعلق بلا کسی قوی دلیل کے بدگمانی کرنا حرام ہے۔

حضرت ابوہریرہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

"اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَکْذَبُ الْحَدِیْثِ"[1] یعنی گمان سے بچو کیوں کہ گمان جھوٹی بات ہے۔ یہاں ظن سے مراد بالاتفاق کسی مسلمان کے ساتھ بلا کسی قوی دلیل کے بدگمانی کرنا ہے۔

③ ظنِ واجب: شریعت کے کام ایسے ہیں کہ اُن میں کسی جانب پر عمل کرنا شرعاً ضروری ہے اور اس کے متعلق قرآن وسنت میں کوئی دلیل واضح موجود نہیں، وہاں پر ظن غالب پر عمل کرنا واجب ہے۔

جیسے باہمی منازعات ومقدمات کے فیصلہ میں معتمد گواہوں کی گواہی کے مطابق فیصلہ دینا کیوں کہ حاکم اور قاضی جس کی عدالت میں مقدمہ دائر ہے اُس پر اس کا فیصلہ دینا واجب ہے اور اس خاص معاملے کے لئے کوئی نص قرآن وحدیث میں موجود نہیں تو با اعتماد آدمیوں کی گواہی پر عمل کرنا اس کے لئے واجب ہے اگرچہ یہ امکان واحتمال وہاں بھی ہے کہ شاید کسی با اعتماد آدمی نے اس وقت جھوٹ بولا ہو اس لئے اس کا سچا ہونا صرف ظن غالب ہے، اور اسی پر عمل واجب ہے۔

اسی طرح جہاں سمت قبلہ معلوم نہ ہو اور کوئی ایسا آدمی بھی نہ ہو جس سے معلوم کیا جاسکے وہاں اپنے ظن غالب پر عمل ضروری ہے اسی طرح کسی شخص پر کسی چیز کا ضمان دینا واجب ہوا تو اس ضائع شدہ چیز کی قیمت میں ظن غالب ہی پر عمل کرنا واجب ہے۔

④ ظنِ مباح: ظنِ مباح ایسا ہے جیسے نماز کی رکعتوں میں شک ہوجائے کہ تین

---

[1] مسند احمد: ۲۸۷/۲، رقم: ۷۷۹۸

پڑھی ہیں یا چار تو اپنے ظنِ غالب پر عمل کرنا جائز ہے۔ اور اگر وہ ظنِ غالب کو چھوڑ کر امرِ یقینی پر عمل کرے یعنی تین رکعت قرار دے کر چوتھی پڑھ لے تو یہ بھی جائز ہے۔

⑤ **ظنِ مستحب:** ظنِ مستحب و مندوب یہ ہے کہ ہر مسلمان کے ساتھ نیک گمان رکھے کہ اس پر ثواب ملتا ہے۔[1]

امام قرطبی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لَوْلَآ إِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنْفُسِهِمْ خَيْرًا﴾[2] **تَرجَمہ:** ”ایسے سنتے ہی مؤمن مردوں اور عورتوں نے اپنے حق میں نیک گمانی کیوں نہ کی۔“

اس آیت میں حسنِ ظن بالمؤمنین کی تاکید آئی ہے۔[3]

یہ مشہور ہے: ”إِنَّ مِنَ الْحَزْمِ سُوْءُ الظَّنِّ“ یعنی احتیاط کی بات یہ ہے کہ ہر شخص سے بدگمانی رکھے اس کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ ایسا کرے جیسے بدگمانی کی صورت میں کیا جاتا ہے کہ قوی اعتماد کے بغیر اپنی چیز کسی کے حوالہ نہ کرے نہ یہ کہ اس کو چور سمجھے اور اس کی تحقیر کرے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کسی شخص کو چور یا غدار سمجھے بغیر اپنے معاملے میں احتیاط برتے۔ شیخ سعدی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کے اس قول کا بھی یہی مطلب ہے ؎

نگہ دار و آں شوخ در کیسہ دُر … کہ داند ہمہ خلق را کیسہ بُر[4]

❷ **حرمتِ تجسس:** دوسری چیز جس سے اس آیت میں منع کیا گیا ہے تجسس یعنی کسی کے عیب کی تلاش کرنا اور سراغ لگانا ہے۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ جو چیز تمہارے سامنے آجائے اس کو پکڑ سکتے ہو اور کسی مسلمان کا جو عیب ظاہر نہ ہو اُس کی جستجو اور تلاش کرنا جائز نہیں۔

---

[1] احکام القرآن للجصاص: ۳/۴۰۶، الحجرات: ۱۲
[2] النور: ۱۲
[3] قرطبی: ۸/۲۳۹، الحجرات: ۱۲
[4] معارف القرآن: ۸/۱۲۰، الحجرات: ۱۲

احادیث میں کسی کا عیب تلاش کرنے کی سخت ممانعت آئی ہے اور ایسا کرنے والے کے لئے سخت وعید آئی ہے۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کا ارشاد ہے:

”لَا تَغْتَابُوا الْمُسْلِمِيْنَ وَلَا تَتَّبِعُوْا عَوْرَاتِهِمْ فَإِنَّهُ مَنْ يَتَّبِعْ عَوْرَةَ أَخِيْهِ يَتَّبِعِ اللّٰهُ عَوْرَتَهُ حَتّٰى يَفْضَحَهُ فِيْ بَيْتِهِ.“[1]

تَرجَمہ: ”مسلمانوں کی غیبت نہ کرو، اور اُن کے عیوب کی جستجو نہ کرو کیوں کہ جو شخص اپنے بھائی کے عیوب تلاش کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کے عیب کی تلاش کرتا ہے یہاں تک کہ اُس کو اس کے گھر کے اندر بھی رُسوا کردیتا ہے۔“

بیان القرآن میں ہے: چھپ کر کسی کی باتیں سننا یا اپنے کو سوتا ہوا بنا کر باتیں سننا بھی تجسس میں داخل ہے البتہ اگر کسی سے نقصان پہنچنے کا احتمال ہو اور اپنی یا دوسرے کسی مسلمان کی حفاظت کی غرض سے نقصان پہنچانے والے کی خفیہ تدبیروں اور ارادوں کا تجسس کرے تو جائز ہے۔[2]

کسی کا خط بلا اجازت دیکھنا:

تجسس میں کسی کا خط دیکھنا بھی شامل ہے چناں چہ حضرت عبداللہ بن عباس رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا سے روایت ہے کہ رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا:

”مَنْ نَظَرَ فِيْ كِتَابِ أَخِيْهِ بِغَيْرِ إِذْنِهِ فَإِنَّمَا يَنْظُرُ فِي النَّارِ.“

تَرجَمہ: ”جس نے اپنے بھائی کا خط اس کی اجازت کے بغیر دیکھا (یعنی پڑھا) تو گویا وہ جہنم دیکھ رہا ہے۔“[3]

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی سے کسی نے خط بلا

---

[1] مسند احمد: ۴/۴۲۴، رقم الحديث: ۱۹۳۰۲
[2] بیان القرآن: ۳/۴۴۰، الحجرات: ۱۱
[3] ابوداؤد، الوتر، باب الدعاء، رقم: ۱۴۸۵

اجازت دیکھنے کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا:

"کسی کا خط بلا اجازت دیکھنا جائز نہیں ہے مگر یہ اس صورت میں جب کہ اس سے خط لکھنے والے کو نقصان پہنچ رہا ہو کیوں کہ حدیث شریف میں ہے، مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں[1] اور کسی کے پوشیدہ رازوں کو ظاہر کرنا اس کو تکلیف دینے کے مترادف ہے کسی کا خط دیکھنے سے یہ تکلیف ضرور ہوتی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ بغیر اجازت کسی کی تحریر دیکھنا ایک فضول اور لغو کام ہے جس سے اللہ تعالیٰ منع فرما رہے ہیں۔

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ﴾[2]

ترجمہ: "(ایمان والے) وہ ہیں جو لغویات سے منہ موڑ لیتے ہیں۔"

لیکن اگر کسی کا خط دیکھنے میں کاتب کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہ ہو اور نہ اس میں کسی خفیہ بات کا احتمال ہو اور نہ دیکھنے والے کا نفع مقصود ہو مگر کاتب ہی کی کوئی مصلحت ہو تو پھر جائز بل کہ مستحب ہوگا جیسے ماں باپ کا اولاد کے خطوط کی نگرانی رکھنا، استاذ، اتالیق اور مربی کا طلباء کے خطوط کو دیکھنا یا حاکم کا رعایا کے اقوال و افعال کی خبر رکھنا تو یہ سب کہیں جائز ہے کہیں ضروری۔

حضور ﷺ نے حاطب بن ابی بلتعہ کا خط لے جانے والی سے زبردستی چھنوا لیا تھا[3] اگر بغیر عذر کے خط کو دیکھنا مطلقاً منع کیا جائے تو یہ بھی ہزاروں مفاسد کا فتح باب ہوتا ہے جس کا خلاصہ آزادی و خود سری ہے۔

ماں باپ اولاد کو منع نہ کریں، استاذ طلبہ کی باتوں میں دخل نہ دیں، حاکم رعایا کی نگرانی نہ کرے تو تربیت و سیاست کچھ نہ ہو سکے۔[4]

---

[1] بخاری، باب المسلم من سلم المسلمون: ۱/۶

[2] المؤمنون: ۳

[3] مسلم، فضائل الصحابة: رقم ۲۴۹٤

[4] مجالس الحکمت: ص۱۸۳ تا ۱۸۵

کسی کا فون سننا:

تجسس ہی میں یہ بھی داخل ہے کہ کسی کا فون اس کی لاعلمی میں سن لیا۔ کوئی انسان اپنے راز کا اظہار پسند نہیں کرتا لیکن بعض اوقات باتوں ہی باتوں میں آدمی غیر شعوری طور پر راز کی باتیں بھی زبان پر لے آتا ہے یا اپنے گھر والوں سے ایسی گفتگو ہی ہو جاتی ہے کہ دوسرے لوگوں کے سامنے وہ یہ اظہار نہیں کرنا چاہتا، اسی لئے اگر کوئی اپنے گھر یا دوستوں سے فون پر بات کر رہا ہو تو چھپ کر کسی ایکسٹینشن وغیرہ سے اس کی باتوں کا خواہ مخواہ کھوج لگانا اور ان کی باتیں سننا شرعاً بھی ناجائز ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

"مَنِ اسْتَمَعَ إِلٰى حَدِيْثِ قَوْمٍ وَهُمْ لَهُ كَارِهُوْنَ أَوْ يَفِرُّوْنَ مِنْهُ صُبَّ فِيْ أُذُنِهِ الْآنُكُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ."[1]

ترجمہ: "جو شخص کسی قوم کی باتیں (چھپ کر) سنے اور وہ لوگ اس بات کو ناپسند کرتے ہوں تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس شخص کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیں گے۔" (معاذ اللہ)

③ **حرمتِ غیبت:** تیسری چیز جس سے اس آیت میں منع فرمایا گیا ہے وہ کسی کی غیبت کرنا ہے، یعنی اس کی غیر موجودگی میں اس کے متعلق کوئی ایسی بات کہنا جس کو وہ سنتا تو اس کو ایذا ہوتی اگرچہ وہ سچی بات ہی ہو کیوں کہ جو غلط الزام لگائے وہ تہمت ہے جس کی حرمت الگ قرآن کریم سے ثابت ہے اور غیبت کی تعریف میں اس شخص کی غیر موجودگی کی قید سے یہ نہ سمجھا جائے کہ موجودگی کی حالت میں ایسی رنج دہ بات کہنا جائز ہے۔ کیوں کہ وہ غیبت تو نہیں مگر "لَمْز" (طعنہ زنی، عیب جوئی) میں داخل ہے جس کی حرمت اس سے پہلی آیت میں آچکی ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب التعبیر، باب من کذب فی حلمہ: رقم ۷۰٤۲

﴿اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا﴾[1] اس آیت نے کسی مسلمان کی آبروریزی اور توہین وتحقیر کو اس کا گوشت کھانے کی مثل ومشابہ قرار دیا ہے اگر وہ شخص اس کے سامنے ہو تو ایسا ہے جیسے کسی زندہ انسان کا گوشت نوچ کر کھایا جائے، اس کو قرآن میں بلفظ لمز تعبیر کر کے حرام قرار دیا ہے جیسا کہ ابھی گزرا ﴿لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ اور سورۂ ہمزہ میں ارشاد ہے ﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ﴾ تَرْجَمَۃ: ”بڑی خرابی ہے ہر ایسے شخص کی جو عیب ٹٹولنے والا، غیبت کرنے والا ہو۔“ یعنی عیب تلاش کرنا اور غیبت کرنا ایسا ہے جیسے کسی مردہ انسان کا گوشت کھایا جائے کہ جیسے مردہ کا گوشت کھانے سے مردے کو کوئی جسمانی اذیت نہیں ہوتی ایسے ہی اس غائب کو جب تک غیبت کی خبر نہیں ہوتی اس کو بھی کوئی اذیت نہیں ہوتی، مگر جیسا کسی مردہ مسلمان کا گوشت کھانا حرام اور بڑی خفت وذلت کا کام ہے اسی طرح غیبت حرام بھی ہے اور خفت وذلت بھی کہ پیٹھ پیچھے کسی کو برا کہنا کوئی بہادری کا کام نہیں۔

اس آیت میں ظن اور تجسس اور غیبت تین چیزوں کی حرمت کا بیان ہے مگر غیبت کی حرمت کا زیادہ اہتمام فرمایا کہ اس کو کسی مردہ مسلمان کا گوشت کھانے سے تشبیہ دے کر اُس کی حرمت اور خفت وذلت کو واضح فرمایا، حکمت اس کی یہ ہے کہ کسی کے سامنے اُس کے عیوب ظاہر کرنا بھی اگرچہ ایذا رسانی کی بنا پر حرام ہے مگر اس کی روک تھام وہ آدمی خود بھی کر سکتا ہے اور روک تھام کے خطرہ سے ہر ایک کی ہمت بھی نہیں ہوتی اور وہ عادۃً زیادہ دیر رہ بھی نہیں سکتا۔

بخلاف غیبت کے کہ وہاں کوئی روک تھام والا نہیں ہر کمتر سے کمتر آدمی بڑے سے بڑے کی غیبت کر سکتا ہے اور چوں کہ کوئی روک تھام نہیں ہوتی اس لئے اس کا سلسلہ بھی عموماً طویل ہوتا ہے اور اس میں ابتلاء بھی زیادہ ہے اس لئے غیبت کی

[1] الحجرات: ١٢

حرمت زیادہ مؤکد کی گئی۔ عام مسلمانوں پر لازم کیا گیا کہ جو سنے وہ اپنے غائب بھائی کی طرف سے بشرط قدرت روک تھام کرے اور روک تھام پر قدرت نہ ہو تو کم از کم اس کے سننے سے پرہیز کرے کیوں کہ غیبت کا ارادے اور اختیار سے سننا بھی ایسا ہی ہے جیسے خود غیبت کرنا۔

غیبت کرنے والے کے لئے وعیدیں

❶ پہلی وعید: زبان اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے، لیکن جس طرح یہ ایک بے بہا نعمت ہے، اس طرح یہ ایک خطرناک اور نہایت نقصان دہ آفت کا سبب بھی ہے، جیسا کہ حدیث پاک میں ہے جس کا مفہوم ہے: ”لوگ اوندھے منہ جہنم میں اسی زبان کے باعث ڈالے جائیں گے۔“[1]

حضرت میمون رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے فرمایا کہ ایک روز خواب میں میں نے دیکھا کہ ایک زنگی (حبشی) کا مردہ جسم ہے اور کوئی کہنے والا ان کو مخاطب کر کے یہ کہہ رہا ہے کہ اس کو کھاؤ۔ میں نے کہا کہ اے خدا کے بندے میں اس کو کیوں کھاؤں تو اُس شخص نے کہا اس لئے کہ تو نے فلاں شخص کے زنگی غلام کی غیبت کی ہے۔ میں نے کہا کہ خدا کی قسم میں نے تو اس کے متعلق کوئی اچھی بری بات کی ہی نہیں تو اُس شخص نے کہا کہ ہاں، لیکن تو نے اس کی غیبت سنی تو ہے اور تو اس پر راضی رہا۔ حضرت میمون رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کا حال اس خواب کے بعد یہ ہوگیا کہ نہ خود کبھی کسی کی غیبت کرتے اور نہ کسی کو اپنی مجلس میں کسی کی غیبت کرنے دیتے۔[2]

❷ دوسری وعید: حضرت انس بن مالک رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کی روایت ہے کہ شبِ معراج کی حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے لے جایا گیا تو میرا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ اپنے چہروں اور بدن کا

[1] بخاری، باب حفظ اللسان: ٢/٩٥٩
[2] التفسیر المظہری: ٩/٥٥، الحجرات: ١٢

گوشت نوچ رہے تھے، میں نے جبرئیل امین سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے بھائی کی غیبت کرتے اور اُن کی آبروریزی کرتے تھے۔[۱]

۳ **تیسری وعید:** حضرت ابوسعید اور جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اَلْغِيْبَةُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا" یعنی غیبت زنا سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے۔ صحابۂ کرام نے عرض کیا کہ یہ کیسے، تو آپ نے فرمایا کہ ایک شخص زنا کرتا ہے پھر توبہ کر لیتا ہے تو اس کا گناہ معاف ہو جاتا ہے اور غیبت کرنے والے کا گناہ اس وقت تک معاف نہیں ہوتا جب تک وہ شخص معاف نہ کرے جس کی غیبت کی گئی ہے۔[۲]

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غیبت ایک ایسا گناہ ہے جس میں حق تعالیٰ کی بھی مخالفت ہے اور بندوں کا حق بھی ضائع ہوتا ہے اس لئے جس کی غیبت کی گئی ہے اُس سے معاف کرانا ضروری ہے۔ اگر وہ شخص مرگیا ہے جس کی غیبت کی تھی اور زندگی میں معافی نہیں مانگ سکا یا اس کا پتہ نہیں تو اس کا کفارہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اِنَّ مِنْ كَفَّارَةِ الْغِيْبَةِ اَنْ تَسْتَغْفِرَ لِمَنِ اغْتَبْتَهٗ تَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَلَهٗ"[۳]

یعنی غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ جس کی غیبت کی گئی ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعائے مغفرت کرے اور یوں کہے کہ یا اللہ ہمارے اور اس کے گناہوں کو معاف فرما۔

---

۱ سنن ابی داؤد، باب فی الغیبۃ: ۳۱۳/۲
۲ المستطرف فی کل فنّ مستظرف: ۲۷۳/۱
۳ مشکوٰۃ المصابیح، باب حفظ اللسان: ص۴۱۵، رقم: ۴۸۷۷

۴ **چوتھی وعید:** حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دو قبروں کے پاس سے گزر ہوا تو فرمایا: ان قبر والوں کو عذاب ہو رہا ہے مگر کسی بڑے گناہ کی وجہ سے نہیں بل کہ ان میں سے ایک تو پیشاب سے نہیں بچتا تھا اور دوسرا چغل خوری کی وجہ سے اس عذاب میں مبتلا ہے۔[۱]

حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ چغل خور جنت میں نہیں جائے گا۔[۲]

فائدہ: بچے مجنون اور کافر ذمی کی غیبت بھی حرام ہے کیوں کہ ان کی ایذا بھی حرام ہے اور جو کافر حربی ہیں اگرچہ ان کی ایذا حرام نہیں مگر اپنا وقت ضائع کرنے کی وجہ سے پھر بھی غیبت مکروہ ہے۔

غیبت جیسے قول اور کلام سے ہوتی ہے ایسے ہی فعل یا اشارہ سے بھی ہوتی ہے جیسے کسی لنگڑے کی چال بنا کر چلنا جس سے اُس کی تحقیر ہو۔[۳]

بعض روایات سے ثابت ہے کہ آیت میں جو غیبت کی عام حرمت کا حکم ہے بعض صورتوں میں اس کی اجازت ہوئی ہے مثلاً کسی شخص کی برائی کسی ضرورت یا مصلحت سے کرنا پڑے تو وہ غیبت میں داخل نہیں بشرطیکہ وہ ضرورت و مصلحت شرعاً معتبر ہو جیسے کسی ظالم کی شکایت کسی ایسے شخص کے سامنے کرنا جو ظلم کو دفع کر سکے، یا کسی اولاد و بیوی کی شکایت اُس کے باپ اور شوہر سے کرنا جو اُن کی اصلاح کر سکے، یا کسی واقعہ کے متعلق فتویٰ حاصل کرنے کے لئے صورتِ واقعہ کا اظہار یا مسلمانوں کو کسی شخص کے دینی یا دُنیوی شر سے بچانے کے لئے کسی کا حال بتلانا، یا کسی معاملے کے متعلق مشورہ لینے کے لئے اس کا حال ذکر کرنا، یا جو شخص سب کے

---

۱ بخاری، باب من الکبائر ان لا یستتر من البول: ۳۴/۱
۲ ترمذی، باب ماجاء فی النمام: ۲۲/۲
۳ معارف القرآن: ۱۱۳/۸ تا ۱۲۲

سامنے کھلم کھلا گناہ کرتا ہے اور اپنے فسق کو خود ظاہر کرتا پھرتا ہے اس کے اعمالِ بد کا ذکر بھی غیبت میں داخل نہیں مگر بلا ضرورت اپنے اوقات کو ضائع کرنے کی بناء پر مکروہ ہے اور ان سب باتوں میں قدر مشترک یہ ہے کہ کسی کی برائی اور عیب ذکر کرنے سے مقصود اس کی تحقیر نہ ہو بلکہ کسی ضرورت و مجبوری سے ذکر کیا گیا ہو۔[1]

مسلمان کی عزت وحرمت کا مقام

حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے: حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اے وہ لوگو! جو زبانی طور پر مسلمان ہوئے ہو اور ان کے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا مسلمانوں کی غیبتیں نہ کرو اور ان کے عیبوں کے پیچھے نہ پڑو۔ کیوں کہ جو شخص ان کے عیبوں کے پیچھے پڑے گا اللہ تعالیٰ اس کے عیبوں کے پیچھے پڑے گا۔ (یعنی ان کو کھول دے گا) اور اللہ تعالیٰ جس کے عیبوں کا پیچھا کرے گا۔ اس کو رسوا فرما دے گا اگرچہ وہ اپنے گھر کے اندر ہو۔"[2]

غور کرنے کی بات ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کی غیبت میں مبتلا ہوں اور ان کے عیبوں کے پیچھے لگیں۔ ان کو حضور اقدس ﷺ نے یوں خطاب فرمایا کہ اے وہ لوگو! جو زبانی طور پر مسلمان ہوئے اور ان کے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا۔ مسلمانوں کی غیبت نہ کرو۔

اس انداز بیان میں اس طرف اشارہ ہے کہ مسلمانوں کی غیبت کرنے والا اور ان کے عیبوں کے پیچھے پڑنے والا (یعنی عیبوں کی تلاش اور ٹوہ میں رہنے والا) مسلمان نہیں ہوگا بلکہ ایسی حرکت منافق ہی سے سرزد ہو سکتی ہے جو زبان سے مسلمان ہوتا ہے دل سے مسلمان نہیں ہوتا۔

حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

[1] روح المعانی: ۱۳/۱۶۱، الحجرات: ۱۲
[2] ابوداؤد، کتاب الأدب، باب فی الغیبة: ۲/۳۱۳، رقم: ۴۸۸

"کُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُهُ وَمَالُهُ وَعِرْضُهُ."[1]

ترجمہ: "یعنی مسلمان کا مسلمان پر سب کچھ حرام ہے اس کا خون بھی، مال بھی، اور اس کو بے آبرو کرنا بھی۔"

بہت سے لوگوں کا ذریعۂ معاش ہی یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کی غیبتیں کیا کریں اور لوگوں پر کیچڑ اچھالا کریں۔ سیاسی جماعتوں اور صحافت سے تعلق رکھنے والوں کا تو یہ خصوصی مشغلہ اور پیشہ ہے اور بہت سے لوگ درباری ہوتے ہیں۔ اس رئیس کے یہاں گئے تو اس سے پرخاش رکھنے والے کی غیبت کر کے روٹی کھالی اور اس امیر کے یہاں گئے تو اس کے یہاں کسی پر کیچڑ اچھالی اور پرانی شیروانی اس کے عوض لے اڑے، صرف دنیا سامنے ہے آخرت کی فکر ہوتی تو ایسا نہ کرتے۔

حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جس شخص نے کسی مسلمان کی غیبت کے ذریعہ کوئی لقمہ کھایا۔ تو اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ سے اتنا ہی لقمہ کھلائے گا اور جس کسی کو کسی مسلمان کی غیبت کی وجہ سے کوئی کپڑا پہنا دیا گیا تو اللہ تعالیٰ اس کو اسی قدر جہنم سے (کپڑا) پہنائے گا اور جو شخص کسی شخص کی وجہ سے شہرت یا ریاکاری کے مقام پر کھڑا ہوا (یعنی کسی کو بڑا بزرگ اور شیخ ظاہر کرے اور اس کو اپنی اغراض کا ذریعہ بنا لے) تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو (رسوا کرنے کے لئے) ریا اور شہرت کے مقام پر کھڑا کرے گا۔ (تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ شخص ایسا تھا)۔"[2]

غیبت کا دُنیاوی اور اُخروی نقصان:

حماد بن مسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ایک شخص نے غلام فروخت کیا اور کہا کہ چغل خوری کے سوا اس میں کوئی عیب نہیں، اس شخص نے کہا مجھے قبول ہے اور

[1] مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم ظلم المسلم ......، رقم: ۶۵۴۱
[2] ابوداؤد، کتاب الأدب، باب فی الغیبة: ۲/۳۱۳، رقم: ۴۸۸۱

خرید کر لے گیا۔ غلام اپنے نئے مالک کے پاس کچھ دن رہنے کے بعد ایک دن اس کی بیوی سے کہنے لگا:

"تیرا شوہر تم سے محبت نہیں کرتا اور وہ تم سے جان چھڑانا چاہتا ہے، تم ایسا کرو کہ استرہ لے کر رات کو سوتے میں اس کی گدی کے کچھ بال کاٹ لاؤ میں ان پر سحر کردوں گا، جس سے وہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔"

ادھر جا کر اس کے شوہر سے کہا: "تمہاری بیوی کا ایک شخص سے معاشقہ چل رہا ہے اگر اعتبار نہ آئے تو نیند کی حالت بنا کر دیکھ لو"، چناں چہ شوہر نے ایک دن نیند کی حالت بنائی تو بیوی استرہ لے آئی، شوہر نے سمجھا واقعی یہ مجھے قتل کرنا چاہتی ہے، چناں چہ وہ اٹھا اور اس نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا، اتنے میں بیوی کے گھر والے آئے انہوں نے شوہر کو قتل کر دیا، یوں دو قبیلوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔[1]

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے بندوں میں بدترین وہ لوگ ہیں جو چغل خوری کرتے ہیں اور دوستوں کے درمیان فساد ڈلواتے ہیں اور بے گناہ لوگوں کے عیب تلاش کرتے رہتے ہیں۔[2]

ایک اور حدیث میں ہے: حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو شخص مجھے اپنی زبان اور اپنی شرم گاہ کی حفاظت کی ضمانت دے دے، میں اس کے لئے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔"[3]

زبان کی مثال دو دھار تلوار کی سی ہے، اگر قرآن وسنت اور احکام الٰہی کے مطابق حدود شرعیہ میں رہتے ہوئے اس سے صحیح کام لیا جائے تو اللہ تعالیٰ کے قرب اور رضا کا بہترین ذریعہ ہے اور اگر اسے حدود شرعیہ کے خلاف چلایا جائے تو پھر یہی

[1] سمير المؤمنين: ۱۷۹، بحواله روضة العقلاء: ۱۷۹
[2] الترغيب والترهيب، الترهيب من النميمة: ۳/۳۲۵
[3] بخاری، باب حفظ اللسان: ۲/۹۵۸

جہنم لے جانے کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔ افسوس لوگ چغل خوری کو معمولی تصور کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو اس ہلاکت خیز عمل سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

تکلیف سے بچاؤ کا پانچواں راستہ

زبان اور ہاتھ کی حفاظت:

ہر انسان اپنے روز مرہ کے معاملات میں زبان اور ہاتھ کو سب سے زیادہ استعمال میں لاتا ہے اور جو چیز سب سے زیادہ استعمال ہوتی ہے اس کے فائدے کے ساتھ ساتھ نقصان کا بھی اندیشہ ہوتا ہے بالکل اسی طرح زبان اور ہاتھ جس طرح انسان کو فائدہ پہنچاتے ہیں اگر انہیں صحیح استعمال نہ کیا جائے تو انسان کو نقصان بھی پہنچا دیتے ہیں۔ اور یہ نقصان اُس شخص کے لئے تکلیف کا ذریعہ بنتا ہی ہے اور کبھی کبھی دوسروں کی تکلیف کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔

اسی وجہ سے احادیث مبارکہ میں ان دو اعضاء کو صحیح استعمال کرنے اور ان کے ذریعے دوسروں کو تکلیف سے بچانے کی تاکید آئی ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ."[1]

ترجمہ: "کامل مسلمان وہی ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان سالم رہیں۔"

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالیٰ فرماتے ہیں: اس مختصر مگر نہایت جامع حدیث میں ایک ضروری قاعدہ بیان کیا گیا ہے جو مصالح شرعیہ وتمدنیہ دونوں کو شامل ہے، شریعت کی غرض تمدن کو محفوظ رکھنا نہیں، بل کہ اس کی

[1] بخاری: باب المسلم مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ: ۱/۶

غرض صرف یہ ہے کہ رضائے خداوندی حاصل ہو اور اللہ تعالیٰ و بندہ کے درمیان صحیح تعلق پیدا ہو، لیکن حق تعالیٰ کی عنایت ہے کہ اس نے احکام اس طور پر مقرر فرمائے کہ ان پر مصالح تمدنی بھی مرتب ہو جاتے ہیں۔

حدیث کے جملے "مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ" "جس سے مسلمان محفوظ رہیں" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غیر مسلم کی رعایت ضروری نہیں کیوں کہ ایک اور روایت میں ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ النَّاسُ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ، وَالْمُؤْمِنُ مَنْ أَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰى دِمَائِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ."[1]

ترجمہ: "کامل مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ و زبان (کی تکلیف) سے لوگ محفوظ ہوں، اور کامل مؤمن وہ ہے جس سے لوگوں کی جانیں اور اموال محفوظ ہوں۔"

لہٰذا تمام لوگوں کی رعایت ضروری ہوئی خواہ مسلم ہوں یا کافر، ان سب کے حقوق بھی لازم ہوئے، البتہ حربی اس حکم میں داخل نہیں، اور مسلمون جو جمع کے صیغہ سے ہے، تو جمع سے کبھی مجموعہ مراد ہوتا ہے کبھی ہر ہر واحد ظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ہر ہر واحد مراد لیا جائے کہ ہر مسلمان اس کی ایذا سے محفوظ رہے۔

"مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ" اس کی زبان اور اس کے ہاتھ سے، اس میں دو قسم کے حقوق کی طرف اشارہ ہے گو یہ تین قسم کے مالی، جانی، عرضی حقوق چھڑانے کے ہیں جس کو اس حدیث میں صاف فرما دیا:

"إِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ، كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا."[2]

[1] مسند احمد: ۳۷۹/۲، رقم الحدیث: ۸۷۱۲

[2] بخاری، کتاب المناسک، باب الخطبة ایام منی: ۲۳۴/۱

ترجمہ: "تحقیق تمہارے خون تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں تم پر حرام ہیں مثل تمہاری اس دن کی حرمت کے۔"

یعنی (۱) آپس میں نہ ایک دوسرے کو قتل کرے (۲) نہ ناحق مال لے (۳) اور نہ آبروریزی کرے۔

پس یہ تین قسم کے حق ہیں، مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مال و جان کے حقوق تو اکثر ہاتھ سے ضائع ہوتے ہیں اور عزت اکثر زبان سے، مال کا حق مثلاً کسی کا مال لوٹ لیا، کسی کو لکھ دیا یا لوٹنے کے لئے اس کا آلہ یہی ہاتھ ہوگا، اب رہا جان کا حق یہ بھی ہاتھ ہی سے ہوتا ہے، اور اگر کسی کو زبان سے قتل کرنے کو کہا تو یہ بھی پورا ہاتھ ہی سے ہوگا، اب رہی آبرو تو وہ بھی ہاتھ سے تلف کی جاتی ہے اور اکثر زبان سے، گو یہ حقوق تین قسم کے ہیں، مگر انہی دو صورتوں میں داخل ہیں "مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ" پس حدیث کا خلاصہ یہ ہوا کہ کوئی مسلمان نہ کسی کی جان کو تکلیف دے نہ مال کو نہ آبرو کو۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ہمیں حقوق العباد کی بھی رعایت کرنا چاہئے، مثلاً اکثر لوگ مسجد کے اندر پچھلی دیوار سے مل کر نیت باندھتے ہیں، اگر اب وہاں سے کوئی نکلنا چاہے نکلے گا تو گناہ گار ہوگا، گناہ سے بچ نہیں سکتا اور گناہ سے بچے تو نکل نہیں سکتا اسے تکلیف ہوئی، غرض ہر عمل میں اس کا لحاظ رکھنا چاہئے۔[1]

پہلی حدیث میں دو نکتے قابلِ ذکر ہیں۔ (۱) حدیث میں ہاتھ اور زبان کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہاتھ اور زبان کے سوا کسی اور ذریعے سے تکلیف پہنچانا جائز ہے، ظاہر ہے کہ اصل مقصد ہر قسم کی تکلیف پہنچانے سے روکنا ہے، لیکن چوں کہ زیادہ تر تکلیفیں ہاتھ اور زبان سے پہنچتی ہیں، اس لئے ان کا بطور خاص ذکر کر دیا گیا ہے۔ (۲) حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ زبان

[1] کف الاذی: ص ۲۳، ۳۴، ۳۵، بحوالہ حقوق العباد: ص ۳۳، ۳۴

اور ہاتھ سے دوسرے "مسلمان" محفوظ رہیں، اس کا بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی غیر مسلم کو تکلیف پہنچانا جائز ہے، چوں کہ بات ایک اسلامی معاشرے کی ہو رہی ہے جس میں زیادہ تر واسطہ مسلمان ہی سے پڑتا ہے، اس لئے "مسلمان" کا ذکر بطور خاص کر دیا گیا ہے، ورنہ قرآن و حدیث کے دوسرے ارشادات کی روشنی میں یہ اصول تمام فقہاء کے نزدیک مسلّم ہے کہ جو غیر مسلم افراد کسی اسلامی ملک میں امن کے ساتھ قانون کے مطابق رہتے ہوں جس کا ذکر دوسری حدیث میں آچکا ہے، بیشتر معاشرتی احکام میں ان کو بھی وہی حقوق حاصل ہوتے ہیں جو ملک کے مسلمان باشندوں کو حاصل ہیں، لہٰذا جس طرح کسی مسلمان کو کوئی ناروا تکلیف پہنچانا حرام ہے، اسی طرح مسلمان ملک کے کسی غیر مسلم باشندے کو بھی ناحق تکلیف دینا حرام و ناجائز ہے۔

زبان سے تکلیف نہ دینے کا مطلب

اس حدیث میں دو لفظ استعمال فرمائے، (١) "مِنْ لِّسَانِهٖ" (٢) "وَيَدِهٖ" یعنی دوسرے مسلمان دو چیزوں سے محفوظ رہیں، ایک اس کی زبان سے اور دوسرے اس کے ہاتھ سے۔ زبان سے محفوظ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کوئی ایسا کلمہ نہ کہے جس سے سننے والے کا دل ٹوٹے یا اس کو تکلیف پہنچے اور اس کی دل آزاری ہو۔

اگر بالفرض دوسرے مسلمان کی کسی بات پر تنقید کرنی ہے تو بھی ایسے الفاظ استعمال کرے جس سے اس کی دل آزاری بالکل نہ ہو، یا کم سے کم ہو۔ مثلاً اس سے یہ کہہ دیں کہ آپ کی فلاں بات مجھے اچھی نہیں لگی، یا آپ فلاں بات پر غور کرلیں، وہ بات اصلاح کے لائق ہے اور شریعت کے مطابق نہیں ہے۔ لیکن کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا جس سے اس کو تکلیف ہو، مثلاً گالی گفتار اختیار کرنا، یا گالی گفتار سے بڑھ کر طعنہ دینا۔ "طعنہ" کا مطلب یہ ہے کہ براہ راست تو کوئی بات نہیں کی لیکن لپیٹ

کر بات کہہ دی اور یہ طعنہ ایسی چیز ہے جو دلوں میں زخم ڈال دیتا ہے، عربی شاعر کا ایک شعر ہے:

جَرَاحَاتُ السِّنَانِ لَهَا الْتِيَامُ
وَلَا يَلْتَامُ مَا جَرَحَ اللِّسَانُ [١]

"یعنی نیزے کا زخم بھر جاتا ہے۔ لیکن زبان کا زخم نہیں بھرتا۔"

اس لئے اگر کسی کی کوئی بات آپ کو ناگوار لگی ہے تو صاف صاف اس سے کہہ دو کہ فلاں بات آپ کی مجھے پسند نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا﴾ [٢]

ترجمہ: "اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سیدھی بات کرو۔"

آج کل فقرہ بازی ایک فن بن گیا ہے، فقرہ بازی کا مطلب یہ ہے کہ ایسی بات کی جائے کہ دوسرا شخص سن کر تلملاتا ہی رہ جائے۔ براہِ راست اس سے وہ بات نہیں کہی، بل کہ لپیٹ کر کہہ دی۔ ایسی باتیں کرنے والوں کی لوگ خوب تعریف بھی کرتے ہیں کہ یہ شخص تو بڑا زبردست انشاء پرداز ہے، اور بڑا لطیف مذاق کرنے والا ہے۔ [٣]

زبان کے ڈنک کا ایک قصہ:

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی فرمایا کرتے تھے: بعض لوگوں کی زبان میں ڈنک ہوتا ہے، چناں چہ ایسے لوگ جب بھی کسی سے بات کریں گے ڈنک ماریں گے، طعنہ اور طنز کی بات کریں گے۔ یا کسی پر اعتراض کی بات کریں گے۔ حالاں کہ اس انداز سے بات کرنے سے دل میں گرہیں پڑ جاتی ہیں۔ پھر

---

[١] شرح جامی: ١٣
[٢] الاحزاب: ٧٠
[٣] اصلاحی خطبات: ٨/١١٥، ١١٦

فرمایا: ایک صاحب کسی عزیز کے گھر گئے تو دیکھا ان کی بہو بہت غصے میں ہے اور زبان سے اپنی ساس کو برا بھلا کہہ رہی ہے اور ساس بھی پاس بیٹھی ہوئی تھی، ان صاحب نے اس کی ساس سے پوچھا کہ کیا بات ہوگئی؟ اتنا غصہ اس کو کیوں آرہا ہے؟ جواب میں ساس نے کہا:

بات کچھ بھی نہیں تھی۔ میں نے صرف دو بول بولے تھے، اس کی خطاء میں پکڑی گئی۔ اور اس کے نتیجے میں یہ ناچی ناچی پھر رہی ہے، اور غصہ کر رہی ہے۔ ان صاحب نے پوچھا کہ وہ دو بول کیا تھے؟ ساس نے کہا کہ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ باپ تیرا غلام اور ماں تیری لونڈی، بس اس کے بعد سے یہ ناچی ناچی پھر رہی ہے۔

اب دیکھئے: وہ صرف دو بول تھے۔ لیکن ایسے دو بول تھے جو انسان کے اندر آگ لگانے والے تھے۔ لہٰذا طعنہ کا انداز گھروں کو برباد کرنے والا ہے، دلوں میں بغض اور نفرتیں پیدا کرنے والا ہے، اس سے بچنا چاہئے، ہمیشہ صاف اور سیدھی بات کہنی چاہئے۔[1]

زبان کی آفتیں:

لہٰذا اگر ہم کسی کے دل کو خوش نہیں کر سکتے تو اس کے دل کو رنج بھی نہیں پہنچایا کریں۔ یاد رکھئے کہ بیماریوں میں سے سب سے بری دل کی بیماری ہے اور دل کی بیماریوں میں سے سب سے بری دل آزاری ہے۔ مگر ہم بڑی دیدہ دلیری سے دوسروں کی دل آزاری کر رہے ہوتے ہیں۔

خاوند بیوی کو کوئی ایسی بات کر دیتا ہے کہ وہ بے چاری سارا دن روتی رہ جاتی ہے اور بیوی خاوند کو ایسی بات کہہ دیتی ہے کہ اس بے چارے کا سکون برباد ہو جاتا

[1] اصلاحی خطبات: ۸/۱۱۸

ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ تلوار کے زخم تو مندمل ہو جاتے ہیں مگر زبان کے زخم مندمل نہیں ہوا کرتے۔ یہ زبان ان رشتوں کو بھی توڑ دیتی ہے جن رشتوں کو انسان تلوار کے ذریعے بھی نہیں توڑ سکتا۔ آج ہمیں زبان چلانے کی بڑی عادت ہے، ہر وقت ہی بولتے رہتے ہیں، سننے کی عادت نہیں ہے فقط بولنے کی عادت ہے۔[1]

زبان بڑی خوفناک چیز ہے:

چوں کہ زبان بڑی خوفناک چیز ہے۔ زبان سے جس قدر تکلیفیں دوسروں کو پہنچتی ہیں، ہاتھ سے اس قدر نہیں پہنچتیں اور نہ ہی پہنچائی جا سکتی ہیں۔ ہاتھ سے تو صرف وہاں تک تکلیف پہنچا سکتے ہیں جہاں تک ہاتھ پہنچے گا اور اگر ہاتھ میں لاٹھی ہے تو جہاں تک لاٹھی پہنچے گی اور اگر ہاتھ میں بندوق ہے تو جہاں تک بندوق کی گولی پہنچے گی وہاں تکلیف پہنچائی جا سکتی ہے، لیکن زبان کی رینج امریکہ تک پہنچ جاتی ہے، امریکہ میں بیٹھے ہوئے شخص کو یہاں بیٹھ کر گالی دی جا سکتی ہے۔

پھر یہ کہ ہاتھ سے تکلیف پہنچانے کے لئے طاقت کی بھی ضرورت ہے، اگر آپ اپنے سے زیادہ طاقت ور آدمی کو ہاتھ سے تکلیف پہنچانا چاہیں گے تو اولاً تو ہمت ہی نہیں ہوگی اور اگر پہنچائیں گے تو بہت مہنگی پڑ جائے گی، لیکن زبان کے ذریعے کمزور سے کمزور آدمی بڑے سے بڑے طاقت ور آدمی کو تکلیف پہنچا دیتا ہے۔

زبان سے جرائم بھی بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ زیادہ تر جھگڑے اور جرائم زبان کی وجہ سے ہوتے ہیں، ہاتھ کی وجہ سے کم ہوتے ہیں، گالی دینا، غیبت کرنا، تہمت لگانا وغیرہ یہ سب گناہ زبان سے ہوتے ہیں۔ اسی لئے رسول کریم ﷺ نے اپنے ارشاد میں زبان کو ہاتھ سے پہلے ذکر کیا۔

اگر آدمی زبان پر قابو پالے تو معاشرت کے آدھے مسائل حل ہو جاتے ہیں

[1] خطبات فقیر: ۸/۱۴۷

اور بے شمار گناہوں سے نجات مل جاتی ہے۔ اسی لئے بزرگ اس بات کی ہدایت کرتے ہیں کہ کم بولنے کی عادت ڈالی جائے۔ "قِلَّةُ الْكَلَامِ" (یعنی کم گوئی) بڑا اہم اصول ہے۔ اور کم گوئی کا مطلب یہ ہے کہ بے ضرورت نہ بولا جائے، ہاں جب ضرورت پیش آئے تو پھر بولو۔

کم گوئی اختیار کرنے کے طریقے

اس اصول پر عمل پیرا کرنے کے لئے بڑے بڑے مجاہدے اور ریاضتیں کرائی جاتی ہیں کیوں کہ جس شخص کو زیادہ بولنے کی عادت ہوتی ہے، اس سے یہ عادت چھڑانا بڑا مشکل ہوتا ہے۔

بعض لوگوں کو بیماری ہوتی ہے کہ ہر وقت بولتے رہتے ہیں حالاں کہ یہ بہت بری بیماری ہے۔ آدمی جتنا زیادہ بولتا ہے، اتنے ہی اس سے گناہ زیادہ ہوتے ہیں اور جتنا کم بولتا ہے، اتنے ہی کم گناہ ہوتے ہیں۔ بعض مرتبہ اس بیماری کا علاج ڈانٹ ڈپٹ سے ہو جاتا ہے کہ دو تین مرتبہ سب کے سامنے ڈانٹ دیا جائے تو یہ عادت چھوٹ جاتی ہے، لیکن بعض دفعہ ڈانٹ ڈپٹ سے بھی کام نہیں چلتا اور یہ عادت باقی رہتی ہے تو ایسی صورت میں بعض بزرگوں نے ایسا بھی کیا ہے کہ ایسے شخص کو منہ کے اندر لوہے کے گولے بنا کر رکھنے کا حکم دیا تا کہ جب بھی بولنے کی ضرورت پڑے تو پہلے خوب سوچے کہ بولنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ کیوں کہ بولنے سے پہلے گولے نکالنے پڑیں گے، بقدرِ ضرورت بات کرکے پھر گولوں کو دھو کر منہ میں رکھنا ہوگا، اب پھر بات کرنے کو جی چاہے گا تو سوچے گا کہ بولوں یا نہ بولوں کیوں کہ یہ ساری مشقت سامنے ہوگی۔ اس طرح کم بولنے کی عادت پڑ جائے گی۔[۱]

نبی اکرم ﷺ کے دل میں دوسروں کو تکلیف سے بچانے کی کس قدر

[۱] اصلاحی تقریریں: ۷۱/۲ تا ۷۳

اہمیت تھی؟ اس کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ آپ ﷺ ایک مرتبہ جمعہ کے دن خطبہ دے رہے تھے، اتنے میں آپ ﷺ نے دیکھا کہ ایک صاحب اگلی صفوں تک پہنچنے کے لئے لوگوں کی گردنیں پھلانگتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں، آپ ﷺ نے یہ منظر دیکھ کر خطبہ روک دیا اور اُن صاحب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "بیٹھ جاؤ تم نے لوگوں کو اذیت پہنچائی ہے۔"[۱]

نبی اکرم ﷺ نے خود ہی مسجد کی پہلی صف میں نماز پڑھنے کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے، بل کہ یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ پہلی صف میں کتنا اجر و ثواب ہے تو وہ پہلی صف میں جگہ پانے کے لئے قرعہ اندازی کرنے لگیں۔[۲]

لیکن یہ ساری فضیلت اسی وقت تک ہے جب تک پہلی صف میں پہنچنے کے لئے کسی دوسرے کو تکلیف دینی نہ پڑے، لیکن اگر اس سے کسی کو تکلیف پہنچنے لگے تو یہ اصول سامنے رکھنا ضروری ہے کہ پہلی صف تک پہنچنا مستحب ہے، اور دوسروں کو تکلیف سے بچانا واجب ہے، لہٰذا ایک مستحب کی خاطر کسی واجب کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔

مسجدِ حرام میں طواف کرتے ہوئے حجرِ اسود کو بوسہ دینا بہت اجر و ثواب رکھتا ہے، اور احادیث میں اس کی نجانے کتنی فضیلتیں بیان کی گئی ہیں، لیکن ساتھ ہی تاکید یہ ہے کہ اس فضیلت کے حصول کی کوشش اسی صورت میں کرنی چاہئے جب اس سے کسی دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے،[۳] چناں چہ دھکے دے کر اور دھینگا مشتی کرکے حجرِ اسود تک پہنچنے کی کوشش کرنا نہ صرف یہ کہ ثواب نہیں ہے بل کہ اس سے الٹا گناہ

[۱] سنن ابن ماجه، باب ماجاء في النهي عن تخطي الناس ......: ۷۸/۱

[۲] ترمذي، باب ماجاء في فضل الصف الاول: ۵۳/۱

[۳] ترمذي، باب ماجاء في تقبيل الحجر: ۱۷۴/۱

ہونے کا اندیشہ ہے، اگر کسی شخص کو تمام عمر حجرِ اسود کا بوسہ نہ مل سکے تو ان شاء اللہ اس سے یہ باز پرس نہیں ہوگی کہ تم نے حجرِ اسود کا بوسہ کیوں نہیں لیا؟ لیکن اگر بوسے لینے کے لئے کسی کمزور شخص کو دھکا دے کر تکلیف پہنچا دی تو یہ ایسا گناہ ہے جس کی معافی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک وہ شخص معاف نہ کر دے۔

غرض اسلام نے اپنی تعلیمات میں قدم قدم پر اس بات کا خیال رکھا ہے کہ ایک انسان دوسرے کے لئے تکلیف کا باعث نہ بنے، اسلام کی بیشتر معاشرتی تعلیمات اسی محور کے گرد گھومتی ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے:

؎ تمام عمر اسی احتیاط میں گزری
یہ آشیاں کسی شاخِ چمن پہ بار نہ ہو[1]

ظلم صرف یہ ہی نہیں ہے کہ کسی کا مال چھین لیا جائے، یا اسے جسمانی تکلیف پہنچانے کے لئے اس پر ہاتھ اٹھایا جائے، بل کہ عربی زبان میں "ظلم" کی تعریف یہ کی گئی ہے: "وَضْعُ الشَّیْئِ فِيْ غَیْرِ مَوْضِعِهٖ ظُلْمٌ"[2] "کسی بھی چیز کو بے جگہ استعمال کرنا ظلم ہے" چوں کہ کسی چیز کا بے محل استعمال یقیناً کسی نہ کسی کو تکلیف پہنچانے کا موجب ہوتا ہے، اس لئے ہر ایسا استعمال "ظلم" کی تعریف میں داخل ہے، اور اگر اس سے کسی انسان کو تکلیف پہنچی ہے تو وہ شرعی اعتبار سے گناہِ کبیرہ بھی ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں اس طرح کے بہت سے گناہِ کبیرہ اس طرح رواج پا گئے ہیں کہ اب عام طور سے اُن کے گناہ ہونے کا احساس بھی باقی نہیں رہا۔

اب ہم اُن اسباب کو ذکر کریں گے جن کے ذریعے سے کسی بھی انسان کو تکلیف ہو سکتی ہے لہٰذا جتنا ممکن ہو سکے ان سے بچا جائے تا کہ مسلمان کو تکلیف دینے کے گناہ سے بچا جا سکے۔

---

[1] ذکر و فکر: ص۲۱ تا ۲۳

[2] کتاب التعریفات، باب الظاء: ص۱۰۲

۱ تکلیف کا پہلا سبب: لاؤڈ اسپیکر کا غلط استعمال

"ایذا رسانی" کی ان بے شمار صورتوں میں سے ایک انتہائی تکلیف دہ صورت لاؤڈ اسپیکر کا ظالمانہ استعمال ہے۔

لاؤڈ اسپیکر کو اگر صحیح استعمال کیا جائے تو باعثِ ثواب ہے لیکن اگر اسے اپنے مقاصد سے ہٹ کر استعمال کیا جائے تو باعثِ عذاب اور مخلوقِ خدا کی تکلیف کا ذریعہ ہے مثلاً اذان، نماز اور دیگر ضرورت کے مواقع پر لاؤڈ اسپیکر کا استعمال اس کے مقاصد میں سے ہے اور اس کا بے جا استعمال بغیر ضرورت کے اونچی آواز میں نعتیں، اور دیگر نظمیں وغیرہ مخلوقِ خدا کی تکلیف کا باعث ہیں۔

ابھی چند روز پہلے ایک انگریزی روزنامے میں ایک صاحب نے شکایت کی ہے کہ بعض شادی ہالوں میں رات تین بجے تک لاؤڈ اسپیکر پر گانے بجانے کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اور آس پاس کے بسنے والے بے چینی کے عالم میں کروٹیں بدلتے رہتے ہیں، اور ایک شادی ہال پر کیا موقوف ہے ہر جگہ دیکھنے میں یہی آتا ہے کہ جب کوئی شخص کہیں لاؤڈ اسپیکر نصب کرتا ہے تو اُسے اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ اس کی آواز کو صرف ضرورت کی حد تک محدود رکھا جائے، اور آس پاس کے اُن ضعیفوں اور بیماروں پر رحم کیا جائے جو یہ آواز سننا نہیں چاہتے۔

گانے بجانے کا معاملہ تو الگ رہا، کہ اُس کو بلند آواز سے پھیلانے میں دُہری برائی ہے، اگر کوئی خالص دینی اور مذہبی پروگرام ہو تو اُس میں بھی لوگوں کو لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے زبردستی شریک کرنا شرعی اعتبار سے ہرگز جائز نہیں ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہمارے معاشرے میں سیاسی اور مذہبی پروگرام منعقد کرنے والے حضرات بھی شریعت کے اس اہم حکم کا بالکل خیال نہیں کرتے۔ سیاسی اور مذہبی جلسوں کے لاؤڈ اسپیکر بھی دور دور تک مار کرتے ہیں اور اُن کی موجودگی میں کوئی شخص اپنے گھر

میں نہ آرام سے سو سکتا ہے، نہ یکسوئی کے ساتھ اپنا کوئی کام کر سکتا ہے۔

لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اذان کی آواز دور تک پہنچانا تو برحق ہے، لیکن مسجدوں میں جو وعظ اور تقریریں یا ذکر و تلاوت لاؤڈ اسپیکر پر ہوتی ہیں، اُن کی آواز دور دور تک پہنچانے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ مسجد میں بہت تھوڑے سے لوگ وعظ یا درس سننے کے لئے بیٹھے ہیں جن کو آواز پہنچانے کے لئے لاؤڈ اسپیکر کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے، یا صرف اندرونی اسپیکر سے بآسانی کام چل سکتا ہے، لیکن بیرونی لاؤڈ اسپیکر پوری قوت سے کھلا ہوتا ہے، اور اس کے نتیجے میں یہ آواز محلے کے گھر گھر میں اس طرح پہنچتی ہے کہ کوئی شخص اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں: ”مجھے یاد ہے کہ میں ایک مرتبہ لاہور گیا، جس مکان میں میرا قیام تھا، اُس کے تین طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے سے تین مسجدیں تھیں، جمعہ کا دن تھا، فجر کی نماز کے فوراً بعد سے تینوں مسجدوں کے لاؤڈ اسپیکر پوری قوت سے کھل گئے، اور پہلے درس شروع ہوا، پھر بچوں نے تلاوت شروع کر دی، پھر نظمیں اور نعتیں پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوا، یہاں تک کہ فجر کے وقت سے جمعہ تک یہ ”مذہبی پروگرام“ اس طرح بے تکان جاری رہے کہ گھر میں کسی کو کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس گھر میں اُس وقت کوئی بیمار نہیں تھا، لیکن میں سوچ رہا تھا کہ اگر خدانخواستہ کوئی شخص بیمار ہو تو اُس کو سکون کے ساتھ لٹانے کا اس ماحول میں کوئی راستہ نہیں۔“

بعض مسجدوں کے بارے میں یہ سننے میں آیا ہے کہ وہاں خالی مسجد میں لاؤڈ اسپیکر پر ٹیپ چلا دیا جاتا ہے، مسجد میں سننے والا کوئی نہیں ہوتا، لیکن پورے محلے کو یہ ٹیپ زبردستی سننا پڑتا ہے۔

دین کی صحیح فہم رکھنے والے اہل علم خواہ کسی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہوں، کبھی

یہ کام نہیں کر سکتے، لیکن ایسا اُن مسجدوں میں ہوتا ہے جہاں کا انتظام علم دین سے ناواقف حضرات کے ہاتھ میں ہے۔ بسا اوقات یہ حضرات پوری نیک نیتی سے یہ کام کرتے ہیں، وہ اسے دین کی تبلیغ کا ایک ذریعہ سمجھتے اور اسے دین کی خدمت قرار دیتے ہیں۔ لیکن ہمارے معاشرے میں یہ اصول بھی بہت غلط مشہور ہوگیا ہے کہ نیت کی اچھائی سے کوئی غلط کام بھی جائز اور صحیح ہو جاتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ کسی کام کے درست ہونے کے لئے صرف نیک نیتی ہی کافی نہیں، اس کا طریقہ بھی درست ہونا ضروری ہے۔ اور لاؤڈ اسپیکر کا ایسا ظالمانہ استعمال نہ صرف یہ کہ دعوت و تبلیغ کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے، بل کہ اس کے اُلٹے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

جن حضرات کو اس سلسلے میں کوئی غلط فہمی ہو، اُن کی خدمت میں دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ چند نکات ذیل میں پیش کرتا ہوں:

❶ مشہور محدث حضرت عمر بن شبہ رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے مدینہ منورہ کی تاریخ پر چار جلدوں میں بڑی مفصل کتاب لکھی ہے جس کا حوالہ بڑے بڑے علماء محدثین ہمیشہ دیتے رہے ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے ایک واقعہ اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ ایک واعظ صاحب حضرت عائشہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہَا کے مکان کے بالکل سامنے بہت بلند آواز سے وعظ کہا کرتے تھے، ظاہر ہے کہ وہ زمانہ لاؤڈ اسپیکر کا نہیں تھا، لیکن اُن کی آواز بہت بلند تھی، اور اس سے حضرت عائشہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہَا کی یکسوئی میں فرق آتا تھا، یہ حضرت فاروق اعظم رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کی خلافت کا زمانہ تھا، اس لئے حضرت عائشہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہَا نے حضرت عمر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے شکایت کی کہ یہ صاحب بلند آواز سے میرے گھر کے سامنے وعظ کہتے رہتے ہیں، جس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے، اور مجھے کسی اور کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ حضرت عمر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے اُن صاحب کو پیغام بھیج کر انہیں وہاں وعظ کہنے سے منع کیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد واعظ صاحب نے دوبارہ وہی سلسلہ شروع کر دیا۔ حضرت عمر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کو

اطلاع ہوئی تو انہوں نے خود جا کر اُن صاحب کو پکڑا، اور اُن پر تعزیری سزا جاری کی۔[1]

بات صرف یہ نہیں تھی کہ حضرت عائشہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہَا اپنی تکلیف کا ازالہ کرنا چاہتی تھیں، بل کہ دراصل وہ اسلامی معاشرت کے اصول کو واضح اور نافذ کرنا چاہتی تھیں کہ کسی کو کسی سے کوئی تکلیف نہ پہنچے، نیز یہ بتانا چاہتی تھیں کہ دین کی دعوت و تبلیغ کا پُروقار طریقہ کیا ہے؟

چناں چہ امام احمد رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے اپنی مسند میں روایت نقل کی ہے: ایک مرتبہ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہَا نے مدینہ منورہ کے ایک واعظ کو وعظ و تبلیغ کے آداب تفصیل کے ساتھ بتائے اور ان آداب میں یہ بھی فرمایا:

"اپنی آواز کو انہی لوگوں کی حد تک محدود رکھو جو تمہاری مجلس میں بیٹھے ہیں، اور انہیں بھی اُسی وقت تک دین کی باتیں سناؤ جب تک ان کے چہرے تمہاری طرف متوجہ ہوں، جب وہ چہرے پھیر لیں، تو تم بھی رک جاؤ..... اور ایسا بھی نہ ہونا چاہئے کہ لوگ آپس میں باتیں کر رہے ہوں اور تم ان کی بات کاٹ کر اپنی بات شروع کر دو، بل کہ ایسے موقعہ پر خاموش رہو، پھر جب وہ تم سے فرمائش کریں تو انہیں دین کی بات سناؤ۔"[2]

۲ حضرت عطاء بن ابی رباح رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی بڑے اونچے درجے کے تابعین میں سے ہیں، علم تفسیر و حدیث میں ان کا مقام مسلّم ہے، ان کا مقولہ ہے:

"عالم کو چاہئے کہ اس کی آواز اس کی اپنی مجلس سے آگے نہ بڑھے۔"[3]

۱ اخبار المدینہ لعمر بن شبہ: ۱/۱۵
۲ مجمع الزوائد: ۱/۱۹۱
۳ ادب الاملاء والاستملاء للسمعانی: ص ۵

۳ یہ سارے آداب درحقیقت خود حضور سرورِ کونین صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے اپنے قول و فعل سے تعلیم فرمائے ہیں۔ مشہور واقعہ ہے کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حضرت فاروقِ اعظم رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کے پاس سے گزرے، وہ تہجد کی نماز میں بلند آواز سے تلاوت کر رہے تھے۔

آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ان سے پوچھا کہ وہ بلند آواز سے کیوں تلاوت کرتے ہیں؟ حضرت عمر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے جواب دیا: "میں سوتے کو جگاتا ہوں، اور شیطان کو بھگاتا ہوں" آں حضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: "اپنی آواز کو تھوڑا پست کر دو۔"[1]

۴ انہی احادیث و آثار کی روشنی میں تمام فقہاء امت رَحِمَہُمُ اللّٰہُ تَعَالٰی اس بات پر متفق ہیں کہ تہجد کی نماز میں اتنی بلند آواز سے تلاوت کرنا جس سے کسی کی نیند خراب ہو، ہرگز جائز نہیں۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے گھر کی چھت پر بلند آواز سے تلاوت کرے جب کہ لوگ سو رہے ہوں تو تلاوت کرنے والا گناہ گار ہے۔[2]

ایک مرتبہ ایک صاحب نے یہ سوال ایک استفتاء کی صورت میں مرتب کیا تھا کہ بعض مساجد میں تراویح کی قرأت لاؤڈ اسپیکر پر اتنی بلند آواز سے کی جاتی ہے کہ اس سے محلے کی خواتین کے لئے گھروں میں نماز پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے، نیز جن مریضوں اور کمزور لوگوں کو علاجاً جلدی سونا ضروری ہو وہ سو نہیں سکتے، اس کے علاوہ باہر کے لوگ قرآنِ کریم کی تلاوت ادب سے سننے پر قادر نہیں ہوتے۔ اور بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ تلاوت کے دوران کوئی سجدے کی آیت آ جاتی ہے، سننے والوں پر سجدہ واجب ہو جاتا ہے، اور یا تو ان کو پتہ ہی نہیں چلتا، یا وہ وضو سے نہیں ہوتے، اس لئے سجدہ نہیں کر سکتے، اور بعد میں بھول ہو جاتی ہے۔ کیا ان حالات

۱ ترمذی، باب ماجاء فی القراءۃ باللیل: ۱/۱۰۰
۲ خلاصۃ الفتاوی: ۱/۱۰۳، شامی: ۱/۴۰۳ تا ۴۴۴

میں تراویح کے دوران بیرونی لاؤڈ اسپیکر زور سے کھولنا شرعاً جائز ہے؟

یہ سوال مختلف علماء کے پاس بھیجا گیا، اور سب نے متفقہ جواب یہی دیا کہ ان حالات میں تراویح کی تلاوت میں بیرونی لاؤڈ اسپیکر بلا ضرورت زور سے کھولنا شرعاً جائز نہیں ہے، یہ فتویٰ ماہنامہ ''البلاغ'' کی محرم ۱۴۰۷ھ کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ کوئی اختلافی مسئلہ نہیں ہے، اس پر تمام مکاتبِ فکر کے علماء متفق ہیں۔

رمضان کا مہینہ عبادات اور برکات کا مہینہ ہے، یہ مہینہ ہم سے شرعی احکام کی سختی کے ساتھ پابندی کا مطالبہ کرتا ہے، یہ عبادتوں کا مہینہ ہے، اور اس میں نماز، تلاوت اور ذکر جتنا بھی ہو سکے، باعثِ فضیلت ہے۔ لیکن ہمیں چاہئے کہ یہ ساری عبادتیں اس طرح انجام دیں کہ اُن سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے، اور ناجائز طریقوں کی بدولت ان عبادتوں کا ثواب ضائع نہ ہو۔ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال صرف بوقتِ ضرورت اور بقدرِ ضرورت کیا جائے، اس سے آگے نہیں۔

مذکورہ بالا گزارشات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شریعت نے دوسروں کو تکلیف سے بچانے کا کتنا اہتمام کیا ہے؟ جب قرآن کریم کی تلاوت اور وعظ نصیحت جیسے مقدس کاموں کے بارے میں بھی شریعت کی ہدایت یہ ہے کہ ان کی آواز ضرورت کے مقامات سے آگے نہیں بڑھنی چاہئے، تو گانے بجانے اور دوسری لغویات کے بارے میں خود اندازہ کر لیجئے کہ ان کو لاؤڈ اسپیکر پر انجام دینے کا کس قدر دہرا وبال ہے؟[1]

۲ تکلیف کا دوسرا سبب: ناجائز تجاوزات

اسی طرح سرکاری زمینوں پر تجاوزات اسی قسم کی غاصبانہ کاروائی ہے جس کا

[1] ذکر و فکر: ص۲۱ تا ۲۹

تعلق حقوق العباد کے اس سنگین شعبے سے ہے، ہمارے علماء نے فقہ کی کتابوں میں اس مسئلے پر بحث کی ہے کہ جس شخص کا مکان سڑک کے کنارے واقع ہو، وہ اپنی کھڑکی پر سائبان لگا سکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر لگا سکتا ہے تو زیادہ سے زیادہ کتنا لمبا چوڑا؟ حالاں کہ سائبان لگانے سے زمین کے کسی حصے پر قبضہ نہیں ہوتا، بل کہ فضا کا بہت تھوڑا سا حصہ استعمال ہوتا ہے۔

نیز یہ مسئلہ بھی فقہاء کے یہاں زیر بحث آیا ہے کہ جس شخص نے عام لوگوں کی گزرگاہ پر راستہ روک کر دکان لگائی ہو اس سے کوئی چیز خریدنا جائز ہے یا نہیں؟ بعض فقہاء کہتے ہیں کہ اس شخص نے چوں کہ عوام کا حق غصب کر رکھا ہے لہٰذا اس سے سودا خریدنا اس کی غاصبانہ کارروائی میں تعاون ہے، اس لئے اس سے کوئی چیز خریدنا جائز نہیں، بعض دوسرے فقہاء اگرچہ اس حد تک نہیں گئے، لیکن انہوں نے یہ کہا کہ اگر یہ امید ہو کہ سودا نہ خریدنے سے اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوگا اور وہ اپنی اس حرکت سے باز آجائے گا تو اس سے واقعی سودا خریدنا نہ چاہئے، اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلامی قانون تجاوزات کے بارے میں کتنا حساس ہے؟

ہمارے معاشرے میں تجاوزات کوئی قابلِ ذکر عیب ہی نہیں رہے، جس کا جی چاہتا ہے وہ اپنے مکان یا دکان کے گرد یا پوری سرکاری زمین پر قبضہ جما کر بیٹھ جاتا ہے، بل کہ ہمارے گرد و پیش میں جس طرح یہ تجاوزات پھیلے ہوئے ہیں ان میں ایک نہیں کئی کئی گناہ بیک وقت جمع ہیں۔

(۱) عوامی زمین پر ناجائز قبضہ ہی بڑا سنگین گناہ ہے۔

(۲) دوسرے عموماً ان تجاوزات سے راستہ چلنے والوں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے، اور راہ گیروں کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرنا ایک مستقل گناہ ہے، جس پر حدیث میں سخت وعید آئی ہے۔

(۳) ہمارے ماحول میں یہ تجاوزات رشوت خوری کے فروغ کا بہت بڑا ذریعہ بنی

ہوئی ہیں کیوں کہ انہیں باقی رکھنے کے لئے متعلقہ اہلکار کو "بھتہ" دینا پڑتا ہے، اور یہ بھتہ ایک مرتبہ دینا کافی نہیں ہوتا، بل کہ ہفتہ وار یا ماہانہ تنخواہ کی طرح اس کی ادائیگی ضروری ہوتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے اہلکار دل سے یہی چاہتے ہیں اور اس کی پوری کوشش بھی کرتے ہیں کہ یہ تجاوزات ختم نہ ہوں، تا کہ ان کی "آمدنی" کا یہ ذریعہ بند نہ ہونے پائے، لہٰذا ان کو اپنے فرائض سے غافل کرنے بل کہ فرائض کے برعکس کام کرنے کا گناہ بھی اس میں شامل ہو تو بعید نہیں۔

۳ تکلیف کا تیسرا سبب: گزرگاہوں میں رُکاوٹ ڈالنا

اس طرح ہمارے ملک میں یہ بھی عام رواج ہو گیا ہے کہ جلسوں اور تقریبات کے لئے چلتی ہوئی سڑک روک کر شامیانے اور قناتیں لگالی جاتی ہیں، اور اس کے نتیجے میں آنے جانے والی گاڑیوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور ٹریفک کے نظام میں بعض اوقات شدید خلل واقع ہو جاتا ہے، یہ بات ہر مسلمان جانتا ہے کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو تو اس کے سامنے سے گزرنا جائز نہیں۔

احادیث میں اس بات کی سخت تاکید کی گئی ہے کہ کوئی بھی شخص کسی نمازی کے سامنے سے نہ گزرے،[1] لیکن ساتھ ہی شریعت نے نماز پڑھنے والے کو یہ بھی ہدایت کی ہے کہ وہ ایسی جگہ نماز پڑھنا شروع نہ کرے جہاں لوگوں کو گزرنے میں دشواری ہو، مثلاً مسجد کا صحن اگر کھلا ہوا ہے تو صحن کے بیچوں بیچ یا اس کے آخری سرے پر نماز کے لئے کھڑے ہو جانا اس صورت میں جائز نہیں جب سامنے لوگوں کے گزرنے کی جگہ ہو اور نماز شروع کرنے کی وجہ سے انہیں لمبا چکر کاٹ کر جانا پڑتا ہو۔

لہٰذا حکم یہ دیا گیا ہے کہ ایسی جگہ نماز پڑھو جہاں یا تو سامنے کوئی ستون وغیرہ ہو[2] جس کے پیچھے سے لوگ گزر سکیں یا سامنے نماز ہی کی صفیں ہوں۔ اگر کوئی شخص

[1] ترمذی، باب ماجاء فی کراھیة المرور بین المصلی: ۷۹/۱
[2] ترمذی، باب ماجاء فی سترة المصلی: ۷۸/۱

اس ہدایت کا خیال نہ رکھے اور صحن کے بیچوں بیچ نماز پڑھنے کھڑا ہو جائے تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ ایسی صورت میں کوئی شخص نمازی کے سامنے سے گزرنے پر مجبور ہو جائے تو اس کے گزرنے کا گناہ نماز پڑھنے والے پر ہوگا سامنے سے گزرنے والے پر نہیں۔

غور فرمایئے کہ مسجدیں عموماً بہت بڑی نہیں ہوتیں، اور اگر کسی شخص کو چکر کاٹ کر نکلنا پڑے تو اس کے ایک دو منٹ سے زیادہ خرچ نہیں ہوتے، لیکن شریعت نے اس ایک دو منٹ کی تکلیف یا تاخیر کو بھی گوارا نہیں کیا، اور نمازی کو تاکید فرمائی ہے کہ وہ لوگوں کو اس معمولی تکلیف سے بھی بچائے، ورنہ گناہ گار وہ خود ہوگا۔

ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے آپ کو اس سے کچھ کام ہے۔ اب آپ اس کے بالکل قریب جا کر بیٹھ گئے۔ اور اس کے ذہن پر یہ فکر سوار کر دی کہ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ تم جلدی سے اپنی نماز پوری کرو تا کہ میں تم سے ملاقات کروں۔ اور کام کراؤں۔ چناں چہ آپ کے قریب بیٹھنے کی وجہ سے اس کی نماز میں خلل واقع ہو گیا۔ اور اس کے دماغ پر یہ بوجھ بیٹھ گیا کہ یہ شخص میرے انتظار میں ہے، اس کا انتظار ختم کرنا چاہئے۔ اور جلدی سے نماز ختم کر کے اس سے ملاقات کرنی چاہئے۔ حالاں کہ یہ بات آداب میں داخل ہے کہ اگر آپ کو کسی ایسے شخص سے ملاقات کرنی ہے جو اس وقت نماز میں مصروف ہے تو تم دور بیٹھ کر اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرو، جب وہ خود سے فارغ ہو جائے تو پھر ملاقات کرو۔ لیکن اس کے بالکل قریب بیٹھ کر یہ تاثر دینا کہ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ لہٰذا تم نماز جلدی پوری کرو۔ ایسا تاثر دینا ادب کے خلاف ہے۔ اس سے نمازی کو ذہنی طور پر بھی تکلیف ہوگی۔[1]

جب شریعت کو یہ بھی گوارا نہیں کہ کوئی شخص ہماری وجہ سے اس معمولی تکلیف میں مبتلا ہو تو سڑک کو بالکل بند کر کے لوگوں کو دور کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کرنا

[1] اصلاحی خطبات: ۱۳۲/۸

کس طرح جائز ہوسکتا ہے؟

بالخصوص آج کی مصروف زندگی میں اگر کسی شخص کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے میں چند منٹ کی تاخیر بھی ہو جائے تو بعض اوقات اس کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جاتا ہے، کسی بیمار کو اسپتال پہنچانا ہو یا کسی بیمار کے لئے دوا لے جانی ہو یا کوئی مسافر ریلوے اسٹیشن یا ہوائی اڈے پہنچنا چاہتا ہو، اور ہمارے جلسے یا تقریب کی وجہ سے اسے پانچ یا دس منٹ کی تاخیر ہو جائے تو کہنے کو یہ تاخیر پانچ دس منٹ کی ہے، لیکن اس تاخیر کے نتیجے میں بیمار رخصت بھی ہوسکتا ہے مسافر اپنے سفر سے بالکلیہ محروم بھی ہوسکتا ہے۔

جن جن لوگوں کو اس طرح کا نقصان پہنچا ہو ہمیں نہ ان کا نام معلوم ہے نہ پتہ اور نہ نقصان کی نوعیت، لہٰذا اگر اس گناہ کی تلافی کرنا بھی چاہیں تو اس کا کوئی راستہ اختیار میں نہیں اس طرح کے جلسے جلوسوں کا شرعی جواز بھی مشکوک معلوم ہوتا ہے جو گھنٹوں کے لئے آمد و رفت کا نظام درہم برہم کر کے عام لوگوں کو ناقابل بیان اذیتوں میں مبتلا کر دیتے ہیں، کیوں کہ یہ ساری خرابیاں ان میں بھی بہ درجہ اتم موجود ہیں۔

۴ تکلیف کا چوتھا سبب: شاہراہوں پر کھیلنا

یہ مناظر بھی بکثرت دیکھنے میں آتے ہیں کہ سڑکوں کو کرکٹ کا میدان بنا لیا جاتا ہے، اور سڑک کے بیچوں بیچ وکٹ یا وکٹ نما کوئی چیز نصب کر کے باقاعدہ کھیل شروع ہو جاتا ہے، آس پاس کی ہر کھڑی یا چلتی ہوئی گاڑی بیٹسمین کے چوکوں کی زد میں ہوتی ہے، اور گیند کے پیچھے دوڑتے ہوئے فیلڈر آنے جانے والی گاڑی کی زد میں، یہ منظر گلیوں اور چھوٹی سڑکوں پر تو نظر آتا ہی رہتا ہے، لیکن کچھ عرصہ سے یہ دیکھا گیا ہے کہ مین روڈ پر باقاعدہ میچ ہوتے ہیں جہاں عام طور سے گاڑیاں ساٹھ

سے کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑتی ہیں، یہ عوامی سڑک کا سراسر ناجائز استعمال تو ہے ہی خود کھیلنے والوں کے لحاظ سے بھی اقدام خودکشی سے کم نہیں، گیند کے پیچھے دوڑنے والے کے تمام تر ہوش و حواس گیند پر مرکوز ہوتے ہیں، اور وہ یکا یک پیش آجانے والی کسی صورت حال کی وجہ سے اپنے جسم کو کنٹرول کرنے پر قادر نہیں ہوتا، لہٰذا اچانک کوئی گاڑی سامنے آجائے تو کوئی بھی حادثہ پیش آسکتا ہے، اور اس قسم کے حادثات پیش آبھی چکے ہیں، اور جب اس کھیل کے نتیجے میں جانیں تک چلی گئی ہیں تو گاڑیاں اور ان کے شیشے ٹوٹنے کا کیا شمار؟

اس صورت حال کی ذمہ داری ان نوعمر کھیلنے والوں سے زیادہ ان کے والدین، سرپرستوں اور ان سرکاری کارندوں پر عائد ہوتی ہے جو انہیں اس خطرناک کھیل میں مصروف دیکھتے ہیں، اور اس سے باز رکھنے کی کوشش نہیں کرتے، دوسری طرف بڑے شہروں میں کھیل کے میدانوں کی کمی بھی اس صورت حال کا سبب ہے جس کی طرف حکومت کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

۵ تکلیف کا پانچواں سبب: غلط پارکنگ

سڑکوں پر بے جگہ گاڑیوں کی پارکنگ بھی ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں ہم انتہائی بے حسی کا شکار ہیں۔ چھوٹی گاڑیاں تو ایک طرف رہیں بڑی بڑی ویگنیں اور بسیں بھی ایسی جگہ کھڑی کر دی جاتی ہیں کہ آنے جانے والوں کا راستہ بند ہو جاتا ہے، یا گزرنے والوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، چوں کہ ہم نے دین کو صرف نماز روزے ہی کی حد تک محدود کر رکھا ہے، اس لئے یہ عمل کرتے وقت کسی کو یہ دھیان نہیں آتا کہ ایسا کرنے والا محض بے قاعدگی کا نہیں بل کہ ایک ایسے بڑے گناہوں کا مرتکب ہو رہا ہے جس کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔

(۱) تو جس جگہ پارکنگ ممنوع ہے اس جگہ گاڑی کھڑی کر دینا اس عوامی جگہ کا

ناجائز استعمال ہے، جو غصب کے گناہ میں داخل ہے۔

(۲) حاکم کے ایک جائز حکم کی خلاف ورزی ہے۔

(۳) اس بے قاعدگی کے نتیجے میں جس جس شخص کو تکلیف پہنچے گی، اسے تکلیف پہنچانے کا گناہ الگ ہے اس طرح یہ عمل جو غفلت اور بے دھیانی کے عالم میں روز مرہ ہوتا ہے، بیک وقت کئی گناہوں کا مجموعہ ہے، جن پر دنیا میں چالان ہو یا نہ ہو، آخرت میں ضرور باز پرس ہوگی۔

اسی طرح بعض جگہ پارکنگ قانوناً ممنوع نہیں ہوتی، لیکن گاڑی اس انداز سے کھڑی کر دی جاتی ہے کہ آگے پیچھے کی گاڑیاں سرک نہیں سکتیں، یا گزرنے والوں کو کوئی اور تکلیف پیش آتی ہے، یہ عمل بھی دینی اعتبار سے سراسر ناجائز اور گناہ ہے۔

ہماری فقہ کی قدیم کتابیں اس زمانے میں لکھی گئی ہیں جب خود کار گاڑیوں (آٹوموبائلز) کا رواج نہیں تھا، اور سفر کے لئے عموماً جانور استعمال ہوتے تھے، اس لئے ٹریفک کا نظام اتنا پیچیدہ نہیں تھا جتنا آج ہے، اس کے باوجود ہمارے فقہائے کرام نے سڑکوں پر چلنے اور گاڑیوں کے ٹھہرانے کے بارے میں شرعی احکام کی تفصیل نہایت آسان تشریح کے ساتھ بیان کی ہے، اور اس سے اسلامی تعلیمات کی ہمہ گیری کا بھی اندازہ ہوتا ہے، اور اس بات کا بھی کہ اسلام میں نظم وضبط اور حقوق العباد کی کتنی اہمیت ہے؟

اس کا تقاضا یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان ہمارا نظم وضبط اور ہماری تہذیب وشائستگی مثالی ہو، لیکن افسوس ہے کہ اپنی غفلت اور بے دھیانی کی وجہ سے ہم اس قسم کے بے شمار گناہ روزانہ اپنے نامۂ اعمال میں شامل کر کے اپنی آخرت بھی خراب کر رہے ہیں، اور دنیا بھر کو اپنے بارے میں وہ تاثر بھی دے رہے ہیں جو نہ صرف ہم سے نفرت کا باعث بنتا ہے بل کہ اسلام کی چمکتی ہوئی تعلیمات پر ہماری بدعملی کا نقاب ڈال دیتا

ہے جس کی وجہ سے وہ دین کا صحیح حسن دیکھنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔[1]

حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں: آج سے تقریباً پندرہ سال پہلے جب میں پہلی بار جنوبی افریقہ گیا تو کسی جدید ترقی یافتہ ملک کی طرف وہ میرا پہلا سفر تھا، اب تو جنوبی افریقہ پرامن طور پر آزاد ہو چکا ہے، اور وہاں نسلی امتیاز کی پالیسی ایک قصۂ پارینہ بن چکی ہے، لیکن ان دنوں وہاں سفید فام ڈچ حکمرانوں کا راج تھا، اور نسلی امتیاز کے قوانین پوری آب وتاب پر تھے، چناں چہ بڑے شہروں میں مستقل رہائش کا حق صرف گوروں کو حاصل تھا، دوسری نسلوں کے لوگوں کے لئے الگ الگ آبادیاں قائم تھیں، جو ان بڑے شہروں سے کافی فاصلے پر واقع تھیں، جوہانسبرگ سے تقریباً تیس میل دور ایک ایسی ہی خوب صورت آبادی "آزادویل" کے نام سے بسائی گئی تھی جو تمام تر ہندوستانی نسل کے باشندوں کے لئے مخصوص تھی، ہمارے میزبان چوں کہ اسی آبادی میں رہتے تھے، اس لئے ہمارا قیام بھی وہیں ہوا، یہ بڑی پرفضا بستی تھی، جو زیادہ تر رہائشی مکانات پر مشتمل تھی۔ تھوڑی آبادی کے لئے اگر ایک وسیع رقبے پر منصوبہ بندی کے ساتھ مکانات بنائے جائیں تو ظاہر ہے کہ بستی میں کشادگی کا احساس ہوگا، یہی صورت یہاں بھی تھی کہ یہ بستی بہت خوبصورت لگتی تھی، کھلی کھلی، پرسکون، اور حد درجہ صاف ستھری۔ یہاں کے مکینوں میں سے تقریباً ہر شخص کے پاس اپنی اپنی کار تھی، لیکن سڑکوں پر ہجوم کا سوال ہی نہیں تھا، پیدل چلنے والے بہت کم تھے۔

سڑک پر اکا دکا چلنے والے نظر آجاتے، اور وہ بھی زیادہ تر فٹ پاتھ پر، ورنہ سڑکیں زیادہ تر سنسان پڑی رہتی تھیں، لیکن ان سنسان سڑکوں پر بھی ہر چھوٹے سے چھوٹے موڑ کے کنارے زمین پر ایک سیاہ لائن کھینچی نظر آتی تھی، اور بعض مقامات پر موڑ کے بغیر بھی، میں نے کار میں سفر کرتے ہوئے دیکھا کہ کار چلانے والا اس

[1] ذکر وفکر: ص ۱۲۳ تا ۱۳۸

لائن پر پہنچ کر چند لمحوں کے لئے رکتا، اور دائیں بائیں دیکھنے کے بعد پھر آگے بڑھتا، میرے لئے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ سڑک دور دور تک سنسان پڑی ہے، اور کسی آنے جانے والا کا نام ونشان نہیں ہے، اس کے باوجود ڈرائیور خواہ کتنی جلدی میں ہو، یا باتوں میں کتنا مشغول ہو، اس لکیر پر پہنچ کر رکتا ضرور ہے، اور اس کی گردن خود بخود دائیں بائیں اس طرح مڑ جاتی ہے جیسے کوئی خود کار مشین کسی ریموٹ کنٹرول کے ذریعے مڑ رہی ہو۔

پہلی پہلی بار میں یہ سمجھا کہ ڈرائیو کرنے والے کو اچانک کوئی شبہ ہو گیا جس کی وجہ سے اس نے گاڑی روکی، لیکن جب بار بار یہی منظر نظر آیا تو میں نے لوگوں سے اس کی وجہ پوچھی، انہوں نے بتایا کہ ہمارے ملک میں یہ ٹریفک کا قاعدہ ہے کہ ہر موڑ پر جہاں زمین پر یہ لائن کھینچی ہوئی ہوگی، گاڑی کو روک کر دائیں بائیں دیکھنا ڈرائیور کے ذمے لازم ہے، اب ہمیں اس قاعدے پر عمل کرنے کی ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ کوئی موڑ دیکھ کر یا زمین پر کھینچی ہوئی یہ لکیر دیکھ کر پاؤں بے ساختہ بریک پر پہنچ جاتے ہیں اور گاڑی کے رکتے ہی گردن دائیں بائیں مڑ جاتی ہے۔

اس کے بعد جتنے دن وہاں میرا قیام رہا، میں روزانہ بار بار یہ منظر دیکھتا رہا، کوئی ایک شخص بھی مجھے ایسا نہیں ملا جس نے اس قاعدے کی خلاف ورزی کی ہو، مجھے اپنی قیام گاہ سے مین روڈ تک روزانہ کئی بار جانا پڑتا، اور ہر بار میں یہ دیکھتا کہ کار ڈرائیو کرنے والا مین روڈ پر پہنچنے سے پہلے کئی مرتبہ ان سنسان سڑکوں پر رکتا تھا، حالاں کہ مجھے اس پورے عرصے میں ٹریفک پولیس کا کوئی سپاہی ان سڑکوں پر نظر نہیں آیا جو لوگوں سے اس قاعدے کی پابندی کرا رہا ہو، نہ ہمارے ملک کی طرح ایسے سپیڈ بریکر نظر آئے جنہیں کار بریکر کہنا زیادہ مناسب ہے۔

یہ نظارہ پہلی بار جنوبی افریقہ میں دیکھا تھا، اور اس لئے اچنبھا (عجیب سا) معلوم ہوا تھا کہ آنکھیں پاکستان کی آزاد اور بے مہار ٹریفک دیکھنے کی عادی تھیں،

بعد میں یہ منظر مشرق و مغرب کے بہت سے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی دیکھا، یہاں تک کہ اب نگاہیں اس کی بھی عادی ہو گئیں، لیکن جب اپنے ملک میں ٹریفک کا حال دیکھو تو وہ نہ صرف وہیں کا وہیں ہے، بل کہ ایسا لگتا ہے کہ الٹی سمت میں سفر کر رہا ہے، تفصیل بیان کرنے کی ضرورت اس لئے نہیں کہ وہ ہر شخص کے سامنے ہے۔

اس صورتِ حال کا سبب سرکاری انتظام کا ڈھیلا پن اور تعلیم و تربیت کا فقدان تو ہے ہی، لیکن ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہم نے زندگی کے ان روزمرہ کے مسائل کو دین سے باہر کی چیز سمجھ رکھا ہے، اور یہ بات ذہن میں بٹھا رکھی ہے کہ دین اور اسلام کا تعلق تو صرف مسجد اور مدرسے سے ہے، دنیوی کاروبار اور اس سلسلے کے تمام امور دین کی گرفت سے (معاذ اللہ) باہر ہیں، لہٰذا ٹریفک کے مسائل کا دین سے کیا واسطہ؟ اس غلط سوچ کا نتیجہ یہ ہے کہ ٹریفک کے قواعد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی کو یہ خیال نہیں آتا کہ وہ کسی گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے۔

بل کہ اب تو قاعدوں کو توڑنا ایک بہادری کی علامت بن گئی ہے، جو شخص جتنے قاعدہ توڑے اتنا ہی وہ اپنے آپ کو بہادر اور جیالا سمجھتا ہے، اور اسی غلط سوچ کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ اچھے بھلے دین دار لوگ جو نماز روزے کے پابند ہیں، اور مجموعی اعتبار سے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی فکر بھی رکھتے ہیں، ٹریفک کے قواعد کی دھڑلے سے خلاف ورزی کرتے ہیں، اور نہ ان کے ضمیر پر کوئی بوجھ ہوتا ہے، نہ اس طرزِ عمل کو غلط یا گناہ سمجھتے ہیں، چناں چہ غلط جگہ پر گاڑی کھڑی کر دینا، مقررہ رفتار سے زیادہ تیز گاڑی چلانا، غلط سمت میں سفر کرنا، رکنے کے سرخ اشارے کو توڑ دینا جہاں اوور ٹیکنگ ممنوع ہے وہاں گاڑیوں کی باقاعدہ ریس لگانا، روزمرہ کا کھیل بن کر رہ گیا ہے۔

حالاں کہ یہ سارے کام صرف بے قاعدگی کے زمرے ہی میں نہیں آتے، بل کہ دینی اعتبار سے بہت سے گناہوں کا مجموعہ بھی ہیں۔

① پہلا گناہ: تو اس لئے کہ ٹریفک کے تمام قواعد دراصل تمام انسانوں کی مصلحت کے تحت بنائے گئے ہیں، اور جو قوانین حکومت کی طرف سے عمومی مصلحت کے لئے بنائے جائیں، ان کی پابندی شرعی اعتبار سے بھی واجب ہے، اور ان کی خلاف ورزی ناجائز، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ۚ﴾ [1]

ترجمہ: "اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے ذمہ دار حاکموں کی اطاعت کرو۔"

اس اطاعت سے مراد یہی ہے کہ حکام عمومی مصلحتوں کی بنیاد پر جو قاعدے مقرر کریں (بشرطیکہ وہ شریعت کے خلاف نہ ہو) ان کی پابندی کی جائے، اس پابندی کا حکم اللہ اور رسول کی اطاعت کے ساتھ دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے قواعد کی پابندی شرعاً بھی ضروری ہو جاتی ہے۔

② دوسرا گناہ: جب کوئی شخص سڑک پر گاڑی چلانے کا لائسنس لیتا ہے تو وہ حکام سے زبانی، تحریری یا کم از کم عملی وعدہ کرتا ہے کہ وہ سڑک پر گاڑی چلاتے وقت تمام مقررہ قواعد کی پابندی کرے گا، اگر لائسنس کی درخواست دیتے وقت ہی وہ متعلقہ حکام کو یہ بتادے کہ وہ ٹریفک کے اصولوں کی رعایت نہیں رکھ سکے گا، تو اسے کبھی لائسنس نہ دیا جائے، لہٰذا اسے لائسنس اسی وعدے کی بنیاد پر دیا گیا ہے، چناں چہ اس کے بعد اگر وہ ٹریفک کے قواعد کو توڑتا ہے تو اس میں وعدے کی خلاف ورزی کا بھی گناہ ہے۔

③ تیسرا گناہ: ان قواعد کو توڑنے سے عموماً کسی نہ کسی انسان کو تکلیف ضرور پہنچتی ہے، بعض اوقات تو اسی بنا پر کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے، اور کسی بے گناہ کی جان چلی جاتی ہے، یا اسے کوئی اور جسمانی نقصان پہنچ جاتا ہے، یا کم از کم اتنا تو ہوتا ہی ہے کہ

[1] النساء: ۵۹

اس سے دوسروں کو ذہنی تکلیف پہنچتی ہے، اور یہ بات بار بار گزر چکی ہے کہ کسی بھی شخص کو بلاوجہ تکلیف پہنچانا اتنا سنگین گناہ ہے کہ اس کی معافی صرف توبہ سے نہیں ہوتی، جب تک وہ شخص معاف نہ کرے۔

⑥ تکلیف کا چھٹا سبب: غلط ڈرائیونگ

اسلامی فقہ کی ہر کتاب میں یہ اصول لکھا ہوا ہے کہ عام راستوں پر چلنا اور کوئی سواری چلانا اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ چلنے والا دوسروں کی "سلامتی" کی ضمانت دے، یعنی ایسے ہر کام سے اجتناب کرے جو کسی دوسرے شخص کے لئے تکلیف یا خطرے کا باعث بن سکتا ہو، اس احتیاط کے بغیر اس کے لئے سڑک کا استعمال ہی جائز نہیں ہے، جو تمام باشندوں کی مشترکہ ملکیت ہے، اور اگر اس بے احتیاطی کے نتیجے میں کسی شخص کو کوئی جانی یا مالی نقصان پہنچ جائے تو اس کا سارا تاوان شرعی اعتبار سے اس شخص کے ذمے عائد ہوتا ہے جس نے بے احتیاطی کے ساتھ سڑک کو استعمال کیا۔

اب غور فرمایئے کہ اگر ایک شخص سگنل توڑ کر گاڑی آگے لے گیا، یا اس نے کسی ایسی جگہ سامنے والی گاڑی کو اوور ٹیک کیا جہاں ایسا کرنا ممنوع تھا، بظاہر تو یہ معمولی سی بے قاعدگی ہے، لیکن درحقیقت اس معمولی سی حرکت میں چار بڑے گناہ جمع ہیں، ① قانون شکنی، اور حاکم کے جائز حکم کی نافرمانی ② وعدہ خلافی ③ کسی کو تکلیف پہنچانا ④ سڑک کا ناجائز استعمال، یہ گناہ ہم دن رات کسی تکلف کے بغیر اپنے دامنوں میں سمیٹ رہے ہیں، اور خیال بھی نہیں آتا کہ ہم سے کوئی گناہ سرزد ہو رہا ہے۔

پھر بعض اوقات کسی ایک شخص کی بے قاعدگی سینکڑوں انسانوں کا راستہ ہی بالکل بند کر دیتی ہے، مثلاً سڑک کے ایک حصے میں اگر کسی وجہ سے ٹریفک رک گیا تو

بعض جلد باز لوگ تھوڑے سے انتظار کی زحمت گوارا کرنے کے بجائے سڑک کے اس حصے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں جو آنے والے ٹریفک کے لئے مخصوص ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آنے والی گاڑیوں کا راستہ رک جاتا ہے، اور گھنٹوں تک کے لئے ٹریفک اس طرح جام ہو جاتا ہے کہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ اس قسم کی بے قاعدگی درحقیقت "فساد فی الارض" کی تعریف میں آتی ہے، اور سینکڑوں انسانوں کو کرب وعذاب میں مبتلا کرنے کا گناہ اس شخص پر ہے، جس نے غلط سمت میں گاڑی لے جا کر اس صورت حال سے لوگوں کو دوچار کیا۔[1]

ڈرائیو کرتے ہوئے دوسروں کو تکلیف سے بچانا چاہئے اس لحاظ سے کئی چیزوں کا خیال رکھنا چاہئے۔

① **کیچڑ نہ اُڑائیں:** سڑک پر جہاں کہیں بھی بارش کا یا کوئی اور پانی جمع ہو تو گاڑی نہایت احتیاط سے اور آرام سے چلانی چاہئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ پانی کی چھینٹیں اُڑ کر پیدل چلنے والوں اور موٹر سائیکل چلانے والوں کے کپڑوں پر لگ جائیں۔ اس طرح ان کو تکلیف بھی ہوگی اور بعض اوقات کپڑے بھی ناپاک ہو جاتے ہیں۔

② **گاڑی چیک کرلیں:** اپنی گاڑی کو مکمل چیک کرنے کے بعد روڈ پر نکالیں، اگر ایسا نہ کیا گیا تو راستے میں کوئی بھی پریشانی گھیر سکتی ہے، مثلاً پٹرول، بریک، کلچ وغیرہ۔

گاڑی کی لائٹوں کا خاص خیال رکھا جائے ورنہ رات کے وقت گاڑی کی لائٹ نہ ہونے کی وجہ سے سامنے سے آنے والی گاڑی یا پیدل آدمی سے کسی بھی وقت حادثہ ہوسکتا ہے۔ اسی طرح گاڑی کے اینڈی کیٹر (اشارے) بھی ڈرست ہونے چاہئیں ورنہ گاڑی کے مڑتے وقت کافی پریشانی کا باعث ہوتا ہے، ہاتھ باہر نکال کر

[1] ذکر و فکر: ص ۱۸۳ تا ۱۸۸

اشارہ کرنا پڑتا ہے موٹر سائیکل والے کے لئے تو اور خطرناک بات ہے۔

گاڑی کی بریک لائٹ بھی درست کرلینی چاہئے اس لئے کہ آپ کی بریک لینے کی خبر پچھلی گاڑی والے کو ہونا ضروری ہے ورنہ ہر وقت حادثے کا خطرہ رہتا ہے۔

⑦ تکلیف کا ساتواں سبب: اوقات ضائع کرنا

سب سے بڑی چیز جسے آج کل ایک رواج کی شکل دے دی گئی ہے اور گناہ نہیں سمجھا جاتا وہ ہے دوسروں کے اوقات ضائع کرنا، کسی کے اوقات ضائع کرنے کی مختلف شکلیں ہیں۔

کبھی کسی کے ہاں جا کر وقت ضائع کیا جاتا ہے اور کبھی کسی کو بلا کر وقت ضائع کرا جاتا ہے۔

جب کسی کے ہاں جائے تو فضول باتوں میں اپنا اور میزبان کا وقت ضائع نہ کرے، میزبان کو اپنے آنے کے بارے میں جو وقت بتائے اُسی پر پہنچے دیر نہ کرے، کیوں کہ اس سے میزبان کو تکلیف ہوتی ہے اور یہ وعدہ خلافی کے زُمرے میں بھی آتا ہے۔ جب کسی کو اپنے ہاں بلائے تو مہمان کو انتظار نہ کروائے بل کہ مہمان کو وقت پر فارغ کرنے کی کوشش کرے تاکہ آپ کا اور مہمان کا قیمتی وقت ضائع نہ ہو۔

حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں: "کچھ عرصہ قبل میں اپنے ایک عزیز کے یہاں شادی کی ایک تقریب میں مدعو تھا، چوں کہ آج کل شادی کی تقریبات متعدد وجوہ سے ناقابل برداشت ہوتی جارہی ہیں، اس لئے میں بہت کم تقریبات میں شرکت کرتا ہوں، اور رشتہ داری کا یا دوستی کا حق کسی اور مناسب وقت پر ادا کرنے کی کوشش کرتا ہوں، اتفاق سے اس روز اسی وقت میں پہلے سے بہار کالونی میں ایک

جگہ تقریر کا وعدہ کر چکا تھا، جب کہ شادی کی یہ تقریب نیشنل اسٹیڈیم کے متصل ایک لان میں منعقد ہو رہی تھی، یعنی دونوں جگہوں کے درمیان میلوں کا فاصلہ تھا، اس لئے میرے پاس ایک معقول عذر تھا، جو میں نے تقریب کے منتظمین سے عرض کر دیا، اور پروگرام یہ بنایا کہ میں بہار کالونی جاتے ہوئے اہلِ خانہ کو تقریب میں چھوڑتا جاؤں گا، اور جب بہار کالونی کے پروگرام سے واپس ہوں گا تو اس وقت تک تقریب ختم ہو چکی ہوگی، میں منتظمین کو مختصر مبارک باد دے کر گھر والوں کو ساتھ لے جاؤں گا۔

چناں چہ اسی نظم کے مطابق میں نے عشاء کی نماز بہار کالونی میں پڑھی، نماز کے کافی دیر بعد وہاں پروگرام شروع ہوا، مجھ سے پہلے ایک اور صاحب نے خطاب کیا، پھر میرا خطاب بھی تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہا، اس کے بعد عشائیہ کا انتظام تھا، میں نے اس میں بھی شرکت کی، پھر وہاں سے روانہ ہوا، اور جب اسٹیڈیم پہنچا تو رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے، خیال یہ تھا کہ اگرچہ دعوت نامے پر نکاح کا وقت آٹھ بجے اور کھانے کا وقت غالباً ساڑھے آٹھ بجے درج تھا، لیکن اگر کچھ دیر ہوئی ہوگی، تب بھی ساڑھے گیارہ بجے تک ضرور تقریب ختم ہوگئی ہوگی، لیکن جب میں تقریب والے لان میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ ابھی تک بارات ہی نہیں آئی، لوگ بیچارگی کے عالم میں اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے، بعض لوگوں کے کندھوں سے بچے لگے ہوئے تھے جو بھوک یا نیند کے غلبے کی وجہ سے روتے روتے سونے لگے تھے، کچھ لوگ بار بار گھڑی دیکھ کر نکاح میں شرکت کے بغیر واپسی کی سوچ رہے تھے، اور بہت سے افراد منتشر ٹولیوں کی شکل میں وقت گزاری کے لئے بات چیت میں مشغول تھے، اور بہت سے ساکت و صامت بیٹھے آنے والے حالات کا انتظار کر رہے تھے، منتظمین نے لوگوں کے پوچھنے پر انہیں "اطمینان" دلایا کہ ابھی فون سے پتہ چلا ہے کہ بارات روانہ ہو رہی ہے، اور ان شاء اللہ آدھے گھنٹے تک یہاں پہنچ جائے گی!!

میں تو خیر پہلے ہی معذرت کر چکا تھا، اس لئے چند منٹ بعد منتظمین سے

اجازت لے کر چلا آیا، لیکن آدھے گھنٹے بعد بارات کے آنے کا مطلب یہ تھا کہ سوا بارہ بجے رات کو بارات پہنچی ہوگی، ساڑھے بارہ کے وقت نکاح ہوا ہوگا، اور کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے یقیناً لوگوں کو ڈیڑھ بج گیا ہوگا۔

یہ تو ایک تقریب کا واقعہ تھا، شہر کی بیشتر شادی کی تقریبات کا یہی حال ہے کہ دعوت نامے پر لکھے ہوئے اوقات قطعی طور پر بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں، خود لکھنے والوں کا ارادہ بھی یہی ہوتا ہے کہ ہم ان اوقات کی پابندی نہیں کریں گے، لہٰذا جن حضرات کو دعوت نامہ پہنچتا ہے، وہ بھی اتنی بات تو یقین سے جانتے ہیں کہ دعوت نامے میں لکھے ہوئے اوقات پر عمل نہیں ہوگا، لیکن تقریب کے واقعی اوقات کیا ہوں گے؟ چوں کہ اس کے بارے میں یقینی بات کوئی نہیں بتا سکتا، اس لئے ہر شخص اپنا الگ اندازہ لگاتا ہے، شروع شروع میں لوگوں نے یہ اندازہ لگانا شروع کیا کہ مقررہ وقت سے آدھے پون گھنٹے کی تاخیر ہو جائے گی، لیکن جب اس حساب سے دعوت میں پہنچ کر گھنٹوں خوار ہونا پڑا تو انہوں نے تاخیر کا اندازہ اور بڑھا لیا، اور اس طرح ہوتے ہوتے بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ نہ اب تاخیر کی کوئی حد مقرر ہے، نہ اندازوں کا کوئی حساب، ایسے واقعات بھی سننے میں آئے ہیں کہ رات کو ایک بجے کے بعد نکاح ہوا، اور لوگ دو بجے کے بعد اپنے گھروں کا رخ کر سکے، ہر شخص کے پاس اپنی سواری بھی نہیں ہوتی، اور رات گئے سواری کا انتظام جوئے شیر لانا تو ہے ہی، شہر کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر جان کا جوا کھیلنے کے مترادف بھی ہے۔

اس صورتِ حال کے نتیجے میں کسی ایک تقریب میں شرکت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کم از کم چار پانچ گھنٹے خرچ کرے، بے مقصد انتظار کی کوفت برداشت کرے، رات گئے ٹیکسیوں کا کئی گنا زیادہ کرایہ ادا کرے، اور پھر بھی سارے راستے ممکنہ خطرات سے سہما رہے، رات کو بے وقت سونے کے نتیجے میں صبح کو دیر سے بیدار ہو کر فجر کی نماز غائب کرے یا تو اگلے روز آدھے دن کی چھٹی کرے، یا نیم غنودگی کی

حالت میں الٹا سیدھا کام کرے، سوال یہ ہے کہ:

ع کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

دنیا کا کوئی نظامِ فکر ایسا نہیں ہے جس میں وقت کو انسان کی سب سے بڑی دولت قرار دے کر اس کی اہمیت پر زور نہ دیا گیا ہو۔ انسان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے، اور جو قومیں وقت کی قدر پہچان کر اسے ٹھیک ٹھیک استعمال کرتی ہیں، وہی دنیا میں ترقی کی منزلیں طے کرتی ہیں۔

مجھے کبھی جاپان جانے کا اتفاق نہیں ہوا، لیکن میرے ایک دوست نے (جو خاصے معتمد ہیں) ایک صاحب کا یہ قصہ سنایا کہ وہ اپنے کسی تجارتی مقصد سے جاپان گئے تھے، وہاں ان کے ایک ہم پیشہ تاجر یا صنعت کار نے انہیں رات کے کھانے پر اپنے یہاں دعوت دی، جب یہ صاحب کھانے کے مقررہ وقت پر ان کے گھر پہنچے تو میزبان کھانے کی میز پر بیٹھ چکے تھے، اور کھانا لگایا جا چکا تھا، ان صاحب کو کسی قسم کے تمہیدی تکلفات کے بغیر سیدھے کھانے کی میز پر لے جا کر بٹھا دیا گیا، اور کھانا فوراً شروع ہوگیا، کھانے کے دوران باتیں ہوتی رہیں، لیکن ان صاحب نے ایک عجیب سی بات یہ نوٹ کی کہ میزبانوں کے پاؤں کھانے کے دوران ایک خاص انداز سے حرکت کر رہے تھے، شروع میں انہوں نے یہ سمجھا کہ شاید یہ اس انداز کی حرکت ہے جیسے بعض لوگ بے مقصد پاؤں ہلانے کے عادی ہو جاتے ہیں، لیکن تھوڑی دیر بعد انہوں نے محسوس کیا کہ پاؤں کی حرکت میں کچھ ایسی باقاعدگی ہے جو بے مقصد حرکت میں عموماً نہیں ہوا کرتی، بالآخر انہوں نے میزبانوں سے پوچھ ہی لیا، اور ان صاحب کی حیرت کی انتہا نہیں رہی جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ دراصل میز کے نیچے کوئی مشین رکھی ہوئی ہے اور وہ کھانے کے دوران بھی اپنا پاؤں استعمال کر کے کوئی ہلکا پھلکا ”پیداواری کام“ جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ قصہ سچا ہے یا کسی ”جہاں دیدہ“ نے زیبِ داستان

کے لئے گھڑا ہے، لیکن اس قسم کے قصے بھی اسی قوم کے بارے میں گھڑے جا سکتے ہیں جس نے اپنے عمل سے وقت کی قدر و قیمت پہچاننے اور محنت کرنے کی مثالیں قائم کی ہوں، ہمارے ملک کے بارے میں اس قسم کا کوئی قصہ جھوٹ موٹ بھی نہیں گھڑا جا سکتا، اس لئے کہ ہمارا مجموعی طرزِ عمل یہ بتاتا ہے کہ وقت ہمارے نزدیک سب سے زیادہ بے وقعت چیز ہے، اور اگر شادی کی کسی ایک رسمی تقریب میں شرکت کے لئے ہمارا پورا دن برباد ہو جائے تو بھی ہمیں کوئی پروا نہیں ہوتی۔

ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ ہم وقت کی یہ ناقدری اس دینِ اسلام کے نام لیوا ہونے کے باوجود کرتے ہیں جس نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ہر شخص کو اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب آخرت میں دینا ہوگا، جس نے پانچ وقت کی باجماعت نماز مقرر کر کے اس کے ہر دن کو خود بخود پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، اور اس کے ذریعے شب و روز کا بہترین نظام الاوقات طے کرنا آسان بنا دیا ہے۔

یوں تو وقت ضائع کرنے کے مظاہرے ہم زندگی کے ہر شعبے میں کرتے ہیں، لیکن اس وقت موضوعِ گفتگو تقریبات اور دعوتیں تھیں جن میں وقت کی پابندی نہ کر کے ہم اپنا بھی، اور سینکڑوں مدعوین کا بھی وقت برباد کرتے ہیں، لوگوں کو دعوت میں بلا کر انہیں غیر محدود مدت تک انتظار کی قید میں رکھنا ان سب کے ساتھ ایسی زیادتی ہے جس کے خلاف ایسے خوشی کے مواقع پر کوئی احتجاج کرنا بھی آسان نہیں ہوتا، کیوں کہ لوگ مروت میں اس زیادتی پر زبان بھی نہیں کھولتے، لیکن جو شخص بھی انسانوں کی اتنی بڑی تعداد کو بلاوجہ تکلیف پہنچانے کا سبب بنے، کیا وہ گناہ گار نہیں ہوگا؟ مدعو حضرات میں سے بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کا وقت بچتا تو ملک و ملت کے کسی مفید کام میں خرچ ہوتا، ایسے لوگوں کا وقت ضائع کر کے انہیں گھنٹوں بے مقصد بٹھائے رکھنا صرف ان پر نہیں، ملک و ملت پر بھی ظلم ہے، یہ حقیقت میں دعوت نہیں عداوت ہے۔

کہا جاتا ہے کہ چوں کہ ایک غلط رَوِش معاشرے میں چل پڑی ہے، اس لئے اگر کوئی شخص اسے غلط سمجھ کر اس کی اصلاح کرنا بھی چاہے تو اب اصلاح اس کے بس میں نہیں رہی، لیکن مجھے اس نقطۂ نظر سے کبھی اتفاق نہیں ہوا، سوال یہ ہے کہ آپ اس قسم کی غلط، بل کہ مہلک رَوِش کا کب تک ساتھ دیں گے؟ کب تک رواجِ عام کو غلطیوں کا بہانا بنایا جاتا رہے گا؟ ہر غلط رَوِش کے آگے ہتھیار ڈال کر اس کے بہاؤ پر بہنے کا سلسلہ آخر کہاں جا کر رکے گا؟

واقعہ یہ ہے کہ اصل ضرورت صرف ایک پختہ اور ناقابلِ شکست ارادے کی ہے، اسی ماحول میں جہاں مقررہ وقت پر کسی دعوت میں پہنچنے والا بے وقوف سمجھا جاتا ہے، خود میں نے ایسے بہت سے لوگ دیکھے ہیں جنہوں نے دعوت نامے پر پابندیٔ وقت کی خصوصی ہدایت لکھی، اور اس پر عمل کر کے بھی دکھایا، اور کھانے کا جو وقت دیا گیا تھا، اس پر کھانا واقعی شروع کر دیا، اور اس بات کی پروا نہیں کی کہ حاضرین کم ہیں یا زیادہ؟ سوال یہ ہے کہ اگر کچھ لوگوں نے پابندیٔ وقت کے خصوصی التماس کے باوجود آنے میں دیر کی ہے تو اس کی سزا ان لوگوں کو کیوں دی جائے جو بے چارے وقت پر آگئے تھے؟ جب تک کچھ لوگ ان باتوں کو سنجیدگی سے سوچ کر پابندیٔ وقت کا تہیہ نہیں کریں گے، اس وقت تک تقریبات کا یہ بے ڈھب سلسلہ کسی حد پر نہیں رکے گا۔

"آج بھی جو تقریبات ہوٹلوں میں ہوتی ہیں، اور جہاں گھنٹوں کے حساب سے بکنگ ہوتی ہے، وہاں سارے کام کس طرح وقت پر ہو جاتے ہیں؟ معلوم ہوا کہ ضرورت صرف پختہ ارادے کی ہے، اگر چند افراد بھی یہ پختہ ارادہ کر لیں اور اس پر عمل کر کے دکھا دیں تو تبدیلی ہمیشہ افراد ہی سے آتی ہے، اور پھر رفتہ رفتہ وہ عمومی رواج کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔[1]"

---

[1] ذکر و فکر: ص ۲۰۸ تا ۲۱۲

ضیاعِ وقت خودکشی ہے:

سچ یہ ہے کہ وقت ضائع کرنا ایک طرح کی خودکشی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ خودکشی ہمیشہ کے لئے زندگی سے محروم کر دیتی ہے اور تضییعِ اوقات ایک محدود زمانے تک زندہ کو مردہ بنا دیتی ہے، یہی منٹ گھنٹے اور دن جو غفلت اور بے کاری میں گزر جاتا ہے، اگر انسان حساب کرے تو ان کی مجموعی تعداد مہینوں بل کہ برسوں تک پہنچتی ہے، اگر کسی سے کہا جائے کہ آپ کی عمر سے دس پانچ سال کم کر دیئے گئے تو یقیناً اس کو سخت صدمہ ہوگا، لیکن وہ معطل بیٹھا ہوا خود اپنی عمرِ عزیز کو ضائع کر رہا ہے، مگر اس کے زوال پر اس کو کچھ افسوس نہیں ہوتا۔

اگرچہ وقت کا بے کار کھونا عمر کا کم کرنا ہے، لیکن اگر یہی ایک نقصان ہوتا تو کوئی غم نہ تھا، لیکن بہت بڑا نقصان اور خسارہ یہ ہے کہ بے کار آدمی طرح طرح کے جسمانی و روحانی عوارض میں مبتلا ہو جاتا ہے حرص و طمع، ظلم و ستم، قمار بازی، زنا کاری اور شراب نوشی عموماً وہی لوگ کرتے ہیں جو معطل اور بے کار رہتے ہیں، جب تک انسان کی طبیعت، دل و دماغ نیک اور مفید کام میں مشغول نہ ہوگا اس کا میلان ضرور بدی اور معصیت کی طرف رہے گا پس انسان اسی وقت صحیح انسان بن سکتا ہے، جب وہ اپنے وقت پر نگران رہے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرے ہر کام کے لئے ایک وقت اور ہر وقت کے لئے ایک کام مقرر کر دے۔

وقت خام مصالحے کی مانند ہے جس سے آپ جو کچھ چاہیں بنا سکتے ہیں، وقت وہ سرمایہ ہے جو ہر شخص کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یکساں عطا کیا گیا ہے اس سرمایہ کو مناسب موقع پر کام میں لاتے ہیں۔ جسمانی راحت اور روحانی مسرت ان ہی کو نصیب ہوتی ہے، وقت ہی کے صحیح استعمال سے ایک وحشی مہذب بن جاتا ہے، اس کی برکت سے جاہل، عالم، مفلس، تونگر، ناوان، دانا بنتے ہیں، پر وقت ایسی دولت

ہے جو شاہ و گدا، امیر و غریب، طاقت ور اور کمزور سب کو یکساں ملتی ہے۔

اگر آپ غور کریں گے تو نوے فیصد لوگ صحیح طور پر یہ نہیں جانتے کہ وہ اپنے وقت کا زیادہ حصہ کہاں اور کیوں صرف کرتے ہیں، جو شخص دونوں ہاتھ اپنی جیبوں میں ڈال کر وقت ضائع کرتا ہے تو وہ بہت جلد اپنے ہاتھ دوسروں کی جیب میں ڈالے گا۔

آپ کی کامیابی کا واحد علاج یہ ہے کہ آپ کا وقت کبھی فارغ نہیں ہونا چاہئے، سستی نام کی کوئی چیز نہ ہو اس لئے سستی نسوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح لوہے کو زنگ، زندہ آدمی کے لئے بے کاری زندہ در گور ہونا ہے۔

ٹیلیفون پر لمبی بات کرنا

حضرت مفتی شفیع صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ فرمایا کرتے تھے: ''اب ایذاء رسانی کا ایک آلہ بھی ایجاد ہو چکا ہے۔ وہ ہے ''ٹیلیفون'' یہ ایک ایسا آلہ ہے کہ اس کے ذریعہ جتنا چاہو دوسرے کو تکلیف پہنچا دو، چناں چہ آپ نے کسی کو ٹیلیفون کیا اور اس سے لمبی گفتگو شروع کر دی اور اس کا خیال نہیں کیا کہ وہ شخص اس وقت کسی کام کے اندر مصروف ہے۔ اس کے پاس وقت ہے یا نہیں۔''

ٹیلیفون کرنے کے آداب میں یہ بات داخل ہے کہ اگر کسی سے لمبی بات کرنی ہو تو پہلے اس سے پوچھ لو کہ مجھے ذرا لمبی بات کرنی ہے، چار پانچ منٹ لگیں گے۔ اگر آپ اس وقت فارغ ہوں تو ابھی بات کر لوں اور اگر فارغ نہ ہوں تو کوئی مناسب وقت بتا دیں، اس وقت بات کر لوں گا۔ اجازت طلب کرنے کے آداب ''تکلیف سے بچنے کا دوسرا راستہ'' کے عنوان کے تحت گزر چکے ہیں دیکھ لیا جائے، اور خود حضرت مفتی شفیع صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ بھی ان پر عمل فرمایا کرتے تھے۔[1]

[1] اصلاحی خطبات: ۱۲۶/۸

آج کل موبائل کا مرض عام ہو چکا ہے، اس کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں لیکن اس کا غلط استعمال لوگوں کے اوقات کا ضیاع اور تکلیف کا سبب بن رہا ہے، بعض لوگ بلا ضرورت میسج بھیج دیتے ہیں اور مس کالیں کرنا اور رانگ نمبر ملانا تو بعض لوگوں کی عادت بن چکی ہے، وہ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ جس کو مس کال کی جا رہی ہے وہ مصروف ہوگا۔

جس کے موبائل پر بلا ضرورت مس کالیں اور میسج آئیں وہ شخص بھی پریشان ہو جاتا ہے اور یکسوئی سے کوئی کام نہیں کر پاتا۔

۸ تکلیف کا آٹھواں سبب: مشترک اشیاء کا غلط استعمال

معاشرے میں بعض امور ایسے ہوتے ہیں جن کو چند لوگ مشترکہ طور پر کرتے ہیں بالکل اسی طرح کچھ اشیاء بھی ایسی ہوتی ہیں جن کو مشترکہ طور پر استعمال کیا جاتا ہے خواہ وہ یکے بعد دیگرے ہوں یا اجتماعی طور پر ہوں۔

ایسی اشیاء کو استعمال کرتے وقت تمام آداب اور دیگر لوگوں کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کیوں کہ اس کے استعمال کا حق سب کو ہے۔ تھوڑی سی بے احتیاطی دوسرے کی تکلیف کا باعث بن سکتی ہے اور اس کا وبال اور گناہ احتیاط نہ برتنے والے پر ہوگا۔ احادیثِ مبارکہ میں مشترک اشیاء کے صحیح استعمال اور آداب کا خیال رکھنے کی تاکید آئی ہے۔

"عَنْ جَبَلَةَ بْنِ سُحَيْمٍ -رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ- قَالَ أَصَابَنَا عَامُ سَنَةٍ مَعَ ابْنِ الزُّبَيْرِ، فَرَزَقَنَا تَمْرًا، فَكَانَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا يَمُرُّبِنَا وَنَحْنُ نَأْكُلُ، فَيَقُولُ: لَا تُقَارِنُوا، فَإِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ الْقِرَانِ، ثُمَّ يَقُولُ، إِلَّا أَنْ يَّسْتَأْذِنَ الرَّجُلُ أَخَاهُ."[1]

[1] صحيح بخاری، كتاب الاطعمة باب القِرَان فی التمر: ۸۱۹/۲

”حضرت جبلہ بن سحیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حکومت کے زمانے میں ہمارے اوپر قحط پڑا، قحط کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے کھانے کے لئے کچھ کھجوریں عطا فرما دیں، جب ہم وہ کھجوریں کھا رہے تھے۔ اس وقت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہمارے پاس سے گزرے، انہوں نے ہم سے فرمایا کہ دو دو کھجوریں ایک ساتھ مت کھاؤ، اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح دو دو کھجوریں ایک ساتھ ملا کر کھانے سے منع فرمایا ہے۔

دو دو کھجوریں ایک ساتھ ملا کر کھانے کو عربی میں ”قران“ کہتے ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے منع فرمایا کہ جو کھجوریں کھانے کے لئے رکھی ہیں اس میں سب کھانے والوں کا برابر مشترک حق ہے، اب اگر دوسرے لوگ تو ایک ایک کھجور اٹھا کر کھا رہے ہیں...... اور تم نے دو دو کھجوریں اٹھا کر کھانی شروع کر دیں تو اب تم دوسروں کا حق مار رہے ہو، اور دوسروں کا حق مارنا جائز نہیں۔ البتہ اگر دوسرے لوگ بھی دو دو کھجوریں کھا رہے ہیں تب تم بھی دو دو اٹھا کر کھا لو، لہٰذا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جس طرح دوسرے لوگ کھا رہے ہیں۔ تم بھی اسی طریقے سے کھاؤ، اس حدیث سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ دوسروں کا حق مارنا جائز نہیں۔

فائدہ: مذکورہ حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اصول بیان فرما دیا کہ جو چیز مشترک ہو، اور سب لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوں، اس مشترک چیز سے کوئی شخص دوسرے لوگوں سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے تو یہ جائز نہیں۔ اس لئے کہ اس کی وجہ سے دوسروں کا حق فوت ہو جائے گا، اس اصول کا تعلق صرف کھجور سے نہیں، بلکہ حقیقت میں زندگی کے ان تمام شعبوں سے اس کا تعلق ہے جہاں چیزوں میں اشتراک پایا جاتا ہے، مثلاً آج کل کی دعوتوں میں ”سیلف سروس“ کا رواج ہے کہ آدمی خود اٹھ کر جائے، اور اپنا کھانا لائے اور کھانا کھائے، اب اسی

کھانے میں تمام کھانے والوں کا مشترک حق ہے، اب اگر ایک شخص جا کر بہت سارا کھانا اپنے برتن میں ڈال کر لے آیا، اور دوسرے لوگ اس کو دیکھتے رہ گئے۔ تو یہ بھی اس اصول کے تحت ناجائز ہے، اور اس ”قران“ میں داخل ہے جس سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔

اس اصول کے ذریعہ امت کو یہ تعلیم دینی ہے کہ ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ ایثار سے کام لے، نہ یہ کہ وہ دوسروں کے حق پر ڈاکہ ڈالے، چاہے وہ حق چھوٹا سا کیوں نہ ہو، لہٰذا جب آدمی کوئی عمل کرے تو دوسروں کا حق مدنظر رکھتے ہوئے کام کرے، یہ نہ ہو کہ بس مجھے مل جائے، چاہے دوسروں کو ملے یا نہ ملے۔

حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں: ”میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے دسترخوان پر بیٹھ کر یہی مسئلہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ جب کھانا دسترخوان پر آئے تو یہ دیکھو کہ دسترخوان پر کتنے آدمی کھانے والے ہیں اور جو چیز دسترخوان پر آئی ہے وہ سب کے درمیان برابر تقسیم کی جائے تو تمہارے حصے میں کتنی آئے گی؟ بس اسی حساب سے وہ چیز تم کھا لو، اگر اس سے زیادہ کھاؤ گے تو یہ ”قران“ میں داخل ہے جو ناجائز ہے۔[1]“

نیز فرماتے ہیں: میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے: گھر میں بعض اشیاء مشترک استعمال کی ہوتی ہیں، جس کو گھر کا ہر فرد استعمال کرتا ہے، اور ان کی ایک جگہ مقرر ہوتی ہے کہ فلاں چیز فلاں جگہ پر رکھی جائے گی، مثلاً گلاس فلاں جگہ رکھا جائے گا، پیالہ فلاں جگہ رکھا جائے گا، صابن فلاں جگہ رکھا جائے گا، ہمیں فرمایا کرتے تھے کہ تم لوگ ان چیزوں کو استعمال کر کے بے جگہ رکھ دیتے ہو، تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارا یہ عمل گناہ کبیرہ ہے، اس لئے کہ وہ مشترک استعمال کی چیز ہے، جب دوسرے شخص کو اس کے استعمال کی ضرورت ہوگی تو وہ اس کو اس کی جگہ پر تلاش

---

[1] اصلاحی خطبات: ص۱۷۵ تا ۱۷۷

"حضرت جبلہ بن سحیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حکومت کے زمانے میں ہمارے اوپر قحط پڑا، قحط کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے کھانے کے لئے کچھ کھجوریں عطا فرما دیں، جب ہم وہ کھجوریں کھا رہے تھے۔ اس وقت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہمارے پاس سے گزرے، انہوں نے ہم سے فرمایا کہ دو دو کھجوریں ایک ساتھ مت کھاؤ، اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح دو دو کھجوریں ایک ساتھ ملا کر کھانے سے منع فرمایا ہے۔

دو دو کھجوریں ایک ساتھ ملا کر کھانے کو عربی میں "قران" کہتے ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے منع فرمایا کہ جو کھجوریں کھانے کے لئے رکھی ہیں اس میں سب کھانے والوں کا برابر مشترک حق ہے، اب اگر دوسرے لوگ تو ایک ایک کھجور اٹھا کر کھا رہے ہیں...... اور تم نے دو دو کھجوریں اٹھا کر کھانی شروع کر دیں تو اب تم دوسروں کا حق مار رہے ہو، اور دوسروں کا حق مارنا جائز نہیں۔ البتہ اگر دوسرے لوگ بھی دو دو کھجوریں کھا رہے ہیں تب تم بھی دو دو اٹھا کر کھا لو، لہٰذا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جس طرح دوسرے لوگ کھا رہے ہیں۔ تم بھی اسی طریقے سے کھاؤ، اس حدیث سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ دوسروں کا حق مارنا جائز نہیں۔

فائدہ: مذکورہ حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اصول بیان فرما دیا کہ جو چیز مشترک ہو، اور سب لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوں، اس مشترک چیز سے کوئی شخص دوسرے لوگوں سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے تو یہ جائز نہیں۔ اس لئے کہ اس کی وجہ سے دوسروں کا حق فوت ہو جائے گا، اس اصول کا تعلق صرف کھجور سے نہیں، بل کہ حقیقت میں زندگی کے ان تمام شعبوں سے اس کا تعلق ہے جہاں چیزوں میں اشتراک پایا جاتا ہے، مثلاً آج کل کی دعوتوں میں "سیلف سروس" کا رواج ہے کہ آدمی خود اٹھ کر جائے، اور اپنا کھانا لائے اور کھانا کھائے، اب اسی

کھانے میں تمام کھانے والوں کا مشترک حق ہے، اب اگر ایک شخص جا کر بہت سارا کھانا اپنے برتن میں ڈال کر لے آیا، اور دوسرے لوگ اس کو دیکھتے رہ گئے۔ تو یہ بھی اس اصول کے تحت ناجائز ہے، اور اس "قران" میں داخل ہے جس سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔

اس اصول کے ذریعہ امت کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ ایثار سے کام لے، نہ یہ کہ وہ دوسروں کے حق پر ڈاکہ ڈالے، چاہے وہ حق چھوٹا سا کیوں نہ ہو، لہٰذا جب آدمی کوئی عمل کرے تو دوسروں کا حق مدنظر رکھتے ہوئے کام کرے، یہ نہ ہو کہ بس مجھے مل جائے، چاہے دوسروں کو ملے یا نہ ملے۔

حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں: "میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے دستر خوان پر بیٹھ کر یہی مسئلہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ جب کھانا دستر خوان پر آئے تو یہ دیکھو کہ دستر خوان پر کتنے آدمی کھانے والے ہیں اور جو چیز دستر خوان پر آئی ہے وہ سب کے درمیان برابر تقسیم کی جائے تو تمہارے حصے میں کتنی آئے گی؟ بس اسی حساب سے وہ چیز تم کھا لو، اگر اس سے زیادہ کھاؤ گے تو یہ "قران" میں داخل ہے جو ناجائز ہے۔[1]"

نیز فرماتے ہیں: میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے: گھر میں بعض اشیاء مشترک استعمال کی ہوتی ہیں، جس کو گھر کا ہر فرد استعمال کرتا ہے، اور ان کی ایک جگہ مقرر ہوتی ہے کہ فلاں چیز فلاں جگہ پر رکھی جائے گی، مثلاً گلاس فلاں جگہ رکھا جائے گا، پیالہ فلاں جگہ رکھا جائے گا، صابن فلاں جگہ رکھا جائے گا، ہمیں فرمایا کرتے تھے کہ تم لوگ ان چیزوں کو استعمال کر کے بے جگہ رکھ دیتے ہو، تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارا یہ عمل گناہ کبیرہ ہے، اس لئے کہ وہ مشترک استعمال کی چیز ہے، جب دوسرے شخص کو اس کے استعمال کی ضرورت ہوگی تو وہ اس کو اس کی جگہ پر تلاش

[1] اصلاحی خطبات: ص ۱۷۵ تا ۱۷۷

کرے گا، اور جب جگہ پر اس کو وہ چیز نہیں ملے گی تو اس کو تکلیف اور ایذاء ہوگی، اور کسی بھی مسلمان کو تکلیف پہنچانا گناہ کبیرہ ہے۔ ہمارا ذہن بھی اس طرف گیا بھی نہیں تھا کہ یہ بھی گناہ کی بات ہے، ہم تو سمجھتے تھے کہ یہ تو دنیا داری کا کام ہے۔ گھر کا انتظامی معاملہ ہے۔ یاد رکھو، زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے، جس کے بارے میں دین کی کوئی ہدایت موجود نہ ہو۔ ہم سب اپنے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہ کیا ہم لوگ اس بات کا اہتمام کرتے ہیں کہ مشترک استعمال کی اشیاء استعمال کے بعد ان کی متعین جگہ پر رکھیں، تاکہ دوسروں کو تکلیف نہ ہو؟

اب یہ چھوٹی سی بات ہے۔ جس میں ہم صرف بے دھیانی اور بے توجہی کی وجہ سے گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ہمیں دین کی فکر نہیں، دین کا خیال نہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کا احساس نہیں، دوسرے اس لئے کہ ان مسائل سے جہالت اور ناواقفیت بھی آج کل بہت ہے۔

بہر حال، یہ سب باتیں "قران" کے اندر داخل ہیں۔ ویسے تو یہ چھوٹی سی بات ہے کہ دو کھجوروں کو ایک ساتھ ملا کر نہ کھانا چاہئے۔ لیکن اس سے یہ اصول معلوم ہوا کہ ہر وہ کام کرنا، جس سے دوسرے مسلمان کو تکلیف ہو، یا دوسروں کا حق پامال ہو، سب "قران" میں داخل ہیں۔

مشترک بیت الخلاء کا استعمال

بعض اوقات ایسی بات ہوتی ہے، جس کو بتاتے ہوئے شرم آتی ہے، لیکن دین کی باتیں سمجھانے کے لئے شرم کرنا بھی ٹھیک نہیں، مثلاً آپ بیت الخلاء گئے، اور فارغ ہونے کے بعد غلاظت کو بہایا نہیں، ویسے ہی چھوڑ کر چلے آئے۔ حضرت مفتی شفیع صاحب رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی فرمایا کرتے تھے کہ یہ عمل گناہ کبیرہ ہے، اس لئے کہ جب دوسرا شخص بیت الخلاء استعمال کرے گا تو اس کو کراہیت اور تکلیف ہوگی اور اس

تکلیف کا سبب تم بنے، تم نے اس کو تکلیف پہنچائی، اور ایک مسلمان کو تکلیف پہنچا کر تم نے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا۔[۱]

حضرت مفتی تقی عثمانی دَامَتْ بَرَكَاتُهُمُ الْعَالِيَة فرماتے ہیں:

تقریباً دو سال پہلے میں برطانیہ کے ایک سفر کے دوران برمنگھم سے ٹرین کے ذریعے ایڈنبرا جا رہا تھا، راستے میں مجھے غسل خانہ استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئی، میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر غسل خانے کی طرف چلا تو دیکھا کہ وہاں ایک انگریز خاتون پہلے سے انتظار میں کھڑی ہیں جس سے اندازہ ہوا کہ غسل خانہ خالی نہیں ہے، چناں چہ میں ایک قریبی سیٹ پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا، جب کچھ دیر گزر گئی تو اچانک غسل خانے کے دروازے پر میری نگاہ پڑی، وہاں (Vacant) کی تختی صاف نظر آ رہی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ غسل خانہ خالی ہے، اور اس میں کوئی نہیں ہے، اس کے باوجود وہ خاتون بدستور دروازے کے سامنے کھڑی ہوئی تھیں، اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ شاید ان کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، میں نے قریب جا کر ان سے کہا کہ غسل خانہ تو خالی ہے، اگر آپ اندر جانا چاہیں تو چلی جائیں، انہوں نے جواب دیا کہ دراصل غسل خانے کے اندر میں ہی تھی، لیکن جب میں پیشاب سے فارغ ہوئی تو ریل پلیٹ فارم پر رک گئی، اور میں کموڈ کو فلش نہیں کر سکی، (یعنی اس پر پانی نہیں بہا سکی) کیوں کہ جب گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی ہو تو فلش کرنا مناسب نہیں، اب میں باہر آ کر اس انتظار میں ہوں کہ گاڑی چلے تو میں اندر جا کر کموڈ کو فلش کروں، پھر اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھوں گی۔

یہ بظاہر ایک چھوٹا سا معمولی واقعہ تھا، لیکن میرے ذہن پر ایک نقش چھوڑ گیا، یہ ایک انگریز خاتون تھیں، اور بظاہر غیر مسلم، لیکن انہوں نے جو طرز عمل اختیار کیا، وہ دراصل اسلام کی تعلیم تھی، مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں ایک صاحب سے ایک

[۱] اصلاحی خطبات: ص۱۸۱، ۱۸۲

مرتبہ یہ غلطی سرزد ہوئی کہ وہ غسل خانہ استعمال کرنے کے بعد اسے فلش کئے بغیر باہر آ گئے تو میرے والد ماجد (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی) نے اس پر انہیں سخت تنبیہ کی، اور فرمایا کہ ایسا کرنا اسلامی تعلیمات کے مطابق سخت گناہ ہے، کیوں کہ اس طرح گندگی پھیلانے سے آنے والے شخص کو تکلیف ہوگی، اور کسی بھی شخص کو تکلیف پہنچانا گناہ ہے۔

دوسری طرف جب گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی ہو تو اس وقت غسل خانے کا استعمال یا اسے فلش کرنا ریلوے کے قواعد کے تحت اس لئے منع ہے کہ اس کے نتیجے میں ریلوے اسٹیشن کی فضا خراب ہوتی ہے، اور پلیٹ فارم پر موجود لوگوں کو ریلوے لائن پر پڑی ہوئی گندگی سے ذہنی کوفت بھی ہوتی ہے، اور وہ گندگی بیماریاں پھیلنے کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے، اس خاتون نے بیک وقت دونوں باتوں کا خیال کیا، ٹرین کے کھڑے ہونے کی حالت میں پانی بہانا بھی گوارا نہ کیا، اور پانی بہائے بغیر سیٹ پر آ کر بیٹھنا بھی پسند نہیں کیا، تا کہ کوئی شخص اس حالت میں جا کر تکلیف نہ اٹھائے۔

ہم مسلمان ہیں، اور ہماری ہر دینی تعلیم کا آغاز ہی طہارت سے ہوتا ہے، جسے آں حضرت ﷺ نے ایمان کا آدھا حصہ قرار دیا ہے نیز آپ ﷺ نے انتہائی باریک بینی سے ہر اس کام سے منع فرمایا ہے جو ناحق کسی دوسرے کی تکلیف کا باعث ہو، لیکن یہ بات کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کہ ہمارے مشترک غسل خانے، خواہ ریل میں ہوں یا جہاز میں، بازار میں ہوں یا مسجدوں میں، تعلیم گاہوں میں ہوں یا شفا خانوں میں، ہر جگہ عموماً گندگی کے ایسے مراکز بنے ہوئے ہیں کہ ان کے قریب سے گزرنا مشکل ہوتا ہے، اور ایک سلیم الطبع شخص کے لئے ان کا استعمال ایک شدید آزمائش سے کم نہیں۔ اس صورتِ حال کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان معاملات میں ہم نے دین کی تعلیمات کو بالکل نظر انداز کیا ہوا ہے اور مشترک استعمال کے مقامات پر گندگی پھیلانے کے بعد ہمیں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ ہم اذیت رسانی کے گناہ کے

مرتکب ہوئے ہیں، جس کا ہمیں جواب دینا پڑے گا۔

ہمارے ملک میں بھی ریلوں کے ہر غسل خانے میں یہ ہدایت درج ہے کہ جب تک گاڑی کسی اسٹیشن پر کھڑی ہو، بیت الخلاء استعمال نہ کیا جائے، لیکن عملاً صورتِ حال یہ ہے کہ کوئی اسٹیشن مشکل ہی سے ایسا ہوگا جس کی ریلوے لائن پر اس ہدایت کی خلاف ورزی کے مکروہ مناظر نظر نہ آتے ہوں، اسی طرح ہوائی جہازوں کے ہر غسل خانے میں یہ ہدایت درج ہوتی ہے کہ بیت الخلاء میں کوئی ٹھوس چیز نہ پھینکی جائے، نیز یہ کہ منہ ہاتھ دھونے کے لئے جو بیسن لگا ہوتا ہے اسے استعمال کرنے کے بعد آنے والے مسافر کی سہولت کے لئے اسے کاغذ کے تولیہ سے صاف کر دیا جائے، لیکن ان ہدایات پر بھی کماحقہ عمل نہیں کیا جاتا۔

چناں چہ ہمارے ہوائی جہازوں کے غسل خانے بھی اب ہمارے مجموعی قومی مزاج کی نہایت بھدی تصویر پیش کرتے ہیں، حالاں کہ اگر ان ہدایات پر عمل کر کے ہم دوسروں کے لئے راحت کا سامان کریں تو یہ محض ایک شائستگی کی بات ہی نہیں ہے بل کہ یقیناً اجر و ثواب کا کام ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا ایک ارشاد اتنا مشہور ہے کہ بہت سے مسلمانوں کو معلوم ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: "ایمان کے ستر سے بھی زیادہ شعبے ہیں، اور ان میں سے ادنیٰ ترین شعبہ یہ ہے کہ راستے سے گندگی یا تکلیف دہ چیز کو دور کر دیا جائے[1]" اس ارشادِ نبوی ﷺ کی روشنی میں مؤمن کا کام تو یہ ہے کہ اگر کسی دوسرے شخص نے بھی کوئی گندگی پھیلا دی ہے اور اندیشہ ہے کہ لوگوں کو اس سے تکلیف پہنچے گی تو وہ خود اسے دور کر دے نہ یہ کہ خود گندگی پھیلاتا پھرے، اگر گندگی دور کرنا ایمان کا شعبہ ہے تو گندگی پھیلانا کس چیز کا شعبہ ہوگا؟ ظاہر ہے کہ بے ایمانی کا، یا کفر و فسق کا؟ لیکن ہم نے اپنے عمل سے کچھ ایسا تاثر دے رکھا ہے کہ صفائی ستھرائی درحقیقت

[1] مسلم، باب عدد شعب الایمان: ۴۷/۱

ہمارا نہیں، بل کہ غیر مسلم مغربی اقوام کا شیوہ ہے۔

یہاں مجھے پھر اپنے والد ماجد کا سنایا ہوا ایک لطیفہ یاد آ گیا، وہ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ ہندوستان میں ایک انگریز مسلمان ہو گیا، اور اس نے پانچوں وقت نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں آنا شروع کر دیا، جب کبھی اسے وضو خانے میں جانے کی ضرورت پیش آتی تو یہ دیکھ کر اس کا دل کڑھتا تھا کہ نالیوں میں گندگی پڑی رہتی ہے، کناروں پر کائی جمی رہتی ہے، نہ لوگ ان میں گندگی ڈالنے سے پرہیز کرتے ہیں نہ ان کی صفائی کا کوئی انتظام ہے، آخر ایک روز اس نے یہ طے کیا کہ اس مقدس عبادت گاہ کو صاف رکھنا چوں کہ بڑے ثواب کا کام ہے، اس لئے وہ خود ہی یہ خدمت انجام دے گا، چناں چہ وہ کہیں سے جھاڑو وغیرہ لا کر اپنے ہاتھ سے اسے صاف کرنے لگا، معقول مسلمانوں نے تو یقیناً اس کے اس عمل کی قدر کی ہوگی، لیکن محلے کے ایک صاحب نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "یہ انگریز مسلمان تو ہو گیا، لیکن اس کے دماغ سے انگریزیت کی خوبو (عادت، خصلت) نہیں گئی۔"

جن صاحب نے یہ افسوس ناک تبصرہ کیا، انہوں نے تو کھل کر صریح لفظوں ہی میں یہ بات کہہ دی، لیکن اگر ہمارے مجموعی طرز عمل کا جائزہ لیا جائے تو محسوس یہ ہی ہوتا ہے کہ ہم نے صفائی ستھرائی کو "انگریزیت کی خوبو" قرار دے رکھا ہے، اور شاید گندگی کو اپنی خوبو، حالاں کہ اسلام نے، جس کے ہم نام لیوا ہیں صفائی ستھرائی سے بھی بہت آگے بڑھ کر طہارت کا وہ تصور پیش کیا ہے جو ظاہری صفائی سے کہیں بلند و برتر ہے اور جسم کے ساتھ ساتھ روح کی پاکیزگی کے وہ طریقے سکھاتا ہے جن سے بیشتر غیر اسلامی اقوام محروم ہیں۔

اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ جن مغربی اقوام کی ظاہری صفائی پسندی کا ذکر پیچھے آیا ہے، ان کا یہ ذوق صرف اس صفائی کی حد تک محدود ہے، جو دوسرے کو نظر آئے، لیکن جہاں تک ذاتی اور اندرونی (Intrinsic) صفائی کا تعلق ہے، اس سے ان اقوام

کی محرومی کا تھوڑا سا اندازہ ان طریقوں کو دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے جو وہ بیت الخلا استعمال کرنے کے بعد اپنے جسم کی صفائی کے لئے اختیار کرتے ہیں، جب تک اس عمل کے بعد نہانا نہ ہو، جسم سے گندگی دور کرنے کے لئے پانی کے استعمال کا ان کے یہاں کوئی تصور نہیں، اس بات کا تو ان کے یہاں بڑا اہتمام ہے کہ غسل خانے کے فرش پر پاک پانی کی بھی کوئی چھینٹ پڑی نظر نہ آئے، لیکن جسم سے نجاست اور گندگی کو دور کرنے کے لئے صرف ٹائلٹ پیپر کو کافی سمجھا جاتا ہے، حالاں کہ پانی کے استعمال کے بغیر گندگی کا کلی ازالہ مشکل ہے، چناں چہ اگر گندگی کے کچھ چھوٹے اجزاء جسم یا کپڑے پر اس طرح باقی رہ جائیں کہ وہ نظر نہ آئیں تو ان کے ازالے کی اتنی فکر نہیں ہے۔ پھر اگر اس عمل کے بعد غسل بھی کرنا ہو تو عموماً اس کا طریقہ یہ ہے کہ ٹب میں پانی جمع کر کے اسی حالت میں پانی کے اندر اس طرح داخل ہو جاتے ہیں کہ پانی کے اخراج کا کوئی راستہ نہیں ہوتا، اور نجاست کے باقی ماندہ چھوٹے اجزاء بعض اوقات پورے پانی کو ناپاک کر سکتے ہیں۔

یہ تمام طریقے اس لئے اختیار کئے گئے ہیں کہ سارا زور صرف اس ظاہری صفائی پر ہے جو دوسرے کو نظر آئے، ذاتی اور اندرونی صفائی جس کا نام "طہارت" ہے اس کا کوئی تصور نہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اسلام نے ہمیں ظاہری صفائی ستھرائی (نظافت) کے ساتھ ساتھ "طہارت" (پاکی) کے بھی مفصل احکام دیئے ہیں، اس لئے اسلام میں صفائی کا تصور کہیں زیادہ جامع، ہمہ گیر اور بلند و برتر ہے، اسلام کو "طہارت" بھی مطلوب ہے اور نظافت بھی، طہارت کا مقصد یہ ہے کہ انسان بذاتِ خود واقعی پاک صاف رہے، اور نظافت کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی گندگی سے دوسروں کے لئے تکلیف کا باعث نہ بنے۔[1]

---

[1] ذکر و فکر: ص ۱۹۵ تا ۱۹۹

⑨ تکلیف کا نواں سبب: پسینے کی بو

انسان کو جس طرح آلودہ ماحول اور گندگی سے تکلیف ہوتی ہے اسی طرح پسینے کی بدبو سے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ ہر شخص کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ صاف ستھرا رہے، ایسی حالت میں کبھی کسی سے نہ ملے کہ اُس کے بدن یا کپڑوں سے پسینے کی بو آرہی ہو۔ کیوں کہ اس سے دوسرے انسان کو تکلیف ہوگی۔ ہر ایسے کام سے بچنا چاہئے جو دوسروں کے لئے ذہنی کوفت واذیت کا باعث ہو۔

نبی اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں مسجد نبوی اتنی زیادہ کشادہ نہیں تھی، عام طور سے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم محنت پیشہ تھے، اور موٹے کپڑے پہنتے تھے، گرمی کے موسم میں جب پسینہ آتا تو کپڑے پسینے سے تر ہو جاتے، اور جمعہ کے اجتماع میں اس پسینے کی وجہ سے بو پیدا ہو جانے کا اندیشہ تھا، آں حضرت ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو تاکید فرمائی کہ جمعہ کے روز سب حضرات غسل کر کے، حتی الامکان صاف کپڑے پہن کر اور خوشبو لگا کر مسجد میں آیا کریں[1] اب ظاہر ہے کہ طہارت کا کم سے کم تقاضا تو اس طرح بھی پورا ہو سکتا تھا کہ لوگ وضو کر کے آجایا کریں، اور ان کے کپڑے ظاہری نجاست سے پاک ہوں، لیکن نبی اکرم ﷺ نے اس پر اکتفا کرنے کے بجائے مذکورہ بالا احکام نظافت کی اہمیت کی وجہ سے عطا فرمائے، تاکہ کوئی شخص کسی دوسرے کے لئے تکلیف کا باعث نہ بنے، اس چھوٹی سی مثال ہی سے یہ بات واضح ہے کہ طہارت کے ساتھ ساتھ نظافت بھی اسلام میں مطلوب ہے، اور کوئی بھی ایسا اقدام جائز نہیں ہے، جس کی وجہ سے ماحول میں گندگی پھیلتی ہو، یہ ہر شخص کی ایسی دینی ذمہ داری ہے جس کی ادائیگی کے لئے بنیادی ضرورت توجہ کی ہے، یہ توجہ پیدا ہو جائے تو دیکھتے ہی دیکھتے ماحول سدھر جاتا

[1] مسلم، کتاب الجمعة باب الغسل ومس الطیب ...... : ۱/۲۸۰

ہے۔[1]

⑩ تکلیف کا دسواں سبب: بلا اجازت کسی کی چیز استعمال کرنا

کسی بھی شخص کی کوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر استعمال کرنا اسلام میں ممنوع ہے۔ اگر کبھی ضرورت بھی پڑے تو مالک سے اجازت لے کر اُس چیز کا استعمال کرے، بغیر اجازت کے کسی کی چیز استعمال کرنے پر حدیث میں سخت وعید آئی ہے اور اس فعل کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ چناں چہ آں حضرت ﷺ کا فرمان ہے:

"لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ يَّاْخُذَ مَالَ اَخِيْهِ بِغَيْرِ حَقٍّ، وَذٰلِكَ لِمَا حَرَّمَ اللّٰهُ مَالَ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ، وَاَنْ يَّاْخُذَ عَصَا اَخِيْهِ بِغَيْرِ طِيْبِ نَفْسِهٖ"[2]

ترجمہ: "کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کا کوئی مال ناحق طور پر لے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان کا مال مسلمان پر حرام کیا ہے، اور اس کو بھی حرام قرار دیا ہے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کی لاٹھی بھی اس کی خوش دلی کے بغیر لے۔"

اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے یہ بات بھی واضح فرما دی ہے کہ دوسرے کی کوئی چیز لینے یا استعمال کرنے کے لئے اس کا خوشی سے راضی ہونا ضروری ہے، لہٰذا اگر اجازت کسی دباؤ کے تحت یا شرما شرمی میں دے دی ہے، اور وہ دل سے اس پر راضی نہیں ہے، تو ایسی اجازت کو اجازت نہیں سمجھا جائے گا، بل کہ اس کا استعمال بھی دوسرے شخص کے لئے جائز نہیں ہوگا۔

نبی اکرم ﷺ کے ان ارشادات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم اپنے حالات کا جائزہ لیں تو نظر آئے گا کہ نہ جانے کتنے شعبوں میں ہم شعوری یا غیر شعوری طور پر

[1] ذکر و فکر: ص ۲۰۰

[2] مجمع الزوائد، باب الغصب وحرمة مال المسلم: ۴/۲۱۸ رقم الحدیث: ۶۸۵۹

ان احکام کی خلاف ورزی کر رہے ہیں، ہم چوری اور غصب بس یہی سمجھتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کے گھر میں چھپ کر داخل ہو اور اس کا سامان چرائے، یا طاقت کا باقاعدہ استعمال کر کے اس کا مال چھینے، حالاں کہ کسی کی مرضی کے خلاف اس کی ملکیت کا استعمال، کسی بھی صورت میں ہو، وہ چوری یا غصب کے گناہ میں داخل ہے، اس قسم کی چوری اور غصب کی جو مختلف صورتیں ہمارے معاشرے میں عام ہوگئی ہیں، اور اچھے خاصے پڑھے لکھے اور بظاہر مہذب افراد بھی ان میں مبتلا ہیں، ان کا شمار مشکل ہے جن سے بچنا انتہائی ضروری ہے، تاہم مثال کے طور پر اس کی چند صورتیں درج ذیل ہیں:

۱ آج یہ بات بڑے فخر سے بیان کی جاتی ہے کہ ہم اپنا سامان ریل یا جہاز میں کرایہ دیئے بغیر نکال لائے، حالاں کہ اگر یہ کام متعلقہ افسروں کی آنکھ بچا کر کیا گیا تو اس میں اور چوری میں کوئی فرق نہیں، اور اگر ان کی رضا مندی سے کیا گیا، جب کہ وہ اجازت دینے کے مجاز نہ تھے، تو ان کا بھی اس گناہ میں شریک ہونا لازم آیا، ہاں اگر کسی افسر کو ریلوے یا ایئر لائنز کی طرف سے یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ زیادہ سامان بغیر کرائے کے چھوڑ دے، تو اس کی گنجائش ہے۔

۲ ٹیلی فون ایکسچینج کے کسی ملازم سے دوستی گانٹھ (لگا) کر دوسرے شہروں میں فون پر مفت بات چیت نہ صرف یہ کہ کوئی عیب نہیں سمجھی جاتی، بل کہ اسے اپنے وسیع تعلقات کا ثبوت قرار دے کر فخریہ بیان کیا جاتا ہے، حالاں کہ یہ بھی ایک گھٹیا درجے کی چوری ہے، اور اس کے گناہ عظیم ہونے میں کوئی شک نہیں۔

۳ بجلی کے سرکاری کھمبے سے کنکشن لے کر مفت بجلی کا استعمال چوری کی ایک اور قسم ہے، جس کا رواج بھی عام ہوتا جا رہا ہے، اور یہ گناہ بھی ڈنکے کی چوٹ کیا جاتا ہے۔

۴ ہم کسی شخص سے اس کی کوئی چیز مانگتے ہیں جب کہ ہمیں غالب گمان یہ ہے کہ

وہ زبان سے تو انکار نہیں کر سکے گا، لیکن دینے پر دل سے راضی بھی نہ ہوگا، اور دے گا تو محض شرما شرمی اور بادلِ نخواستہ دے گا، تو یہ بھی غصب میں داخل ہے، اور ایسی چیز کا استعمال حلال نہیں، کیوں کہ دینے والے نے خوش دلی کے بجائے وہ چیز دباؤ میں آ کر دی ہے۔

۵ کسی شخص سے کوئی چیز عارضی استعمال کے لئے لی گئی اور وعدہ کر لیا گیا کہ فلاں وقت لوٹا دی جائے گی، لیکن وقت پر لوٹانے کے بجائے اسے کسی عذر کے بغیر اپنے استعمال میں باقی رکھا تو اس میں وعدہ خلافی کا بھی گناہ ہے، اور اگر وہ مقررہ وقت کے بعد اس کے استعمال پر دل سے راضی نہ ہو تو غصب کا گناہ بھی ہے۔ یہی حال قرض کا ہے کہ واپسی کی مقررہ تاریخ کے بعد قرض واپس نہ کرنا (جب کہ کوئی شدید عذر نہ ہو) وعدہ خلافی اور غصب دونوں گناہوں کا مجموعہ ہے۔

۶ کسی شخص سے کوئی مکان، زمین یا دوکان ایک خاص وقت تک کے لئے کرائے پر لی گئی، تو وقت گزر جانے کے بعد مالک کی اجازت کے بغیر اسے اپنے استعمال میں رکھنا بھی اسی وعدہ خلافی اور غصب میں داخل ہے۔

۷ عارضی لی ہوئی چیز کو ایسی بے دردی سے استعمال کیا جائے جس پر مالک راضی نہ ہو، تو یہ بھی غصب کی مذکورہ تعریف میں داخل ہے، مثلاً کسی شخص نے اگر اپنی گاڑی دوسرے کو استعمال کرنے کی اجازت دے دی ہے، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس کے ساتھ "مالِ مفت دلِ بے رحم" کا معاملہ کرے، اور اسے خراب راستوں پر اس طرح دوڑاتا پھرے کہ اس کے سارے پرزے پناہ مانگنے لگیں، اگر کسی نے اپنا فون استعمال کرنے کی اجازت دی ہے تو اس کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اس پر طویل فاصلے کی کالیں دیر دیر تک کرتے رہنا یقیناً غصب میں داخل اور حرام ہے۔

۸ بک اسٹالوں میں کتابیں، رسالے اور اخبارات اس لئے رکھے جاتے ہیں کہ ان میں سے جو پسند ہوں، لوگ انہیں خرید سکیں، پسند کے تعین کے لئے ان کی

معمولی ورق گردانی کی بھی عام طور سے اجازت ہوتی ہے، لیکن اگر بک اسٹال پر کھڑے ہوکر کتابوں، اخبارات یا رسالوں کا باقاعدہ مطالعہ شروع کردیا جائے، جب کہ خریدنے کی نیت نہ ہو، تو یہ بھی ان کا غاصبانہ استعمال ہے، جس کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔

یہ چند سرسری مثالیں ہیں جو بے ساختہ قلم پر آگئیں، مقصد یہ ہے کہ ہم سب مل کر سوچیں کہ ہم کہاں کہاں چوری اور غصب کے گھٹیا جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔[1]

(۱۱) تکلیف کا گیارہواں سبب: کسی ادارے کی طرف سے میسر سہولیات کا غلط استعمال

تکلیف کا یہ سبب تمام اسباب سے اہم ہے کیوں کہ اس سے ایک فرد نہیں بل کہ ایک مکمل ادارہ متاثر ہوتا ہے۔ اگر ادارے نے اپنے کسی ملازم کو کوئی سہولت فراہم کی ہے اور وہ اپنی اس سہولت کو ادارے کی اطلاع کے بغیر کسی غیر متعلقہ شخص کو منتقل کر رہا ہے تو یہ بددیانتی اور جھوٹ میں شامل ہے۔ اور معاشرے میں اسے ہمدردی اور صلہ رحمی کے طور پر جانا جاتا ہے حالاں کہ یہ جرم ہے۔

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں:

ایک صاحب ایک مرتبہ مجھ سے اپنے ایک پڑوسی کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بتا رہے تھے کہ ان کے آپس میں کتنے خوشگوار تعلقات ہیں، اور وہ کس طرح ایک دوسرے سے اپنائیت اور ''حسن سلوک'' کا معاملہ کرتے رہتے ہیں، اس ''حسنِ سلوک'' کی تفصیل بیان کرتے ہوئے وہ کہنے لگے کہ ''میرے پڑوسی جس محکمے میں کام کرتے ہیں وہ اپنے ملازمین کو ان کی ذاتی گاڑی کے لئے بہت سی سہولیات فراہم کرتا ہے، (مثلاً پیٹرول کا خرچ، سروس اور مرمت وغیرہ کا خرچ) میرے پڑوسی

[1] ذکر و فکر: ص ۱۲۲ تا ۱۲۵

کے پاس چوں کہ اپنی کوئی گاڑی نہیں تھی، اس لئے وہ یہ سہولیات حاصل نہیں کرسکتے تھے، میں نے اپنی گاڑی ان کے نام رجسٹر کرادی، اور انہوں نے اپنے محکمے میں اسے اپنی گاڑی ظاہر کرکے وہ سہولیات حاصل کرلیں، مدتوں میری گاڑی ان کے نام پر درج رہی، اور وہ اس کے نام پر سالہا سال یہ سہولیات حاصل کرتے رہے، میں نے ان سے پوچھا کہ ''آپ نے ایسا کیوں کیا؟''

وہ فرمانے لگے کہ ''ہمارے درمیان تعلقات ہی ایسے تھے'' مجھے یقین تھا کہ گاڑی ان کے نام رجسٹر ہونے کے باوجود وہ میرے ہی استعمال میں رہے گی، اور کبھی ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہوگا، لہٰذا اگر صرف نام درج کرانے سے کسی کا بھلا ہوتا ہو تو میں کیوں اس میں رکاوٹ بنوں؟''

ایک اور صاحب نے ایک مرتبہ اپنے ایک دوست کے ساتھ ''حسنِ سلوک'' کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ''ہمارے درمیان اتنے اچھے تعلقات ہیں کہ جب وہ خود یا ان کے گھر کا کوئی فرد بیمار ہوتا ہے تو میں ڈاکٹر سے اپنے نام کا نسخہ بنوا کر اپنے محکمے کے خرچ پر دوائیں لے آتا ہوں، اور اپنے دوست کو فراہم کردیتا ہوں، اور اس طرح علاج معالجے پر میرے دوست کا کبھی کچھ خرچ نہیں ہوتا۔''

دونوں صاحبان نے اپنا یہ عمل بڑے فخر کے ساتھ اس طرح بیان کیا جیسے یہ ان کی کشادہ دلی اور بلند حوصلگی کی علامت ہے، اور اس کے ذریعے انہوں نے بہت بڑی نیکی انجام دی ہے جس پر وہ دنیا میں تعریف اور آخرت میں ثواب کے مستحق ہیں، یہ دونوں میں سے کسی نے نہیں سوچا کہ اس طرح اپنے پڑوسی یا دوست کے ساتھ ''ہمدردی'' کرکے وہ محکمے کے ساتھ کتنی بے وفائی اور بددیانتی کا معاملہ کر رہے ہیں، اس ''ہمدردی'' کا آغاز تو جھوٹ بولنے سے ہوا، یعنی پہلے صاحب نے اپنی کار خلاف واقعہ اپنے پڑوسی کے نام درج کرا کے غلط بیانی سے کام لیا، بل کہ غلط بیانیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع کرادیا، کیوں کہ ہر مہینے وہ صاحب اپنی اس فرضی گاڑی

کے لئے پیٹرول کے فرضی بل داخل کرتے تھے۔

جن میں سے ہر فرضی بل ایک مستقل جھوٹ تھا، اسی طرح اس فرضی گاڑی کی سروس اور مرمت کے بھی اسی طرح فرضی بل بنائے جاتے ہوں گے، کیوں کہ گاڑی تو بدستور پہلے صاحب ہی کے استعمال میں تھی، اس طرح اس ہمدرد کی بدولت وہ سالہا سال تک جھوٹ کا یہ پلندہ اپنے نامۂ اعمال میں درج کراتے رہے، اسی طرح دوسرے صاحب اپنے دوست کی بیماری کے موقع پر خود اپنے آپ کو بیمار ظاہر کرنے کے لئے اپنے لئے فرضی نسخے بنواتے رہے، اور ڈاکٹر صاحب کو بھی اس غلط بیانی میں ملوث کرتے رہے۔

دوسری طرف محکمہ نے اگر کوئی سہولت اپنے کسی کارندے کو دے رکھی ہے تو وہ اپنے ملازم کو دی ہے، جو کچھ قواعد وضوابط کی پابند ہے، نہ کسی شخص کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی یہ سہولت کسی اور کو منتقل کردے، اور نہ یہ جائز ہے کہ قواعد وضوابط کے خلاف جس طرح چاہے وہ سہولت حاصل کرلے، لہٰذا دونوں صاحبان نے جو سہولتیں اپنے پڑوسی یا دوست کو دلوائیں، وہ ان کے لئے سراسر حرام اور ناجائز تھیں، لیکن دونوں کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی کہ اس طرح وہ کسی جرم یا گناہ کا ارتکاب کررہے ہیں، اس کے برعکس وہ اسے اپنی نیکیوں میں شمار کررہے تھے۔

یہ دو واقعات تو مثال کے طور پر ذکر کردیئے گئے، ورنہ اپنے گردوپیش میں نظر دوڑا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ہمارا معاشرہ اس قسم کے واقعات سے بھرا ہوا ہے، کوئی سرکاری یا غیر سرکاری محکمہ اپنے ملازمین کو جو سہولیات دیتا ہے، بعض لوگ انہیں ہر قیمت پر اپنے حق میں نچوڑنے کی کوشش کرتے ہیں، خواہ اس کے لئے جھوٹ سچ ایک کرنا پڑے، یا قواعد وضوابط توڑنے پڑیں، یا کسی اور بدعنوانی کا ارتکاب کرنا پڑے، مثلاً بعض محکموں میں یہ قاعدہ ہے کہ وہ اپنے ملازمین کو گاڑی میں استعمال کرنے کے لئے ایک خاص حد تک پیٹرول کی قیمت مہیا کرتے ہیں۔

اب بعض لوگ ہر مہینے اتنے پیٹرول کے بل داخل کرکے یہ رقم ہر حال میں وصول کرنا ضروری سمجھتے ہیں خواہ واقعۃً اس مہینے میں اتنا پیٹرول استعمال ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، اسی طرح بعض ملازمین کو محکمے کی طرف سے اجازت ہوتی ہے کہ وہ ایک خاص ماہانہ کرایہ کی حد تک کوئی مکان اپنی رہائش کے لئے لے سکتے ہیں، اب خواہ مکان کم کرائے پر ملا ہو، لیکن وہ زائد کرائے کا بل بنوا کر پوری رقم وصول کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اسی طرح بعض مرتبہ مکان کی مرمت یا دیکھ بھال (Maintenance) کا خرچ محکمہ برداشت کرتا ہے، چناں چہ بعض لوگ مرمت کے فرضی بل بنوا کر یہ رقمیں وصول کرتے رہتے ہیں، یہی معاملہ علاج معالجے کے اخراجات کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ خواہ واقعۃً کسی علاج کی ضرورت نہ پڑی ہو، لیکن جعلی بل بنوا کر علاج کا خرچ وصول کرلیا جاتا ہے۔

یہ تمام صورتیں بڑی گھٹیا قسم کی بددیانتی میں شامل ہیں، اس سلسلے میں ایک اہم شرعی اصول کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے جو بہت کم حضرات کو معلوم ہوتا ہے، اس لئے بعض اوقات اچھے خاصے دیانت دار حضرات بھی غیر شعوری طور پر اس قسم کی بددیانتی میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

وہ اصول یہ ہے کہ کسی چیز کی ملکیت اور چیز ہے، اور استعمال کی اجازت اور چیز، جو چیز اپنی ملکیت میں آجائے اسے تو انسان جس طرح چاہے استعمال کرسکتا ہے خواہ خود اس سے فائدہ اٹھائے یا کسی اور کو عارضی یا مستقل استعمال کے لئے دے دے اس پر کوئی پابندی نہیں لیکن جو چیز اپنی ملکیت میں نہ ہو بلکہ مالک نے اسے استعمال کرنے کا حق یا اس کی اجازت دی ہو (جسے اسلامی فقہ میں "اباحت" سے تعبیر کیا گیا ہے) اس پر ہر طرح کے مالکانہ حقوق حاصل نہیں ہوتے، اس اجازت کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی ضرورت کی حد تک اسے جس قدر استعمال کرنا چاہے کرلے۔

لیکن اسے یہ اجازت نہیں ہوتی کہ وہ مالک کی اجازت کے بغیر اپنا یہ حق کسی اور کو منتقل کر دے یا دوسروں کو دعوت دے کہ اس سے فائدہ اٹھانے میں وہ بھی اس کے ساتھ شریک ہو جائیں نیز اسے یہ بھی حق نہیں ہوتا کہ اگر کسی وجہ سے وہ خود اس اجازت سے فائدہ نہیں اٹھا سکا تو اس کی قیمت وصول کرے۔

اس کی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے ہمارے گھر کھانا پکا کر بھیج دیا تو یہ کھانا ہماری ملکیت ہے، خواہ ہم اسے خود کھائیں یا کسی اور کو تحفہ بھیج دیں، یا صدقہ کر دیں، بل کہ جائز یہ بھی ہے کہ کسی کو بیچ کر اس کی قیمت وصول کر لیں، لیکن اگر کسی شخص نے اپنے گھر میں ہماری دعوت کی تو جو کھانا وہاں موجود ہے وہ ہماری ملکیت نہیں، البتہ مالک کی طرف سے اجازت ہے کہ ہم اپنی ضرورت یا خواہش کے مطابق جتنا چاہیں کھا لیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس اجازت کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس کھانے پر اپنے مالکانہ حقوق جتلانے لگیں، لہٰذا یہ جائز نہیں ہے کہ ہم مالک کی مرضی کے بغیر اس پر کسی اور کو دعوت دینے لگیں، اسی طرح اگر کوئی شخص دعوت کا کھانا اپنے ساتھ باندھ کر گھر لے جانے لگے تو اسے کتنا گھٹیا آدمی سمجھا جائے گا، اور اس سے بھی زیادہ گھٹیا اور شرم ناک بات یہ ہوگی کہ کوئی شخص اگر خود کسی وجہ سے کھانا نہ کھا سکا تو میزبان سے یہ مطالبہ کرے کہ میرے کھانے کے پیسے ادا کر دو۔

بالکل یہی صورت ملازمت سے حاصل ہونے والی سہولیات کی بھی ہے، جہاں تک نقد تنخواہ کا تعلق ہے وہ ملازم کی ملکیت ہے، اسے وہ جس طرح چاہے استعمال کر سکتا ہے یا جو الاؤنس کی رقمیں یکمشت محکمے کی طرف سے ادا کر دی جاتی ہیں اور ان کی وصولیابی کے لئے بل پیش کرنے نہیں پڑتے ان کا بھی یہی حکم ہے، لیکن جو دوسری سہولیات ملازم کو فراہم کی جاتی ہیں مثلاً پیٹرول، علاج معالجے اور کرائے وغیرہ کے بلوں کی ادائیگی، وہ محکمے کی طرف سے ایک اجازت ہے، لہٰذا اس کا مطالبہ

اسی حد تک جائز اور درست ہے جس حد تک اس اجازت سے واقعی فائدہ اٹھایا گیا ہے اس سے زیادہ نہیں، اس فائدے میں اپنے کسی عزیز، دوست یا پڑوسی کو شریک کرنا بھی جائز نہیں۔

اسی طرح اگر خود کو اس اجازت سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت پیش نہیں آئی یا اس کا موقع نہیں ملا تو اس کا غلط بل پیش کر کے پیسے وصول کرنا بھی سراسر ناجائز ہے اور اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے کہ کوئی شخص دعوت میں شریک نہ ہو اور داعی (دعوت دینے والے) کے پاس اس وقت کے کھانے کا بل بھیج دے کہ میں چوں کہ دعوت سے فائدہ نہیں اٹھا سکا اس لئے یہ بل تم ادا کرو۔

ظاہر ہے کہ کوئی گھٹیا سے گھٹیا آدمی بھی ایسی حرکت نہیں کرے گا، مذکورہ سہولیات سے فائدہ اٹھائے بغیر ان کا بل محکمے کو بھیج دینا بھی ایسی ہی شرم ناک حرکت ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کی برائی عام طور سے محسوس نہیں کی جاتی، بل کہ اسے اپنا حق سمجھا جاتا ہے، حالاں کہ اس میں جھوٹ اور فریب کا گناہ بھی ہے، اور دوسرے کا مال ناحق کھانے کا گناہ بھی۔[1]

⑫ تکلیف کا بارہواں سبب: عدمِ تعاون

تعاون ایک ایسی چیز ہے جس کے بغیر معاشرے کا ترقی کرنا ناممکن ہے اور انسانی حیات و اجتماعی معاملات میں تعاون ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہے۔ ہم معاشرے کے اندر ایک دوسرے سے تعاون کر کے ہی دوسروں کو تکلیف سے بچا سکتے ہیں۔

یونین کے ساتھ تعاون:

فلیٹ میں رہتے ہوئے متعلقہ یونین کو مینٹیننس وقت پر ادا کرنا چاہئے۔ اپنی ذمہ داری کو وقت پر پورا کرنا بھی تعاون کی ایک شکل ہے۔ اور وقت سے ٹال دینا اور

---

[1] ذکر و فکر: ص ۱۴۶ تا ۱۵۱

بلا عذر کے تاخیر کرنا تکلیف کے زُمرے میں آتا ہے۔ جب مکین اور رہائشی یونین کے ساتھ تعاون کریں گے تو یونین بھی ان کے مسائل کے حل میں دل چسپی لے گی اور حاصل شدہ فنڈ استعمال کرے گی۔ اسی طرح اگر بیت الخلا لیک ہو رہا ہو تو اُسے بھی فوراً ٹھیک کروانا چاہئے، کیوں کہ اس پانی سے تکلیف پہنچانے کے ساتھ ساتھ ناپاکی اور گندگی پھیلانے کا جرم بھی ہو رہا ہے۔

متعلقہ یونین کو بھی چاہئے کہ وہ مکینوں کے اجتماعی و انفرادی مسائل کا خیال رکھے۔ اگر کسی مکین کو کوئی تکلیف ہے جس کا حل یونین کے ذمے ہے تو یونین کا فرض بنتا ہے کہ اُس مسئلے کو فوراً حل کروائے ورنہ یونین کو تکلیف دینے کا گناہ ہوگا۔

یقیناً ایک دوسرے کے ساتھ تعاون ہی تکلیف سے بچنے کا واحد ذریعہ ہے عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ایک جانب سے بھی عدمِ تعاون دونوں کو تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے۔

شاگرد کے ساتھ تعاون:

استاذ پڑھانے سے پہلے نیت کرے ایسی نیت جس کو عزمِ مصمم (پکا ارادہ) کہتے ہیں کہ ”میں اپنے قول، فعل سے کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا“ اس نیت و ارادے کے ساتھ ساتھ دعا بھی کرتا رہے کہ اے اللہ! مجھے ایسا مسلمان بنا دے جس کے ہاتھ اور زبان سے لوگ محفوظ رہیں۔

ایک استاذ شاگرد کے ساتھ کس طرح تعاون کر سکتا ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہیں۔

۱ استاذ اس بات کا خیال رکھے کہ اُس کے کسی عمل سے کسی شاگرد کو تکلیف نہ ہو۔

۲ شاگردوں پر بلاوجہ ذہنی بوجھ نہ ڈالے۔

۳ سمجھانے کا رویہ نرم اور ڈھنگ مہذبانہ اپنائے۔

۴ تمام شاگردوں کے درمیان انصاف سے برتاؤ کرے۔

۵ خوش کلامی اختیار کرے اور بدکلامی سے بچے۔

۶ شاگردوں سے عبادات کی پابندی کروائے۔

اسی طرح شاگرد بھی اساتذہ کے ساتھ تعاون کریں۔ ان کی بات مانیں ان کا احترام کریں۔ علم کے حصول کے لئے کارآمد اور فائدہ مند اصول اپنائے اور ضرر رساں امور سے اجتناب کرے۔

۱۳ تکلیف کا تیرہواں سبب: دیواروں پر چاکنگ

مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں: ہمارے معاشرے میں دیواروں پر اشتہارات نعرے اور اعلانات لکھنے یا چسپاں کرنے کا رواج اس قدر تشویش ناک حد تک بڑھ گیا ہے کہ اسے دیکھ کر شرم محسوس ہوتی ہے، میں نے دنیا کے تقریباً چالیس ملک دیکھے ہیں، لیکن برِ صغیر کے سوا کہیں دیواری تحریروں کا یہ طوفان دیکھنے میں نہیں آیا جو ہمارے ملک میں تیزی سے بڑھتا ہی جا رہا ہے، ملک بھر میں شاید ہی کچھ خوش قسمت دیواریں ایسی ہوں جہاں کوئی نہ کوئی تحریر درج نہ ہو، ورنہ ملک بھر میں تقریباً ہر قابلِ ذکر دیوار پر کچھ نہ کچھ لکھا یا چپکا ہوا ضرور ملتا ہے۔

ڈاکٹروں اور حکیموں کے اشتہارات، سیاسی اور مذہبی جلسوں کے اعلانات، چندے اور قربانی کی کھالوں کی اپیلیں، سیاسی اور مذہبی جلسوں کے اعلانات، سیاسی لیڈروں کی تعریف یا مذمت، انقلاب لانے کے پُرجوش ارادے، انتخابی امیدواروں کی قابلیت اور خدمات کا تعارف، انتخابی منشوروں کے اہم نکات، سیاسی قائدین کے دعوے اور وعدے، حکومت اور مخالفین کو دھمکیاں، کارخانوں اور محکموں میں ہونے والی زیادتیوں کے خلاف احتجاج، یہاں تک کہ ذاتی مخالفین کے خلاف گالی گفتار،

غرض دنیا بھر کی باتیں دیواروں پر درج ہوتی ہیں، اور ایسا لگتا ہے کہ ملک کی دیواریں اپنے مکینوں کو تحفظ دینے کے لئے نہیں، بل کہ "آزادیٔ تحریر" کا مظاہرہ کرنے کے لئے بنی ہیں، اور ہر دیوار ایک ایسا مفت نوٹس بورڈ ہے جس کے استعمال کی نہ کوئی فیس ہے، نہ اس کے لئے کسی اجازت کی ضرورت ہے، اور نہ اس پر سنسر کی کوئی پابندی ہے، بل کہ لوگوں کو صلائے عام ہے کہ وہ جب چاہیں، جو چاہیں اور جتنی بھدی تحریر میں چاہیں اس مفت نوٹس بورڈ پر اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لئے لکھ جائیں اور کسی ہلدی پھٹکری (خرچ) کے بغیر اپنی پبلسٹی کو حیاتِ دوام عطا کردیں، کیوں کہ جو بات اس نوٹس بورڈ پر لکھ دی گئی وہ ایسا "نوشتۂ دیوار" بن گئی کہ وقت گزر جانے کے بعد بھی اس کی آب وتاب میں فرق نہیں آتا۔

چناں چہ الیکشن میں جن خادمانِ قوم کی ضمانتیں ضبط ہوئے بھی زمانہ گزر گیا، ان کے "واحد نمائندہ" ہونے کی گواہی آج بھی دیواروں پر ثبت ہے، جن جلسوں کو حاضرین کی کمی کی وجہ سے خرد برد (ناکام) ہوئے بھی مدتیں بیت گئیں، ان کے "تاریخی اجتماع" ہونے کی شہادت آج بھی "ریکارڈ" پر ہے، جو معالج حضرات اپنے اعمال کا حساب دینے کے لئے اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ چکے، ان کی مسیحائی (مہارت) کا تذکرہ آج بھی زندہ وجاوید ہے، غرض اس نوٹس بورڈ پر لگے ہوئے اعلانات کے لئے کوئی مدت مقرر نہیں، جب تک ان کی تحریر اپنی عمرِ طبعی کو نہ پہنچ جائے یا دیوار کا مالک اس پر چونا سفیدی کراکر کسی دوسرے اعلان کے لئے جگہ صاف نہ کردے وہ ہر دور میں تازہ اور سدا بہار رہتے ہیں۔

دیواری تحریروں کے اس اندھا دھند استعمال سے پوری قوم کی تہذیب اور شائستگی کے بارے میں جو برا اثر قائم ہوتا ہے، وہ تو اپنی جگہ ہے ہی، لیکن اس بات کا احساس بہت کم لوگوں کو ہے کہ یہ عمل دینی اعتبار سے ایک بڑا گناہ بھی ہے جو چوری کے گناہ میں داخل ہے، ظاہر ہے کہ اکثر وبیشتر یہ تحریریں ایسی دیواروں پر لکھی جاتی

ہیں جو لکھنے والے کی ملکیت میں نہیں ہوتی اور نہ دیوار کا مالک اس بات پر راضی ہوتا ہے کہ اس کی عمارت پر یہ مینا کاری کی جائے، لہٰذا عموماً یہ تحریریں مالک کی مرضی کے بغیر، بل کہ اس کی شدید ناراضگی کے باوجود لکھی جاتی ہیں اور اس طرح دوسرے کی ملکیت کو ناجائز طور پر اپنے کام کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

تکلیف کے دسویں سبب میں نبی اکرم ﷺ کے وہ ارشادات گزر چکے ہیں جن میں آپ ﷺ نے دوسرے کی چیز کو اس کی خوش دلی کے بغیر استعمال کرنے کی سخت ممانعت فرمائی ہے اور اس کو حرام قرار دیا ہے، لیکن چوں کہ دین کو ہم نے صرف نماز روزے کی حد تک محدود کر کے رکھ دیا ہے، اس لئے یہ کام کرتے وقت ہمیں یہ خیال نہیں آتا کہ ہم کتنے بڑے گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں؟

جن گناہوں کا معاملہ براہ راست اللہ تعالیٰ اور بندے کے باہمی تعلق سے ہے اور اس میں کسی دوسرے کے حق کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا، ان کا حال تو یہ ہے کہ جب کبھی انسان کو ندامت ہو، اور سچی توبہ کی توفیق ہو جائے، وہ معاف ہو جاتے ہیں، لیکن جن گناہوں کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اور ان کے ذریعے کسی بندے کا حق پامال کیا گیا ہے، وہ صرف توبہ سے معاف نہیں ہوتے، جب تک متعلقہ حق دار معاف نہ کرے۔

لہٰذا ہم اعلان واشتہار کے جوش میں اللہ تعالیٰ کے جن جن بندوں کا حق پامال کر کے ان کی املاک میں ناجائز تصرف کرتے ہیں، جب تک وہ سب معاف نہ کریں اس گناہ کی معافی ممکن نہیں۔

جو حکم دیواروں پر تحریر لکھنے کا ہے، وہی پوسٹر چپکانے کا بھی ہے، اگر قرائن سے اندازہ ہو کہ دیوار کا مالک اپنی دیوار پر پوسٹر چسپاں کرنے کو پسند نہیں کرے گا تو اس دیوار پر اشتہار لگانا بھی شرعاً جائز نہیں ہے، ہاں اگر کوئی جگہ اعلانات اور اشتہارات ہی کے لئے مخصوص ہے، جیسے مساجد میں یا بعض عوامی مقامات پر اس کا انتظام کیا

جاتا ہے، یا کسی دیوار کے مالک سے اجازت لے لی گئی ہے، یا اس بات کا یقین ہے کہ وہ پوسٹر چسپاں کرنے کی بخوشی اجازت دے دے گا تو بے شک بات دوسری ہے۔

حدیث کی کتابوں میں یہ واقعہ مشہور و معروف ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ کو شہر میں چلتے ہوئے تیمم کرنے کی ضرورت پیش آگئی[۱] آپ ﷺ نے ایک قریبی دیوار پر جا کر تیمم فرمایا، اس واقعے پر بحث کرتے ہوئے علماء و فقہاء نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ آپ ﷺ نے کسی دوسرے شخص کی دیوار سے تیمم کیسے فرما لیا؟ پھر اس کا جواب دیا ہے کہ تیمم کرنے سے دیوار کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، اور یہ بات واضح تھی کہ کوئی بھی شخص اپنی دیوار سے تیمم کرنے کو منع نہیں کر سکتا۔ اس لئے آپ ﷺ نے اجازت لینے کی ضرورت نہیں سمجھی، یہ جواب تو اپنی جگہ ہے، لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب تیمم جیسے بے ضرر کام کے بارے میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہے تو دیواروں کو جان بوجھ کر خراب کرنے کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے؟

یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ معاشرے میں ان دیواری تحریروں کا اتنا رواج عام اور لوگوں کا اس سے منع نہ کرنا اس بات کی علامت ہے کہ لوگ اپنی دیواروں کے اس استعمال پر راضی ہو گئے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ لوگ راضی نہیں بل کہ بے بس ہیں، حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں: ہمارے ایک دوست نے اپنے مکان کی چار دیواری پر تازہ تازہ رنگ کرایا تو کچھ صاحبان اس نادر موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے اسی دن پہنچ گئے، اور اس صاف شفاف دیوار پر اپنی خوشنویسی کا مظاہرہ شروع کر دیا، ہمارے دوست نے ان سے التجا کی کہ یہ دیوار آج ہی سفید ہو کر تیار ہوئی ہے، کم از کم کچھ دن کے لئے اسے معاف کر دیں، لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گھر میں پتھر آنے شروع ہو گئے، (غنیمت ہوا کہ گولیاں نہیں آئیں) انھوں نے سوچا کہ

[۱] مسلم، باب التیمم: ۱۶۱/۱

گھر والوں کے زخمی ہونے اور شیشوں کے ٹوٹنے سے بہتر ہے، کہ دیوار کی بدزیبی گوارا کر لی جائے، چناں چہ وہ چپ ہو کر بیٹھ گئے، اور ''نوشتۂ دیوار'' پڑھ لیا۔

ظاہر ہے کہ اگر ان حالات میں لوگ چپ رہیں تو ان کی خاموشی کو رضا مندی سمجھنا ان پر دوہرا ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟[۱]

⑭ تکلیف کا چودھواں سبب: بے موقع سلام کرنا

سلام کرنا مسلمانوں اور اسلام کی پہچان ہے اور شعائر اسلام میں سے بھی ہے لیکن بعض مواقع اور مقامات ایسے ہوتے ہیں جہاں سلام نہ کرنا بہتر ہوتا ہے، اگر اس موقع پر سلام کر لیا تو ''السلام علیکم'' جو ایک دعائیہ کلمہ ہے اس کی بے ادبی ہو جاتی ہے۔ یا آپ کا سلام کسی کی تکلیف کا سبب بن جاتا ہے۔

ذیل میں مختصراً وہ مواقع ذکر کیے جاتے ہیں جہاں سلام کرنا جائز نہیں۔

① تلاوت قرآن کے وقت سلام کرنا:

بعض اوقات انسان کو پتا بھی نہیں چلتا کہ میں زبان سے تکلیف پہنچا رہا ہوں، بل کہ وہ سمجھتا ہے کہ میں تو ثواب کا کام کر رہا ہوں، لیکن حقیقت میں وہ گناہ کا کام کر رہا ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ دوسرے کو تکلیف پہنچاتا ہے۔

مثلاً سلام کرنا کتنی بڑی فضیلت اور ثواب کا کام ہے۔ لیکن شریعت نے دوسرے کی تکلیف کا اتنا خیال کیا ہے کہ سلام کرنے کے بھی احکام مقرر فرما دیے کہ ہر وقت سلام کرنا جائز نہیں، بل کہ بعض مواقع پر سلام کرنے پر ثواب کے بجائے گناہ ہوگا۔ کیوں کہ سلام کے ذریعہ تم نے دوسرے کو تکلیف پہنچائی ہے۔

مثلاً ایک شخص قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول ہے، اس کو سلام کرنا جائز نہیں۔ اس لئے کہ ایک طرف تو تمہارے سلام کی وجہ سے اس کی تلاوت میں خلل

[۱] ذکر و فکر: ص ۱۲۷، ۱۳۱

ہوگا اور دوسری طرف اس کو تلاوت چھوڑ کر تمہاری طرف مشغول ہونے میں تکلیف ہوگی۔ اب ایسے وقت کے اندر سلام کرنا زبان سے تکلیف پہنچانے میں داخل ہے۔

اسی طرح اگر لوگ مسجد میں بیٹھ کر ذکر میں مشغول ہوں، ان کو مسجد میں داخل ہوتے وقت سلام کرنا جائز نہیں کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا رشتہ جڑا ہوا ہے۔ ان کی زبان پر ذکر جاری ہے۔ تمہارے سلام کی وجہ سے ان کے ذکر میں خلل واقع ہوگا، اور اس کو توجہ ہٹانے میں تکلیف بھی ہوگی۔[1]

② بغیر سلام کے مصافحہ کرنا:

آج کل مصافحوں کا بہت زور ہے، سلام کریں یا نہ کریں مصافحہ ضرور کیا جاتا ہے، اس سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے۔ بزرگوں سے مصافحہ کرنے کو بڑے ادب کی بات سمجھا جاتا ہے، اس کے لئے نجانے کیا کیا گناہ کئے جاتے ہیں، اس کو کہنی ماری، اُس کو کہنی ماری، ادھر دھکا دیا، اس کی گردن پھلانگی اور مصافحہ کے لئے پہنچ گئے، یہ سب ناجائز ہے، بے شک بزرگوں سے مصافحہ کرنا برکت کی چیز ہے اور مستحب بھی ہے لیکن اس کے بھی آداب ہیں، ان کا خیال از حد ضروری ہے۔ آج کل ان آداب کا عام طور پر خیال نہیں رکھا جاتا۔

بڑے بھائی کا ایک دل چسپ واقعہ:

حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب فرماتے ہیں: میرے بڑے بھائی صاحب (ذکی کیفی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ) جن کا اب انتقال ہوگیا ہے۔ ایک مرتبہ اپنا واقعہ سنانے لگے۔ فرمایا کہ بہت دیر سے بس کے انتظار میں کھڑا تھا ہجوم بہت زیادہ تھا، کافی دیر کے بعد مطلوبہ بس آگئی، تیزی سے اس کی طرف بڑھنے لگے تو پیچھے سے کسی نے نام

[1] اصلاحی خطبات: ۱۲۴/۸

لے کر آواز دی، پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس نے کہا اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ (صرف سلام اور مصافحہ کرنا مقصود تھا) ان سے سلام کرنے کی دیر میں بس نکل گئی۔ بتایئے ایسے شخص کے سلام کا جواب دیا جائے یا اُسے تھپڑ مارا جائے۔[1]

بعض جگہ سلام کرنا مکروہ ہے:

فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ بہت سے مواقع ایسے ہیں، جہاں سلام کرنا مکروہ ہے مثلاً کوئی شخص کھانا کھا رہا ہے تو اُسے سلام نہ کیا جائے، کوئی چیز پی رہا ہے تو سلام مت کرو، کسی کا وعظ اور تقریر سن رہا ہے تو سلام نہ کرو۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب کسی مجلس میں پہنچتے ہیں تو سب سے پہلے سلام کرتے ہیں اور پھر ہر ایک سے مصافحہ کرتے ہیں، یہ غلط طریقہ ہے کہ اس سے گویا اتنی دیر تک مجلس کو بے کار اور معطل کر دیا۔

سلام کی وجہ سے فرض نماز ٹوٹ گئی:

حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب فرماتے ہیں: ”میرے ساتھ ایک مرتبہ یہ قصہ پیش آیا کہ میرے ذمہ سجدۂ سہو تھا۔ میں نے آخری رکعت میں تشہد کے بعد سلام پھیرا تو ایک صاحب نے وہیں سے ہاتھ پکڑ کر سلام کر ڈالا، بے خیالی میں میں نے بھی وعلیکم السلام کہہ دیا۔ اب نماز بھی گئی، دوبارہ چار رکعت پڑھنی پڑی۔ اس کا تو مصافحہ ہوا، میری چار رکعت فرض نماز چلی گئی۔[2]“

مصافحہ کے آداب

مصافحہ کے بھی آداب ہیں اگر ایک شخص مصروف ہے اور اس کے دونوں ہاتھ مصروف ہیں تو اس سے مصافحہ نہ کیا جائے، اگر تم مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دو گے تو

[1] اصلاحی تقریریں: ۷۵/۳
[2] اصلاحی تقریریں: ۷۷/۳

وہ بے چارہ کس طرح جواب دے گا، اسی طرح اگر کوئی نماز کے لئے جا رہا ہے اور جماعت کھڑی ہو چکی ہے تو اس سے بھی مصافحہ نہیں کرنا چاہئے، میرے ساتھ ایسا ہوتا رہتا ہے کہ جماعت کھڑی ہو گئی، میں مسجد کی طرف جا رہا ہوں، کسی نے دیکھا، تو بجائے مسجد جانے کے میری طرف آگیا اور سلام کر کے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے، ایسے موقعوں پر میں مصافحہ نہیں کرتا تاکہ اُسے معلوم ہو کہ یہ وقت مصافحہ کرنے کا نہیں۔ اسی طرح اور کوئی شخص کسی اور جلدی میں جا رہا ہے تو اسے سلام تو کر لیا جائے لیکن مصافحہ نہ کیا جائے کیوں کہ سلام کرنے میں اس کا کوئی مستقل وقت خرچ نہیں ہوتا لیکن مصافحہ کرنے میں اُسے تکلیف اور اذیت پہنچے گی۔

مجلس کے دوران سلام کرنا:

فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ ایک شخص دوسرے لوگوں سے کوئی لمبی بات کر رہا ہے۔ اور دوسرے لوگ توجہ سے اس کی بات سن رہے ہیں اگر چہ وہ دنیاوی باتیں ہوں اس حالت میں بھی اس مجلس میں جا کر سلام کرنا جائز نہیں۔ اس لئے کہ وہ لوگ باتیں سننے میں مصروف تھے۔ آپ نے سلام کے ذریعہ ان کی باتوں میں خلل ڈال دیا اور جس کی وجہ سے باتوں کے درمیان میں بدمزگی پیدا ہو گئی اس لئے اس موقع پر سلام کرنا جائز نہیں۔ اس لئے حکم ہے کہ جب تم کسی مجلس میں شرکت کے لئے جاؤ اور وہاں پر بات شروع ہو چکی ہو تو وہاں پر سلام کے بغیر بیٹھ جاؤ، اس وقت سلام کرنا زبان سے تکلیف پہنچانے کے مترادف ہوگا۔ اس سے اندازہ لگایئے کہ شریعت اس بارے میں کتنی حساس ہے کہ دوسرے شخص کو ہماری ذات سے ادنیٰ تکلیف نہ پہنچے۔

کھانا کھانے والے کو سلام کرنا:

ایک شخص کھانا کھانے میں مشغول ہے، اس وقت اس کو سلام کرنا حرام تو نہیں۔ البتہ مکروہ ضرور ہے جب یہ اندیشہ ہو کہ تمہارے سلام کے نتیجے میں اس کو تشویش

ہوگی۔ اب دیکھئے کہ وہ تو کھانا کھانے میں مشغول ہے، نہ تو وہ عبادت کر رہا ہے، نہ ذکر کرنے میں مشغول ہے، اگر تم سلام کر لو گے تو اس پر پہاڑ نہیں ٹوٹ پڑے گا۔ لیکن سلام کے نتیجے میں اس کو تشویش ہونے اور اس کو ناگوار ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے اس وقت سلام نہ کرے۔

اس طرح ایک شخص اپنے کسی کام کے لئے تیزی سے جا رہا ہے، آپ کو اندازہ ہوا کہ یہ شخص بہت جلدی میں ہے، آپ نے آگے بڑھ کر اس کو سلام کر لیا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ اس لئے کہ آپ کو اس کی تیزی سے اندازہ لگانا چاہئے تھا کہ یہ شخص جلدی میں ہے یہ سلام کرنے اور مصافحہ کرنے کا مناسب وقت نہیں ہے۔ ایسے وقت میں اس کو سلام نہ کرو، بل کہ اس کو جانے دو۔ یہ سب باتیں زبان کے ذریعہ تکلیف پہنچانے میں داخل ہیں۔[1]

⑮ تکلیف کا پندرہواں سبب: گالم گلوچ وفحش گوئی

حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

"اَلْمُسْتَبَّانِ مَا قَالَا فَعَلَى الْبَادِئُ مَالَمْ يَعْتَدِ الْمَظْلُوْمُ."[2]

تَرْجَمَۃ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

دو آدمی جو آپس میں ایک دوسرے کو گالیاں دیں سب کا وبال اسی پر ہوگا جس نے گالیاں دینے میں پہل کی ہے جب تک کہ مظلوم زیادتی نہ کرے۔"

زبان کے گناہوں میں گالی دینا بھی ہے یہ ایک ایسی بری چیز ہے جو کسی طرح سے بھی مؤمن کے شایان شان نہیں ہے، ایک حدیث میں ارشاد ہے: "سِبَابُ

[1] اصلاحی خطبات: ۱۲۵/۸

[2] مسلم، کتاب البر والصلة، باب النهی عن السباب: ۳۲۱/۲

الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُهُ كُفْرٌ[1] یعنی مسلمان کو گالی دینا بڑی گناہ گاری کی بات ہے اور اس سے جنگ کرنا کفر کی چیز ہے۔

بہت سے مردوں اور عورتوں کو گالی دینے کی عادت ہوتی ہے اور بعض لوگ تو اس کو بڑا کمال سمجھتے ہیں حالاں کہ یہ جہالت اور جاہلیت کی بات ہے، اس میں سخت گناہ بھی ہے اور اس کی وجہ سے آپس میں تعلقات بھی خراب ہوتے ہیں اور گالی گلوچ کرتے کرتے مردوں تک پہنچ جاتے ہیں ایک نے کسی کو گالی دی دوسرے نے اس کے باپ کو گالی دی پھر پہلے والے نے جواب میں باپ کے ساتھ دادا کو بھی لپیٹ لیا، اسی طرح سے اپنے ماں باپ کو گالیاں دلوانے کا ذریعہ بھی بن جاتے ہیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا: بڑے بڑے گناہوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالی دے، صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا کوئی شخص اپنے ماں باپ کو بھی گالی دے گا؟ آپ نے فرمایا ہاں! کسی آدمی کے باپ کو گالی دے گا تو وہ اس کے باپ کو گالی دے گا؟ اور کسی کی ماں کو گالی دے گا تو وہ اس کی ماں کو گالی دے گا۔[2]

فائدہ: لفظ "سب" کا ترجمہ جگہ جگہ ہم نے گالی سے کیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ فحش بازاری گالی دی جائے وہی گالی ہے بل کہ کسی کو کسی بھی طرح برے لفظوں سے یاد کرنا گالی میں شامل ہے۔ خوب سمجھ لیں اگر ماں، بہن کی گالی نہ دی بل کہ بے ہودہ، گدھا، کمینہ کہہ دیا یہ بھی ان احادیث کے مفہوم میں آجاتا ہے۔ جن میں سب وشتم کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔

(16) تکلیف کا سولہواں سبب: کسی کو ذہنی تکلیف میں ڈالنا

جس طرح کسی کو جسمانی تکلیف پہنچانا حرام اور گناہ ہے اسی طرح کسی کو ذہنی

[1] بخاری، کتاب الأدب، باب ما ینھی من السباب: ۸۹۳/۲
[2] مسلم، کتاب الایمان، باب الکبائر: ۶۴/۱، رقم: ۲۶۳

تکلیف دینا بھی حرام اور گناہ ہے، بل کہ جسمانی تکلیف سے بڑھ کر گناہ ہے۔ کیوں کہ بسا اوقات ذہنی تکلیف سے انسان کے تمام امور معطل ہو کر رہ جاتے ہیں اور وہ انسان کوئی کام نہیں کر پاتا اور ایک لامحدود سوچ و بچار میں مبتلا ہو جاتا ہے، جس سے اُس کی صحت پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔

بسا اوقات کسی کمزور انسان کو اتنی زیادہ ذہنی تکلیف پہنچتی ہے کہ وہ ذہنی طور پر وہمی ہو جاتا ہے اور آئندہ کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے ایک مسلمان جس طرح یہ چاہتا ہے کہ اُس سے کسی کو جسمانی تکلیف نہ پہنچے اسی طرح اُسے اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ اُس سے کسی کو ذہنی تکلیف بھی نہ پہنچے جو کہ جسمانی تکلیف سے کہیں بڑھ کر ہے۔

بسا اوقات انسان کو معلوم نہیں ہوتا دوسرے انسان سے معاملات میں یا باتوں باتوں میں ایسی بات کہہ دیتا ہے کہ سننے والے کا دل جل جاتا ہے، کسی سے کوئی معاملہ کرتے وقت ایسا رویہ اختیار کیا جاتا ہے جیسے دوسرے کا اس معاملے میں کوئی حق نہیں۔

یاد رکھنا چاہئے کہ اپنے ذہن، اپنی سوچ اور اپنی عادات جن کا اختیار کرنا شرعی اعتبار سے لازمی نہ ہو ان کو دوسروں پر یا اپنے ماتحتوں پر زبردستی مسلط کرنا بھی ذہنی تکلیف کے زمرے میں آتا ہے۔

ذہنی تکلیف میں مبتلا کرنا حرام ہے:

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ ......" کی حدیث میں زبان اور ہاتھ کے ذریعہ ظاہری افعال کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ لیکن اگر آپ نے اپنی زبان یا ہاتھ سے کوئی ایسا کام کیا جس سے دوسرے کو ذہنی تکلیف ہوئی تو وہ اس حدیث میں داخل ہے۔ مثلاً آپ نے کسی سے قرض لیا اور

اس سے یہ وعدہ کرلیا کہ اتنے دنوں کے اندر ادائیگی کردوں گا۔ اب اگر آپ وقت پر ادائیگی نہیں کرسکتے تو اس کو بتادیں کہ میں فی الحال ادائیگی نہیں کرسکتا۔ اتنے دن کے بعد ادا کروں گا۔ پھر بھی ادا نہ کرسکو تو پھر بتادو۔ لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے کہ آپ اس کو لٹکادیں۔ اور اس کا ذہن الجھادیں۔ وہ بے چارہ انتظار میں ہے کہ آپ آج قرض دیں گے یا کل دے دیں گے۔ لیکن آپ نہ تو اس کو اطلاع دیتے ہیں۔ اور نہ قرض واپس کرتے ہیں، اس طرح آپ نے اس کو ذہنی اذیت اور تکلیف میں مبتلا کردیا۔ اب وہ نہ تو کوئی پلان بناسکتا ہے، نہ وہ کوئی منصوبہ بندی کرسکتا ہے۔ اس لئے کہ اس کو پتہ ہی نہیں ہے کہ اس کو قرض واپس ملے گا یا نہیں؟ اگر ملے گا تو کب تک ملے گا۔ آپ کا یہ طرز عمل بھی ناجائز اور حرام ہے۔[1]

ملازم پر ذہنی بوجھ ڈالنا:

حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے فرمایا: آپ کا ایک نوکر اور ملازم ہے، اب آپ نے چار کام ایک ساتھ بتادیئے کہ پہلے یہ کام کرو۔ پھر یہ کام، پھر یہ کام کرنا، پھر یہ کام کرنا۔ اس طرح آپ نے چار کاموں کو یاد رکھنے کا بوجھ اس کے ذہن پر ڈال دیا، اگر ایسا کرنا بہت ضروری نہیں ہے تو ایک ساتھ چار کاموں کا بوجھ اس کے ذہن پر نہیں ڈالنا چاہئے، بل کہ اس کو پہلے ایک کام بتادو۔ جب وہ پہلا کام کرچکے تو اب دوسرا کام بتایا جائے، وہ اس کو کرچکے تو پھر تیسرا کام بتایا جائے۔ چناں چہ خود اپنا طریقہ بتایا کہ میں اپنے نوکر کو ایک وقت میں ایک کام بتاتا ہوں۔ اور دوسرے کام جو اس سے کرانے ہیں ان کو یاد رکھنے کا بوجھ اپنے سر پر رکھتا ہوں۔ نوکر کے سر پر نہیں رکھتا، تاکہ وہ ذہنی بوجھ میں مبتلا نہ ہوجائے، جب وہ ایک کام کرکے فارغ ہوجاتا ہے تو پھر دوسرا کام بتاتا ہوں۔

[1] اصلاحی خطبات: ۸/۱۳۶

اس سے اندازہ لگایئے کہ حضرت والا کی نگاہ کتنی دور رس تھی۔[1]

یا مثلاً آپ گھر والوں کو بتاکر چلے گئے کہ فلاں وقت آکر کھانا کھاؤں گا۔ لیکن اس کے بعد اطلاع کئے بغیر کہیں اور چلے گئے کھانا بھی وہیں کھالیا اور وہاں پر گھنٹوں گزار دیئے اور وقت پر گھر واپس نہیں پہنچے۔ اور گھر پر آپ کی بیوی کھانے پر آپ کا انتظار کررہی ہے۔ اور پریشان ہورہی ہے کہ کیا وجہ پیش آگئی کہ واپس نہیں آئے، کھانا لئے بیٹھی ہے۔ آپ کا یہ عمل گناہ کبیرہ ہے اس لئے کہ آپ نے اس عمل کے ذریعہ ایک ایسی ذات کو تکلیف پہنچائی جس کو اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات سے وابستہ کردیا تھا۔ آپ کو اگر کھانا کسی اور جگہ کھانا تھا تو آپ اس کو اطلاع کرکے اس کے ذہن کو فارغ کردیتے۔ اس کو انتظار اور پریشانی کی تکلیف میں مبتلا نہ کرتے۔ لیکن آج ہم لوگ اس بات کا دھیان نہیں کرتے، اور یہ سوچتے ہیں کہ وہ تو ہماری بیوی ہی تو ہے، ہماری ماتحت ہے۔ اگر انتظار کررہی ہے تو کرے حالاں کہ یہ عمل گناہ کبیرہ اور حرام ہے اور ایذاءِ مسلم ہے۔[2]

تکلیف سے بچاؤ کا چھٹا راستہ

جھوٹ سے پرہیز:

① جھوٹ کا پہلا وبال: فرشتوں کی نفرت:

"وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا كَذَبَ الْعَبْدُ تَبَاعَدَ عَنْهُ الْمَلَكُ مِيْلًا مِنْ نَتْنِ مَاجَآءَ بِهٖ."[3]

[1] اصلاحی خطبات: ۸/۱۳۳ [2] اصلاحی خطبات: ۸/۱۰۹

[3] ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الصدق والكذب: ۲/۱۸، رقم ۱۹۷۲

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ اس کی بات کی بدبو کی وجہ سے ایک میل دور چلا جاتا ہے۔''

اس حدیث سے جھوٹ کی سخت مذمت معلوم ہوئی اور پتہ چلا کہ فرشتوں کو جھوٹ سے بہت زیادہ نفرت ہے اور ان کو جھوٹ سے بھی گھن آتی ہے کہ جوں ہی کسی کے منہ سے جھوٹ نکلتا ہے فرشتہ وہاں سے چل دیتا ہے اور ایک میل تک دور چلا جاتا ہے، واضح رہے کہ اس سے اعمال لکھنے والے فرشتوں کے علاوہ دوسرے فرشتے مراد ہیں۔ ناگواری اور نفرت تو سبھی فرشتوں کو ہوتی ہے لیکن جو فرشتے اعمال لکھنے پر مامور ہیں وہ مجبوراً ناگواری کو برداشت کرتے ہیں۔ اللہ کی پیاری مخلوق کو تکلیف پہنچانا کتنا برا عمل ہے اس کو خود سمجھ لیں اور جو جھوٹ کا گناہ ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔[1]

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''تم سچ کو لازم پکڑو کیوں کہ سچ نیکی کی راہ دکھاتا ہے اور نیکی جنت کی راہ دکھاتی ہے۔ اور انسان سچ بولتا رہتا ہے اور سچ بولنے کا خوب دھیان رکھتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے نزدیک صدیق (یعنی بہت سچائی والا) لکھ دیا جاتا ہے۔ (پھر فرمایا کہ) جھوٹ سے بچو۔ کیوں کہ جھوٹ فجور (یعنی گناہوں میں گھس جانے کی) راہ بتاتا ہے۔ اور فجور دوزخ کی راہ دکھاتا ہے۔ انسان برابر جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ بولنے کا دھیان رکھتا ہے۔ (یعنی جھوٹ جان بوجھ کر بولتا ہے اور جھوٹ کے مواقع سوچتا رہتا ہے) یہاں تک کہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔[2]

لہٰذا مؤمن بندوں پر لازم ہے کہ ہمیشہ سچ بولیں اور سچ ہی کو اختیار کریں،

---

[1] زبان کی حفاظت: ص۴۳

[2] مسلم، كتاب البر والصلة، باب قبح الكذب: ٢/٣٢٦، رقم: ٦٦٣٧

بچوں کو بھی سچ ہی سکھلائیں اور سچ ہی کی عادت ڈالیں ان کے بہلانے کے لئے بھی جو وعدہ کریں وہ وعدہ بھی سچا ہونا چاہئے۔ جیسا کہ آئندہ حدیث میں اس پر تنبیہ آرہی ہے، البتہ جن مواضع میں جھوٹ کی گنجائش حدیث میں اصلاح کرانے کے لئے جھوٹ بولنا (ایک فریق کی جانب سے دوسرے فریق کو اچھی بات پہنچانا اگرچہ اس نے کہی ہی نہ ہو)۔ اور جیسے ضدی بیوی کو راضی کرنے کے لئے وعدہ کر لینا وغیرہ وغیرہ۔[1]

② جھوٹ کا دوسرا وبال: گناہ کبیرہ کا ارتکاب

''قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْكَبَائِرُ اَلْإِشْرَاكُ بِاللّٰهِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَالْيَمِيْنُ الْغَمُوْسُ وفي رواية أنس وَشَهَادَةُ الزُّوْرِ بَدَلَ الْيَمِيْنِ الْغَمُوْسِ۔''[2]

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بڑے بڑے گناہ یہ ہیں۔

① اللہ کے ساتھ شرک کرنا۔ ② ماں باپ کو ستانا۔ ③ کسی جان کو قتل کرنا۔ اور ④ جھوٹی قسم کھانا اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں جھوٹی قسم کے بجائے جھوٹی گواہی کا ذکر ہے۔''

کبیرہ گناہ تو بہت سے ہیں لیکن اس حدیث میں چند ایسے گناہ ذکر فرمائے جو بہت بڑے ہیں اور جن میں عام طور سے لوگ مبتلا رہتے ہیں چوں کہ اس موقع پر ہم زبان کی آفتیں ذکر کر رہے ہیں اس لئے یہ حدیثیں جھوٹی قسم کی مناسبت سے یہاں نقل کی ہیں۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا سب سے بڑا گناہ ہے جس کی کبھی بھی بخشش نہیں ہے...... والدین کی نافرمانی اور ان کو ستانا اور تکلیف دینا بھی بڑے

---

[1] زبان کی حفاظت: ص۴۳

[2] بخاری: كتاب الأيمان والنذور، باب اليمين الغموس: ٢/٩٨٧، رقم: ٦٦٧٥

گناہوں میں ہے اور اس حدیث میں اس کو شرک کے بعد ذکر فرمایا ہے جس سے اس کی قباحت خوب ظاہر ہو رہی ہے۔

جھوٹی قسم کا تعلق گزشتہ زمانہ کے واقعات سے ہوتا ہے۔ جو کوئی واقعہ ہوا نہ ہو اس کے بارے میں کہہ دیا کہ ایسا ہوا اور اس پر قسم کھالی اور کسی نے کوئی کام نہیں کیا اس کے بارے میں کہہ دیا کہ اس نے ایسا کیا ہے اور اس پر قسم کھالی، اسی طرح اپنے کسی فعل کے کرنے یا نہ کرنے پر جھوٹی قسم کھالی یہ بہت بڑا گناہ ہے، اوّل تو جھوٹ پھر اوپر سے جھوٹی قسم یعنی اللہ کے نام کو جھوٹ کے لئے استعمال کرنا گناہ در گناہ ہو جاتا ہے۔

بہت سے مرد اور عورت جھوٹی قسم سے بالکل پرہیز نہیں کرتے، بات بات میں قسم کھائے چلے جاتے ہیں اور اس کا گناہ اور وبال جو دنیا اور آخرت میں ہے اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ بعض لوگوں میں تیری میری برائی کرنے کی عادت ہوتی ہے خواہ مخواہ لڑائی جھگڑوں میں اپنے آپ کو پھنساتے ہیں پھر جب کوئی موقع آتا ہے تو مکر جاتے ہیں اور صاف انکار کر دیتے ہیں کہ میں نے نہیں کہا۔ بہت سے لوگ مال بیچتے وقت جھوٹی قسم کھاتے ہیں کہ یہ اتنے کا لیا ہے اور اتنے کا پڑا ہے اور بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی چیز کے بارے میں جھوٹی قسم کھا جاتے ہیں کہ یہ میری ہے حالاں کہ ان کی نہیں ہوتی، یہ سب باتیں اس لئے سرزد ہوتی ہیں کہ آخرت کی پیشی کا خیال نہیں ہوتا۔[1]

③ جھوٹ کا تیسرا وبال: مال سے برکت کا خاتمہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اَلْحَلْفُ مَنْفَقَةٌ لِلسِّلْعَةِ مَمْحَقَةٌ لِلْبَرَكَةِ" "قسم مال کو بکوا دیتی

[1] زبان کی حفاظت: ص ۵۵

ہے۔ (اور) برکت کو ختم کر دیتی ہے۔"[1]

④ جھوٹ کا چوتھا وبال: اللہ تعالیٰ کی ناراضگی

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو شخص کسی مسلمان کے مال پر قبضہ کرنے کے لئے جھوٹی قسم کھاتا ہے تو یہ شخص اللہ تعالیٰ کے دربار میں اس طرح حاضر ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس سے سخت ناراض ہوں گے۔"[2]

ایک اور حدیث میں حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: "جو شخص کسی مسلمان کا حق دبانے کے لئے جھوٹی قسم کھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت حرام فرماتے ہیں اور جہنم اس کے لئے واجب کر دیتے ہیں۔" کسی شخص نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! اگرچہ وہ معمولی سی چیز ہو جس کی وجہ سے وہ قسم کھاتا ہے؟ پیارے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ہاں! اگرچہ وہ پیلو (لکڑی) کی مسواک ہی کیوں نہ ہو۔"[3]

⑤ جھوٹ کا پانچواں وبال: جھوٹی گواہی کا ارتکاب

تیسرا بڑا گناہ جو حدیث بالا میں مذکور ہے وہ جھوٹی گواہی دینا ہے جس طرح اپنا مال بیچنے یا دوسرے کا حق مارنے کے لئے جھوٹی قسم کھانا حرام ہے اسی طرح کسی دوسرے کو کسی کا مال ناحق دلانے کے لئے یا مقدمہ جتانے کے لئے یا کسی بھی وجہ سے جھوٹی گواہی دینا حرام ہے۔

بہت سے لوگ کسی کی دوستی میں یا رشتہ داری کے تعلقات کی وجہ سے جھوٹی گواہی دے دیتے ہیں۔ جھوٹی گواہی خود بڑا گناہ ہے پھر اس کے ساتھ حاکم قسم بھی

[1] ابوداؤد، کتاب البیوع، باب کراهية اليمين في البيع: ۱۱۸/۲، رقم: ۳۳۳۵
[2] ابن ماجه، ابواب الأحكام، باب من حلف على يمين فاجرة: ۱۶۸/۲
[3] حوالہ مذکورہ

کھلواتا ہے۔ اس لئے گناہ در گناہ ہوتا ہے۔ اور حرام پر حرام ہوتا چلا جاتا ہے۔ تعجب ہے لوگ دنیا کے تعلقات اور رشتہ داری کو دیکھتے ہیں اور آخرت کے عذاب کی طرف دھیان نہیں کرتے، بہت سے لوگوں نے تو جھوٹی گواہی کو پیشہ ہی بنا رکھا ہے، پولیس اور وکیل الفاظ رٹا دیتے ہیں اور اسی وقت نقد گواہی دے کر نقد دام لے آتے ہیں، ان کا یہ پیشہ حرام ہے اور آمدنی بھی حرام ہے حرام کے ذریعہ حرام کماتے ہیں۔ اس میں بعض بڑے بڑے آدمی مبتلا ہیں۔

⑥ جھوٹ کا چھٹا وبال: وعدہ خلافی کا ارتکاب

بعض کام ایسے ہیں جن کو لوگ زبان کے ذریعہ تکلیف دینے کے اندر شمار نہیں کرتے، حالاں کہ وہ کام زبان سے تکلیف دینے کے حکم میں داخل ہیں، مثلاً وعدہ خلافی کرنا۔ آپ نے کسی سے یہ وعدہ کر لیا کہ فلاں وقت آپ کے پاس آؤں گا یا فلاں وقت میں آپ کا کام کر دوں گا لیکن وقت پر وعدہ پورا نہیں کیا۔ جس کے نتیجے میں اس کو تکلیف پہنچی، اس میں ایک طرف تو وعدہ خلافی کا گناہ ہوا۔ دوسری طرف دوسرے شخص کو تکلیف پہنچانے کا بھی گناہ ہوا یہ زبان سے تکلیف پہنچانے کے حکم میں داخل ہے۔

⑦ جھوٹ کا ساتواں وبال: منافقت کی علامت

"قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اٰيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ. اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ."[1]

تَرْجَمَہ: "حضرت ابو ہریرہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے کہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: "منافق کی تین نشانیاں ہیں ① جب بات

[1] بخاري، كتاب الإيمان، باب علامات المنافق: ١/١٠ رقم: ٣٣

کرے تو جھوٹ بولے۔ ② جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے۔ ③ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔"

حضرت انس رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے بیان فرمایا: بہت کم ایسا ہوا کہ حضور اقدس صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ہم کو خطبہ دیا ہو اور یہ نہ فرمایا ہو "لَاۤ اِيْمَانَ لِمَنْ لَّاۤ اَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ" (یعنی اس کا کوئی ایمان نہیں جو امانت دار نہیں اور اس کا کوئی دین نہیں جو عہد کا پورا کرنے والا نہیں۔[1]

اور حضرت عبداللہ بن عمر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: "جس میں چار خصلتیں ہوں گی خالص منافق ہوگا۔ اور جس میں ان میں سے ایک خصلت ہو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی جب تک کہ اس کو چھوڑ نہ دے۔ (وہ چار خصلتیں ہیں)۔ ① جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ ② جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ ③ وعدہ کرے تو دھوکہ دے۔ ④ جھگڑا کرے تو گالی بکے۔[2]

قرض خواہ کو تکلیف پہنچانا

بہت سے لوگ وقتی ضرورت کے لئے دوکاندار سے ادھار لے لیتے ہیں، یا کسی سے نقد رقم قرض لے لیتے ہیں۔ بعد میں قرض دینے والے کو ستاتے ہیں، وعدہ پر وعدہ کئے جاتے ہیں لیکن قرض کی ادائیگی نہیں کرتے۔ دوسرے کا مال بھی لیا اور اس کو وعدہ خلافی کے ذریعہ ایذا بھی دے رہے ہیں، ہر شخص کو یہ سوچنا چاہئے کہ میں اس کی جگہ ہوتا تو اپنے لئے کیا پسند کرتا، جو اپنے لئے پسند کرے وہی دوسرے کے لئے پسند کرنا لازم ہے۔

جس شخص کے پاس قرض کی ادائیگی کے لئے مال موجود نہ ہو وہ قرض خواہ سے

[1] مسند احمد: ٣/١٣٥، رقم: ١١٩٧٥

[2] بخاري، كتاب الايمان، باب علامات المنافق: ١/١٠، رقم: ٣٤

معذرت کرے اور مہلت مانگے اور اس تاریخ پر ادائیگی کا وعدہ کرے جس وقت کہ اس کے پاس ہونے کا غالب گمان ہو اور جس کے پاس مال موجود ہو فوراً قرض خواہ کا حق ادا کرے ٹال مٹول بالکل نہ کرے۔ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے "مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ"[1] یعنی جس کے پاس مال موجود ہو اس کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔

اس حدیث میں ان لوگوں کو تنبیہ فرمائی ہے جو ادائیگی کا انتظام ہوتے ہوئے صاحب حق کو آج کل پر ٹالتے رہتے ہیں، پیسہ ہوتے ہوئے جھوٹے وعدہ کرنے والے کو حضور ﷺ نے ظالم قرار دیا ہے۔

عموماً پیشہ ور لوگ وعدے کرنے میں بہت ماہر ہوتے ہیں۔ وہ یہ جانتے ہوئے کام لے لیتے ہیں کہ جس وقت پر دینے کا وعدہ کر رہا ہوں اس وقت نہیں دے سکوں گا۔ کام لے کر رکھتے ہیں اور جھوٹے وعدے کرتے رہتے ہیں۔ جن کا کام لیا ہے جب وہ آتے ہیں اور تقاضا کرتے ہیں، تو صبح شام اور آج کل کے جھوٹے وعدوں کی کثرت سے بے چارے کی جان آفت میں کر دیتے ہیں، اس جھوٹ اور وعدہ خلافی کو کاریگر اور پیشہ ور لوگ گویا کہ گناہ سمجھتے ہی نہیں۔ حالاں کہ حضور اقدس ﷺ نے اس کو منافقت کی نشانی بتایا ہے، بعض پیشہ وروں کے جھوٹ کا تذکرہ احادیث شریف میں بھی آیا ہے۔ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے:

"اَكْذَبُ النَّاسِ الصَّبَّاغُوْنَ وَالصَّوَّاغُوْنَ"[2]

یعنی لوگوں میں سب سے جھوٹے رنگ کا کام کرنے والے اور سنار کا کام کرنے والے ہیں (کیوں کہ وعدے اور ٹال مٹول بہت کرتے ہیں)۔

رنگ ریز اور سنار کے علاوہ درزی، لوہار، بڑھئی حتیٰ کہ کتابت کرنے والے اور پریس چلانے والے بھی آج کل وعدہ خلافیوں کی انتہاء کر دیتے ہیں۔

[1] بخاری، کتاب الاستقراض والدیون، باب مطل الغنی ظلم: ۱/۳۲۳، رقم: ۲۴۰۰
[2] ابن ماجہ، ابواب التجارات، باب التوقی فی التجارة ص۱۵۶

اس جھوٹ کے اختیار کرنے کا باعث بہت بڑی ناسمجھی ہے کہ اگر کام نہ لیا تو پھر کام کہاں سے آئے گا۔ حالاں کہ کاریگر کبھی فارغ نہیں رہتے کام آتا ہی رہتا ہے۔ اور اللہ روزی رساں ہے، سچ بولنے سے بھی اتنا ہی رزق ملے گا جتنا مقدر میں ہے اور اس میں برکت بھی ہوگی۔ چوں کہ پیشہ ور لوگ جھوٹ میں مبتلا رہتے ہیں اس لئے ان کے ہاں برکت نہیں دیکھی جاتی۔ خوب کماتے رہتے ہیں لیکن پیسہ جمع نہیں ہوتا۔

جس طرح جھوٹی قسم سے تجارت کی برکت جاتی رہتی ہے۔ اسی طرح جھوٹے وعدوں کی وجہ سے کاریگروں اور پیشہ وروں کی کمائی میں برکت نہیں ہوتی، تمام پیشہ ور اگر حدیث پر عمل کریں اور سچ اختیار کریں تو دنیا اور آخرت میں آرام سے رہیں۔

تکلیف سے بچاؤ کا ساتواں راستہ

لعن طعن سے پرہیز:

"قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تَلَاعَنُوْا بِلَعْنَةِ اللّٰهِ وَلَا بِغَضَبِ اللّٰهِ وَلَا بِالنَّارِ"[1]

ترجمہ: "حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے: حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک دوسرے پر اللہ کی لعنت نہ ڈالو اور آپس میں یوں نہ کہو کہ تجھ پر اللہ کا غضب نازل ہو۔ نہ آپس میں ایک دوسرے کے لئے یوں کہو کہ جہنم میں جائے اور آپس میں ایک دوسرے کے لئے یوں نہ کہو کہ آگ میں جلے۔"

اس حدیث مبارک میں یہ نصیحت فرمائی ہے کہ آپس میں ایک دوسرے پر

[1] ابوداؤد، کتاب الأدب، باب فی اللعن: ۲/۳۱۶، رقم: ۴۹۰۶

لعنت نہ کرو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہونے کی بددعا کو لعنت کہا جاتا ہے۔ کسی کو یہ کہنا کہ ملعون ہے یا لعین ہے یا مردود ہے یا اس پر اللہ کی مار ہے یا اللہ کی پھٹکار ہے، یہ سب الفاظ لعنت کے مفہوم میں داخل ہیں اور کسی پر لعنت کرنا بہت سخت بات ہے۔

لعنت اللہ کی رحمت سے دوری کا نام ہے اس لئے صرف اس شخص پر لعنت کرنا جائز ہے جو اللہ کی رحمت سے دور کرنے والے کاموں میں ملوث ہو، اور وہ کام کفر، ظلم اور جھوٹ ہیں۔

عام طور سے یوں تو کہہ سکتے ہیں کہ کافروں پر اللہ کی لعنت ہو اور جھوٹوں پر اور ظالموں پر اللہ کی لعنت ہو[1] لیکن کسی کا نام لے کر لعنت کرنا جائز نہیں ہے جب تک یہ یقین نہ ہو کہ وہ کفر پر مر گیا۔ آدمی تو آدمی، ہوا کو، جانور کو بھی لعنت کرنا جائز نہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے ہوا پر لعنت کی، آں حضرت ﷺ نے فرمایا: ہوا پر لعنت نہ کرو کیوں کہ وہ اللہ کی طرف سے ہی حکم دی ہوئی ہے۔ اور جو شخص کسی ایسی چیز پر لعنت کرے جو لعنت کے مستحق نہیں ہے تو لعنت اسی پر لوٹ آتی ہے جس نے لعنت کی۔[2]

ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ عیدالاضحیٰ یا عیدالفطر کی نماز کے لئے تشریف لے جا رہے تھے عورتوں پر آپ کا گزر ہوا۔ آپ نے فرمایا: اے عورتو! صدقہ کرو کیوں کہ مجھے دوزخ میں تم سب سے زیادہ دکھائی گئی ہو، عورتوں نے عرض کیا کیوں یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا: "تُكْثِرْنَ اللَّعْنَ وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيْرَ"، یعنی تم لعنت بہت کرتی ہو اور شوہر کی ناشکری کرتی ہو۔[3]

۱ تحاسد العلماء: ص ۱۷۸

۲ ابوداؤد، کتاب الأدب، باب في اللعن: ۲/۳۱۶، رقم: ۴۹۰۸

۳ بخاری، کتاب الحیض، باب ترك الحائض الصوم: ۱/۴۴، رقم: ۳۰۴

عورتیں لعنت بہت کرتی ہیں یعنی کوسنا، پیٹنا، برا بھلا کہنا، اور الٹی سیدھی باتیں زبان سے نکالنا یہ عورتوں کا ایک خاص مشغلہ ہے، شوہر اولاد اور بھائی، بہن، گھر، جانور چوپایہ، آگ پانی، ہر چیز کو کوستی رہتی ہیں۔ اسے آگ لگے، یہ ناس پیٹی ہے، اسے ڈھائی گھڑی کی آئے، دوموت کا لیا ہے، اس کا ناس ہو، وہ اللہ مارا ہے، اس پر پھٹکار ہو۔ اسی طرح کی ان گنت باتیں عورتوں کی زبان پر جاری رہتی ہیں، اس میں بددعا کے کلمات بھی ہوتے ہیں گالیاں بھی ہوتی ہیں۔ یہ بات اللہ کو ناپسند ہے، حضور اقدس ﷺ نے اس کو دوزخ میں داخل ہونے کا سبب بتایا۔

تکلیف سے بچاؤ کا آٹھواں راستہ

تہمت والزام تراشی سے پرہیز:

"وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: اِجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوْبِقَاتِ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا هُنَّ قَالَ الشِّرْكُ بِاللّٰهِ وَالسِّحْرُ وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَكْلُ الرِّبٰوا وَاَكْلُ مَالِ الْیَتِیْمِ وَالتَّوَلِّیْ یَوْمَ الزَّحْفِ وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْغَافِلَاتِ."[1]

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے: حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ہلاک کرنے والی سات چیزوں سے (خصوصیت اور اہتمام کے ساتھ) بچو! حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ سات ہلاک کرنے والی چیزیں کیا ہیں؟

۱ بخاری، کتاب الوصایا، باب قول اللہ تعالیٰ اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی، رقم: ۲۷۶۶

آپ ﷺ نے فرمایا: (۱) اللہ کے ساتھ شرک کرنا۔ (۲) جادو کرنا۔ (۳) اس جان کو قتل کرنا جس کا قتل اللہ نے حرام فرمایا ہاں حق کے ساتھ ہو۔ (جس کو علما اور شرعی قاضی جانتے سمجھتے ہیں) (۴) سود کھانا۔ (۵) یتیم کا مال کھانا۔ (۶) میدان جہاد سے پشت پھیر کر بھاگ جانا۔ (۷) پاک باز مؤمن عورتوں کو تہمت لگانا۔ جو (برائیوں سے) غافل ہیں۔"

اس حدیث پاک میں سات گناہ ذکر فرمائے ہیں جن کو موبقات، یعنی ہلاک کرنے والی چیزیں بتایا ہے۔ ساتویں نمبر پر پاکباز مؤمن عورتوں کو تہمت لگانے کا ذکر ہے جن کو (برائی کا) ہوش ہی نہیں، مطلب یہ ہے کہ جو عورتیں مؤمن ہیں اور عفت وعصمت والی ہیں، برائی سے بالکل غافل ہیں۔ ان کو تہمت لگانا ان بڑے بڑے گناہوں میں شامل ہے جو ہلاک کر دینے والے ہیں یعنی دوزخ میں پہنچانے والے ہیں۔ ان کو تہمت لگانا اس لئے بہت بڑا گناہ ہے کہ انہیں برائی کا دھیان تک نہیں ہے اور جنہیں زبان پر قابو نہیں مرد ہو یا عورت وہ ان بے چاریوں پر تہمتوں کے گولے پھینکتے رہتے ہیں۔ کسی ایسی عورت کو بھی تہمت لگانا کبیرہ گناہ ہے جس کا چال چلن مشکوک ہو لہٰذا پاک باز عفت شعار عورتوں کو تہمت لگانا تو بہت ہی سخت گناہ ہے۔

تہمت لگانے والے کی سزا

حضرت معاذ بن انس رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

جس نے کسی مؤمن کو منافق سے بچایا۔ (یعنی غیبت کرنے والے کی تردید کی اور جس کی غیبت ہو رہی ہو اس کی حمایت کی) تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایک فرشتہ بھیجیں گے جو حمایت کرنے والے کے گوشت کو دوزخ سے بچائے گا۔ (یعنی یہ

فرشتہ یا تو اسے دوزخ میں داخل نہ ہونے دے گا اور اگر وہ داخل ہو گیا تو اس کو عذاب نہ ہونے دے گا) اور جس کسی نے مسلمان پر کوئی تہمت لگا دی اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ کے پل پر ٹھہرائے گا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی کہی ہوئی بات سے صاف ستھرا ہو کر نکل جائے۔ [۱]

خواتین اور تہمتیں

جہاں ساس بہو میں لڑائی ہوئی جھٹ سے کہہ دیا کہ رنڈی ہے۔ سوکنیں لڑنے لگیں تو ایک نے دوسری کو زانیہ کہہ دیا۔ نند بھاوج میں لڑائی ہوئی تو کہہ دیا کہ یار گھیرے پھرتی ہے۔ کسی کو چور بتا دیا کسی کے بارے میں کہہ دیا کہ شرابی زانی ہے، اور تہمت لگانے میں ان لوگوں تک کو نہیں بخشا جاتا جن سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی بل کہ جو لوگ مر گئے دنیا سے جا چکے ان پر بھی تہمتیں دھرتے ہیں، یہ بہت خطرناک بات ہے جس کی سزا بہت سخت ہے۔

حالاں کہ حدیث میں مسلمانوں کی آبرو ریزی کو سب سے بڑا سود قرار دیا ہے نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"إِنَّ مِنْ أَرْبَى الرِّبٰو الِاسْتِطَالَةُ فِيْ عِرْضِ الْمُسْلِمِ لِغَيْرِ حَقٍّ." [۲]

ترجمہ: "حضرت سعید بن زید رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے: حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بلاشبہ سب سے بڑے سود میں سے یہ بھی ہے کہ ناحق کسی مسلمان کی آبرو (ریزی) کے بارے میں زبان دراز کی جائے۔"

سود کتنا بڑا گناہ ہے اسے سب ہی جانتے ہیں۔

---

[۱] ابوداؤد، کتاب الأدب، باب الرجل يذب عن عرض أخيه، رقم: ۴۸۸۳

[۲] ابوداؤد، کتاب الأدب، باب في الغيبة، رقم: ۴۸۷۶

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾[1]

ترجمہ: ”پھر اگر تم (اس پر عمل) نہ کرو (یعنی سود نہ چھوڑو) تو اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔“

اس مضمون کو سامنے رکھ کر اب حدیث بالا کے مضمون پر غور کریں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: سب سے بڑا سود یہ ہے کہ ناحق کسی مسلمان کی بے آبروئی کرنے کے لئے زبان دراز کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مؤمن کی آبرو بہت زیادہ ہے اور اس کی بڑی حرمت ہے، بہت سے لوگ دوسرے کا مال ناحق لینے سے تو پرہیز کرتے ہیں اور اس کو حرام سمجھتے ہیں لیکن مسلمان کی آبروریزی کرنے کو ذرا بھی گناہ نہیں سمجھتے حالاں کہ آبرو کا مرتبہ مال سے زیادہ ہے۔ مال ہاتھ کا میل ہے آنی جانی چیز ہے اس کا چلا جانا اتنی بڑی مصیبت نہیں ہے جتنی بڑی مصیبت بے آبرو ہو جانا ہے۔

اپنے عزیز اور بیوی بچوں کو تکلیف سے بچائیے

مشترک رہائش میں یہ ضروری ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ رہائش پذیر ہیں ان کو آپ سے تکلیف نہ ہو اور قریبی رشتہ دار، بیوی، بچے، بہن بھائی سب اس میں خصوصی طور پر داخل ہیں۔ آج ہم لوگ اپنے ان قریبی رشتہ داروں کو تکلیف پہنچنے کا احساس نہیں کرتے۔ بل کہ یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہمارے عمل سے بیوی کو تکلیف پہنچ رہی ہے تو پہنچا کرے۔ یہ ہماری بیوی ہی تو ہے، یا اولاد کو یا بہن بھائی کو تکلیف پہنچ رہی ہے تو پہنچا کرے۔ ہماری اولاد ہی تو ہے، ہمارے بہن بھائی تو ہیں۔ ارے اگر وہ تمہاری بہن یا تمہارا بھائی ہے تو اس نے آخر کیا خطا کر لی ہے؟ یا کوئی خاتون

[1] البقرة: ۲۷۹

تمہاری بیوی بن گئی ہے۔ یا یہ بچے تمہاری اولاد بن گئے ہیں تو انہوں نے کیا خطا کر لی ہے کہ اب ان کو تم تکلیف پہنچا رہے ہو؟ حالاں کہ حضور اقدس ﷺ کا تو یہ حال تھا کہ تہجد کے وقت صرف اس خیال سے ہر کام بہت آہستہ آہستہ کرتے کہ کہیں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی آنکھ نہ کھل جائے۔ لہٰذا جس طرح غیروں کو تکلیف پہنچانا حرام ہے۔ اسی طرح اپنے گھر والوں کو اپنے بہن بھائیوں کو اپنے بیوی بچوں کو بھی تکلیف پہنچانا حرام ہے۔[1]

تکلیف سے بچاؤ کا نواں راستہ

بغیر دباؤ کے جائز سفارش:

آج ناجائز سفارش معاشرے میں ایک لعنت بن گئی ہے۔ آج کوئی کام ناجائز سفارش کے بغیر پورا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ لوگوں نے سفارش کے احکام بھلا دیئے ہیں، شریعت کے تقاضوں کو فراموش کر دیا ہے لہٰذا جب ان احکام کی رعایتوں کے ساتھ سفارش کی جائے گی تب جائز ہوگی ورنہ نہیں۔

حاجت مند کی سفارش کر دو:

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے: نبی کریم ﷺ کی خدمت میں جب کوئی حاجت مند اپنی ضرورت لے کر آتا، اور اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے کوئی درخواست کرتا تو اس وقت آں حضرت ﷺ کی مجلس میں جو لوگ بیٹھے ہوتے تھے، آپ ﷺ ان کی طرف متوجہ ہو کر فرماتے کہ تم اس حاجت مند کی مجھ سے سفارش کر دو کہ ”آپ اس کی حاجت پوری کر دیں“ تا کہ تمہیں بھی سفارش کا اجر وثواب مل جائے۔ البتہ فیصلہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان پر وہی

[1] اصلاحی خطبات: ۸/۱۰۸

کرائے گا جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرمائیں گے۔ یعنی تمہاری سفارش کی وجہ سے کوئی غلط فیصلہ تو میں نہیں کروں گا۔ فیصلہ تو وہی کروں گا جو اللہ کی مرضی کے مطابق ہوگا۔ لیکن تم جب سفارش کرو گے تو سفارش کرنے کا ثواب تم کو بھی مل جائے گا۔ اس لئے تم سفارش کرو۔[1]

سفارش کے احکام

سفارش کرنے کے کچھ احکام ہیں، کس موقع پر سفارش کرنا جائز ہے اور کس موقع پر جائز نہیں؟ سفارش کا مطلب کیا ہے؟ سفارش کا نتیجہ کیا ہونا چاہئے؟ کس طرح سفارش کرنی چاہئے؟ یہ ساری باتیں سمجھنے کی ہیں، اور ان کے نہ سمجھنے کی وجہ سے سفارش، جو بہت اچھی چیز بھی تھی۔ فائدہ مند اور باعثِ اجر و ثواب چیز تھی۔ الٹی باعثِ گناہ بن رہی ہے۔ اور اس سے معاشرے میں فساد پھیل رہا ہے۔ اس لئے ان احکام کو سمجھنا ضروری ہے۔

① نااہل کے لئے منصب کی سفارش:

پہلی بات یہ ہے کہ سفارش ہمیشہ ایسے کام کی ہونی چاہئے جو جائز اور برحق ہو۔ کسی ناجائز کام کے لئے یا ناحق کام کے لئے سفارش کسی حالت میں بھی جائز نہیں۔ ایک شخص کے بارے میں آپ جانتے ہیں کہ وہ فلاں منصب اور فلاں عہدے کا اہل نہیں ہے۔ اور اس نے اس عہدے کے حصول کے لئے درخواست دے رکھی ہے۔ اور آپ کے پاس سفارش کے لئے آتا ہے، لیکن آپ نے صرف یہ دیکھ کر کہ یہ ضرورت مند ہے، سفارش لکھ دی کہ اس کو فلاں منصب پر فائز کر دیا جائے، یا فلاں ملازمت اس کو دے دی جائے، تو یہ سفارش ناجائز ہے۔

[1] بخاري، كتاب الأدب، باب قول الله تعالى ﴿مَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً .....﴾ رقم: ٦٠٢٧

② سفارش، شہادت اور گواہی ہے:

سفارش جس طرح اس شخص کی ضرورت پوری کرنے کا ایک ذریعہ ہے، وہاں ساتھ ساتھ ایک شہادت اور گواہی بھی ہے۔ جب آپ کسی شخص کے حق میں سفارش کرتے ہیں تو آپ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ میری نظر میں یہ شخص اس کام کے کرنے کا اہل ہے، لہٰذا میں آپ سے یہ سفارش کرتا ہوں کہ اس کو یہ کام دے دیا جائے۔ تو یہ ایک گواہی ہے، اور گواہی کے اندر اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ وہ واقعہ کے خلاف نہ ہو، اگر آپ نے اس شخص کے بارے میں لکھ دیا اور حقیقت میں وہ نااہل ہے تو گواہی حرام ہوئی۔ اور باعثِ ثواب ہونے کے بجائے الٹا باعثِ گناہ بن گئی، اور یہ ایسا گناہ ہے کہ اگر اس کی نااہلی کے باوجود آپ کی سفارش کی بنیاد پر اس کو اس عہدے پر رکھ لیا گیا، اور اپنی نااہلی کی وجہ سے اس نے لوگوں کو نقصان پہنچایا، یا کوئی غلط کام کیا۔ تو سارے نقصان اور غلط کاموں کے وبال کا ایک حصہ سفارش کرنے والے پر بھی آئے گا۔ کیوں کہ اس نااہل کے اس عہدے تک پہنچنے میں یہ سبب بنا ہے۔ لہٰذا یہ سفارش بھی ہے اور گواہی بھی ہے۔ اور ناجائز کام کے لئے سفارش کرنا اور گواہی دینا کسی طرح بھی جائز نہیں۔

③ بری سفارش گناہ ہے:

دوسری بات یہ ہے کہ سفارش ایسے کام کے لئے ہونی چاہئے جو کام شرعاً جائز ہو، لہٰذا ناجائز کام کرانے کے لئے سفارش کرنا کسی حال میں جائز نہیں۔ مثلاً آپ کا دوست کہیں افسر لگا ہوا ہے۔ اور اس کے ہاتھ میں اختیارات ہیں۔ اور آپ نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی نااہل کو بھرتی کرا دیا تو یہ جائز نہیں، بل کہ حرام ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں جہاں اچھی سفارش کو باعثِ اجر قرار دیا گیا ہے وہاں بری سفارش کو باعثِ گناہ قرار دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهُ كِفْلٌ مِّنْهَا﴾ [1]

ترجمہ: "اور جو شخص بری سفارش کرے گا تو اس سفارش کرنے والے کو بھی اس گناہ میں سے حصہ ملے گا۔"

۴ سفارش کا مقصد صرف توجہ دلانا:

یہ بات تو اہم ہے ہی، اور لوگ اعتقادی طور پر اس کو جانتے بھی ہیں کہ ناجائز سفارش نہیں کرنی چاہئے ..... لیکن اس سے بھی آگے ایک اور مسئلہ ہے۔ جس کی طرف عموماً دھیان نہیں جاتا۔ اور آج کل لوگ اس کا بالکل خیال نہیں کرتے۔ وہ یہ ہے کہ لوگ آج کل سفارش کی حقیقت نہیں سمجھتے، سفارش کی حقیقت یہ ہے کہ جس کے پاس سفارش کی جا رہی ہے اس کو صرف توجہ دلانا ہے۔ یعنی اس کے علم اور ذہن میں ایک بات نہیں ہے، آپ نے اپنی سفارش کے ذریعے یہ توجہ دلا دی کہ یہ بھی ایک موقع ہے۔ اگر تم کرنا چاہو تو کر لو، سفارش کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس پر دباؤ اور پریشر ڈالا جائے کہ وہ یہ کام ضرور کرلے، اس لئے کہ ہر انسان کے اپنے کچھ حالات ہوتے ہیں، اور اس کے کچھ قواعد اور ضوابط اور اصول ہوتے ہیں، اور وہ آدمی ان اصولوں کے تحت رہ کر کام کرنا چاہتا ہے۔ اب آپ نے سفارش کر کے اس پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا، اور دباؤ ڈال کر اس سے کام کرانا چاہا، تو یہ سفارش نہیں، زبردستی ہے، اور کسی بھی مسلمان کے اوپر زبردستی کرنا جائز نہیں، اس کا عام طور پر لوگ خیال نہیں کرتے۔

ایسے آدمی کی سفارش لے کر جائیں گے جس کے بارے میں یہ خیال ہو کہ جب اس کی سفارش جائے گی تو وہ انکار نہ کر سکے گا، یہ تو دباؤ ڈالا جا رہا ہے، اور شخصیت کا وزن ڈالا جا رہا ہے۔ یہ سفارش نہیں ہے۔

[1] النساء: ۸۵

۵ سفارش ایک مشورہ ہے:

تیسری بات یہ ہے کہ سفارش ایک مشورہ بھی ہے، دباؤ ڈالنا نہیں ہے۔ آج کل لوگ مشورہ کو نہیں سمجھتے کہ مشورہ کیا چیز ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ حضور اقدس ﷺ نے مشورہ کے بارے میں فرمایا:

"اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ" [1]

ترجمہ: "جس شخص سے مشورہ لیا جائے وہ امانت دار ہے۔"

یعنی اس کا فرض ہے کہ اپنی دیانت اور امانت کے لحاظ سے جس بات کو بہتر سے بہتر سمجھتا ہو، وہ مشورہ لینے والے کو بتا دے، یہ ہے مشورہ کا حق، اور پھر جس کو مشورہ دیا گیا ہے، وہ اس بات کا پابند نہیں ہے کہ آپ کے مشورے کو ضرور قبول کرے، اگر وہ رد بھی کر دے تو اس کو اختیار ہے، کیوں کہ مشورہ کے معنی بھی یہی ہیں کہ دوسرے کو توجہ دلا دینا، گذشتہ حدیث میں آپ نے دیکھا کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ تم مجھ سے سفارش کرو، اور یہ ضروری نہیں کہ میں تمہاری سفارش قبول بھی کرلوں، بل کہ فیصلہ میں وہی کروں گا جو اللہ تعالیٰ کی منشا کے مطابق ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر سفارش کے خلاف بھی عمل کر لیا جائے تو اس سے سفارش کی ناقدری نہیں ہوتی، آج لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صاحب! ہم نے سفارش بھی کی، اور باقاعدہ بات بھی کی لیکن فائدہ کچھ حاصل نہ ہوا۔ حقیقت میں یہ بات نہیں اس لئے کہ سفارش کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ ایک بھائی کی مدد میں میرا حصہ لگ جائے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ اس سے راضی ہو جائے۔ اب وہ مقصد حاصل ہو گیا یا نہیں؟ کام ہوا یا نہیں؟ یہ سفارش کا لازمی حصہ نہیں، اگر کام نہیں ہوا، اور اس نے آپ کی سفارش نہیں مانی، تو اس کی وجہ سے کوئی جھگڑا اور ناراضگی نہیں ہونی چاہئے۔ اور اس کو برا ماننا بھی درست نہیں۔ اس لئے کہ یہ مشورہ تھا اور مشورہ کے اندر دونوں

[1] ابوداؤد، کتاب الأدب، باب في المشورة، رقم: ۵۱۲۸

باتیں ہوتی ہیں۔

تکلیف سے بچاؤ کا دسواں راستہ

معاملات کی صفائی

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾[1]

معاملات کی صفائی —— دین کا اہم رکن:

یہ آیت دین کے ایک بہت اہم رکن سے متعلق ہے، وہ دین کا اہم رکن "معاملات کی درستی اور اس کی صفائی" ہے۔ یعنی انسان کا معاملات میں اچھا ہونا اور خوش معاملہ ہونا، یہ دین کا بہت اہم باب ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ دین کا جتنا اہم باب ہے، ہم لوگوں نے اتنا ہی اس کو اپنی زندگی سے خارج کر رکھا ہے۔ ہم نے دین کو صرف چند عبادات مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، عمرہ، وظائف اور اوراد میں منحصر کر لیا ہے، لیکن روپے پیسے کے لین دین کا جو باب ہے اس کو ہم نے بالکل آزاد چھوڑا ہوا ہے، گویا کہ دین سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ حالاں کہ اسلامی شریعت کے احکام کا جائزہ لیا جائے تو نظر آئے گا کہ عبادات سے متعلق جو احکام ہیں وہ ایک چوتھائی ہیں، اور تین چوتھائی احکام معاملات اور معاشرت سے متعلق ہیں۔

تین چوتھائی دین معاملات میں ہے:

فقہ کی ایک مشہور کتاب ہے جو ہمارے تمام مدارس میں پڑھائی جاتی ہے، اور اس کتاب کو پڑھ کر لوگ عالم بنتے ہیں۔ اس کا نام ہے "ھدایہ" اس کتاب میں

[1] النساء: ۲۹

طہارت سے لے کر میراث تک شریعت کے جتنے احکام ہیں وہ سب اس کتاب میں جمع ہیں۔ اس کتاب کی چار جلدیں ہیں، پہلی جلد عبادات سے متعلق ہے جس میں طہارت کے احکام، نماز کے احکام، زکوٰۃ، روزے اور حج کے احکام بیان کیے گئے ہیں۔ اور باقی تین جلدیں معاملات یا معاشرت کے احکام سے متعلق ہیں۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ دین کے احکام کا ایک چوتھائی حصہ عبادات سے متعلق ہے اور تین چوتھائی حصہ معاملات سے متعلق ہے۔

معاملات کی خرابی کا عبادت پر اثر:

پھر اللہ تعالیٰ نے ان معاملات کا یہ مقام رکھا ہے کہ اگر انسان روپے پیسے کے معاملات میں حلال و حرام کا، اور جائز و ناجائز کا امتیاز نہ رکھے تو عبادات پر بھی اس کا اثر یہ واقع ہوتا ہے کہ چاہے وہ عبادات ادا ہو جائیں لیکن ان کا اجر و ثواب اور ان کی قبولیت موقوف ہو جاتی ہے، دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سامنے بڑی عاجزی کا مظاہرہ کر رہے ہوتے ہیں اس حال میں کہ ان کے بال بکھرے ہوئے ہیں، گڑگڑا کر اور رو رو کر پکارتے ہیں کہ یا اللہ! میرا یہ مقصد پورا کر دیجیے، فلاں مقصد پورا کر دیجیے، بڑی عاجزی سے، الحاح و زاری کے ساتھ یہ دعائیں کر رہے ہوتے ہیں، لیکن کھانا ان کا حرام، پینا ان کا حرام، لباس ان کا حرام، اور ان کا جسم حرام آمدنی سے پرورش پایا ہوا، فَاَنّٰی یُسْتَجَابُ لَهُ الدُّعَاءُ ایسے آدمی کی دعا کیسے قبول ہو؟[1] ایسے آدمی کی دعا قبول نہیں ہوتی۔

معاملات کی تلافی بہت مشکل ہے:

دوسری جتنی عبادات ہیں، اگر ان میں کوتاہی ہو جائے تو ان کی تلافی آسان

[1] مسلم، زکوٰۃ باب بیان ان اسم الصدقة: ۳۲۶/۱

ہے مثلاً نمازیں چھوٹ گئیں، تو اب اپنی زندگی میں قضا نمازیں ادا کرلو، اور اگر زندگی میں ادا نہ کر سکے تو وصیت کر جاؤ کہ اگر میں مر جاؤں اور میری نمازیں ادا نہ ہوئی ہوں تو میرے مال میں سے اس کا فدیہ ادا کر دیا جائے اور توبہ کرلو۔ ان شاء اللہ۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں تلافی ہو جائے گی۔ لیکن اگر کسی دوسرے کا مال ناجائز طریقے پر کھا لیا تو اس کی تلافی اس وقت تک نہیں ہوگی جب تک صاحب حق معاف نہ کرے۔ چاہے تم ہزار توبہ کرتے رہو، ہزار نفلیں پڑھتے رہو۔ اس لئے معاملات کا باب بہت اہمیت رکھتا ہے۔

حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی اور معاملات:

اسی وجہ سے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے یہاں تصوف اور طریقت کی تعلیمات میں معاملات کو سب سے زیادہ اوّلیت حاصل تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ اگر مجھے اپنے مریدین میں سے کسی کے بارے میں یہ پتا چلے کہ اس نے اپنے معمولات، نوافل اور اوراد و وظائف پورے نہیں کئے تو اس کی وجہ سے رنج ہوتا ہے اور اس مرید سے کہہ دیتا ہوں کہ ان کو پورا کرلو۔ لیکن اگر کسی مرید کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ اس نے روپے پیسے کے معاملات میں گڑبڑ کی ہے تو مجھے اس مرید سے نفرت ہو جاتی ہے۔

ایک سبق آموز واقعہ:

حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے ایک مرید تھے، جن کو آپ نے خلافت بھی عطا فرما دی تھی اور ان کو بیعت اور تلقین کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ ایک مرتبہ وہ سفر کر کے حضرت والا کی خدمت میں تشریف لائے، ان کے ساتھ ان کا بچہ بھی تھا، انہوں نے آکر سلام کیا اور ملاقات کی، اور بچے کو بھی ملوایا کہ حضرت یہ میرا بچہ ہے، اس کے لئے دعا فرما دیجئے۔ حضرت والا نے بچے کے لئے دعا فرمائی، اور

پھر ویسے ہی پوچھ لیا کہ اس بچے کی عمر کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت اس کی عمر ۱۳ سال ہے، حضرت نے پوچھا کہ آپ نے ریل گاڑی کا سفر کیا ہے تو اس بچے کا آدھا ٹکٹ لیا تھا یا پورا ٹکٹ لیا تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت آدھا ٹکٹ لیا تھا۔ حضرت نے فرمایا کہ آپ نے آدھا ٹکٹ کیسے لیا جب کہ بارہ سال سے زائد عمر کے بچے کا تو پورا ٹکٹ لگتا ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ قانون تو یہی ہے کہ بارہ سال کے بعد ٹکٹ پورا لینا چاہئے، اور یہ بچہ اگرچہ ۱۳ سال کا ہے لیکن دیکھنے میں ۱۲ سال کا لگتا ہے، اس وجہ سے میں نے آدھا ٹکٹ لے لیا۔ حضرت نے فرمایا: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو تصوف اور طریقت کی ہوا بھی نہیں لگی، آپ کو ابھی تک اس بات کا احساس اور ادراک نہیں کہ بچے کو جو سفر آپ نے کرایا، یہ حرام کرایا۔ جب قانون یہ ہے کہ ۱۲ سال سے زائد عمر کے بچے کا ٹکٹ پورا لگتا ہے اور آپ نے آدھا ٹکٹ لیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے ریلوے کے آدھے ٹکٹ کے پیسے غصب کر لئے اور آپ نے چوری کر لی۔ اور جو شخص چوری اور غصب کرے ایسا شخص تصوف اور طریقت میں کوئی مقام نہیں رکھ سکتا۔ لہٰذا آج سے آپ کی خلافت اور اجازت بیعت واپس لی جاتی ہے۔ چناں چہ اس بات پر ان کی خلافت سلب فرمالی۔ حالاں کہ اپنے اوراد و وظائف میں، عبادات اور نوافل میں، تہجد اور اشراق میں، ان میں سے ہر چیز میں بالکل اپنے طریقے پر مکمل تھے، لیکن یہ غلطی کی کہ بچے کا ٹکٹ پورا نہیں لیا، صرف اس غلطی کی بناء پر خلافت سلب فرمالی۔

حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا ایک واقعہ:

حضرت والا رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کی طرف سے اپنے سارے مریدین اور متعلقین کو یہ ہدایت تھی کہ جب کبھی ریلوے میں سفر کرو، اور تمہارا سامان اس مقدار سے زائد ہو جتنا ریلوے نے تمہیں مفت لے جانے کی اجازت دی ہے، تو اس صورت

میں اپنے سامان کا وزن کراؤ اور زائد سامان کا کرایہ ادا کرو، پھر سفر کرو۔ خود حضرت والا کا اپنا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ریلوے میں سفر کے ارادے سے اسٹیشن پہنچے، گاڑی کے آنے کا وقت قریب تھا، آپ اپنا سامان لے کر اس دفتر میں پہنچے جہاں پر سامان کا وزن کرایا جاتا تھا اور جا کر لائن میں لگ گئے۔ اتفاق سے گاڑی میں ساتھ جانے والا گارڈ وہاں آگیا اور حضرت والا کو دیکھ کر پہچان لیا، اور پوچھا کہ حضرت آپ یہاں کیسے کھڑے ہیں؟ حضرت نے فرمایا کہ میں سامان کا وزن کرانے آیا ہوں۔ گارڈ نے کہا کہ آپ کو سامان وزن کرانے کی ضرورت نہیں، آپ کے لئے کوئی مسئلہ نہیں، میں آپ کے ساتھ گاڑی میں جا رہا ہوں، آپ کو زائد سامان کا کرایہ دینے کی ضرورت نہیں۔ حضرت نے پوچھا کہ تم میرے ساتھ کہاں تک جاؤ گے؟ گارڈ نے کہا کہ میں فلاں اسٹیشن تک جاؤں گا۔ حضرت نے پوچھا کہ اس اسٹیشن کے بعد کیا ہوگا؟ گارڈ نے کہا کہ اس اسٹیشن پر دوسرا گارڈ آئے گا، میں اس کو بتا دوں گا کہ یہ حضرت کا سامان ہے، اس کے بارے میں کچھ پوچھ گچھ مت کرنا۔ حضرت نے پوچھا کہ وہ گارڈ میرے ساتھ کہاں تک جائے گا؟ گارڈ نے کہا کہ وہ تو اور آگے جائے گا، اس سے پہلے ہی آپ کا اسٹیشن آجائے گا۔ حضرت نے فرمایا کہ میں تو اور آگے جاؤں گا یعنی آخرت کی طرف جاؤں گا اور اپنی قبر میں جاؤں گا، وہاں پر کونسا گارڈ میرے ساتھ جائے گا؟ جب وہاں آخرت میں مجھ سے سوال ہوگا کہ ایک سرکاری گاڑی میں سامان کا کرایہ ادا کئے بغیر جو سفر کیا اور جو چوری کی اس کا حساب دو، تو وہاں پر کونسا گارڈ میری مدد کرے گا؟

معاملات کی خرابی سے زندگی حرام:

چناں چہ وہاں یہ بات مشہور تھی کہ جب کوئی شخص ریلوے کے دفتر میں اپنے سامان کا وزن کرا رہا ہوتا تو لوگ سمجھ جاتے تھے کہ یہ شخص تھانہ بھون جانے والا ہے،

اور حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کے متعلقین میں سے ہے۔ حضرت والا کی بہت سی باتیں لوگوں نے لے کے مشہور کر دیں، لیکن یہ پہلو کہ ایک پیسہ بھی شریعت کے خلاف کسی ذریعہ سے ہمارے پاس نہ آئے، یہ پہلو نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ آج کتنے لوگ اس قسم کے معاملات کے اندر مبتلا ہیں اور ان کو خیال بھی نہیں آتا کہ ہم یہ معاملات شریعت کے خلاف اور ناجائز کر رہے ہیں۔ اگر ہم نے غلط کام کر کے چند پیسے بچا لئے تو وہ چند پیسے حرام ہوگئے، اور وہ حرام مال ہمارے دوسرے مال کے ساتھ ملنے کے نتیجے میں اس کے برے اثرات ہمارے مال میں پھیل گئے۔ پھر اسی مال سے ہم کھانا کھا رہے ہیں، اسی سے کپڑے بنا رہے ہیں، اسی سے لباس تیار ہو رہا ہے، جس کے نتیجے میں ہماری پوری زندگی حرام ہو رہی ہے۔ اور ہم چوں کہ بے حس ہوگئے ہیں، اس لئے حرام مال اور حرام آمدنی کے برے نتائج کا ہمیں ادراک بھی نہیں۔ یہ حرام مال ہماری زندگی میں کیا فساد مچا رہا ہے۔ اس کا ہمیں احساس نہیں۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ احساس عطا فرماتے ہیں، ان کو پتا لگتا ہے کہ حرام چیز کیا ہوتی ہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کا چند مشکوک لقمے کھانا:

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی جو حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کے جلیل القدر استاذ تھے، اور دار العلوم دیوبند کے صدر مدرس تھے، وہ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ میں ایک دعوت میں چلا گیا اور وہاں جا کر کھانا کھا لیا۔ بعد میں پتا چلا کہ اس شخص کی آمدنی مشکوک ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں مہینوں تک ان چند لقموں کی ظلمت اپنے دل میں محسوس کرتا رہا، اور مہینوں تک میرے دل میں گناہ کرنے کے جذبات پیدا ہوتے رہے، اور طبیعت میں یہ داعیہ بار بار پیدا ہوتا تھا کہ فلاں گناہ کر

لوں، فلاں گناہ کرلوں۔ حرام مال سے یہ ظلمت پیدا ہو جاتی ہے۔

حرام کی دو قسمیں:

یہ جو آج ہمارے دلوں سے گناہوں کی نفرت مٹتی جارہی ہے، اور گناہ کے گناہ ہونے کا احساس ختم ہو رہا ہے، اس کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے مال میں حرام مال کی ملاوٹ ہو چکی ہے۔ پھر ایک تو وہ حرام ہے جو کھلا حرام ہے جس کو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ حرام ہے۔ جیسے رشوت کا مال، سود کا مال، جوے کا مال، دھوکے کا مال، چوری کا مال وغیرہ۔ لیکن حرام کی دوسری قسم وہ حرام ہے جس کے حرام ہونے کا ہمیں احساس ہی نہیں ہے، حالاں کہ وہ بھی حرام ہے اور وہ حرام چیز ہمارے کاروبار میں مل رہی ہے۔ اس دوسری قسم کی تفصیل سنئے۔

باپ بیٹوں کے مشترک کاروبار:

آج ہمارا سارا معاشرہ اس بات سے بھرا ہوا ہے کہ کوئی بات صاف ہی نہیں۔ اگر باپ بیٹوں کے درمیان کاروبار ہے تو وہ کاروبار ویسے ہی چل رہا ہے، اس کی کوئی وضاحت نہیں ہوتی کہ بیٹے باپ کے ساتھ جو کام کر رہے ہیں وہ آیا شریک کی حیثیت میں کر رہے ہیں، یا ملازم کی حیثیت میں کر رہے ہیں، یا ویسے ہی باپ کی مفت مدد کر رہے ہیں، اس کا کچھ پتا نہیں، مگر تجارت ہو رہی ہے، ملیں قائم ہو رہی ہیں، دکانیں بڑھتی جارہی ہیں، مال اور جائیداد بڑھتا جارہا ہے۔ لیکن یہ پتا نہیں کہ کس کا کتنا حصہ ہے۔ اگر ان سے کہا بھی جائے کہ اپنے معاملات کو صاف کرو، تو جواب یہ دیا جاتا ہے کہ یہ تو غیریت کی بات ہے۔ بھائیوں بھائیوں میں صفائی کی کیا ضرورت ہے؟ یا باپ بیٹوں میں صفائی کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب شادیاں ہو جاتی ہیں اور بچے ہو جاتے ہیں، اور شادی میں کسی نے زیادہ خرچ کرلیا اور کسی نے کم خرچ کیا۔ یا ایک بھائی نے مکان بنالیا اور دوسرے نے ابھی

تک مکان نہیں بنایا۔ بس اب دل میں شکایتیں اور ایک دوسرے کی طرف سے کینہ پیدا ہونا شروع ہو گیا، اور اب آپس میں جھگڑے شروع ہو گئے کہ فلاں زیادہ کھا گیا اور مجھے کم ملا۔ اور اگر اس دوران باپ کا انتقال ہو جائے تو اس کے بعد بھائیوں کے درمیان جو لڑائی اور جھگڑے ہوتے ہیں وہ لامتناہی ہوتے ہیں، پھر ان کے حل کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

باپ کے انتقال پر میراث کی تقسیم فوراً کریں:

جب باپ کا انتقال ہو جائے تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ فوراً میراث تقسیم کرو، میراث تقسیم کرنے میں تاخیر کرنا حرام ہے۔ لیکن آج کل یہ ہوتا ہے کہ باپ کے انتقال پر میراث تقسیم نہیں ہوتی، اور جو بڑا بیٹا ہوتا ہے وہ کاروبار پر قابض ہو جاتا ہے۔ اور بیٹیاں خاموش بیٹھی رہتی ہیں، ان کو کچھ پتا نہیں ہوتا کہ ہمارا کیا حق ہے اور کیا نہیں ہے؟ یہاں تک کہ اسی حالت میں دس سال اور بیس سال گزر گئے۔ اور پھر اس دوران کسی اور کا بھی انتقال ہو گیا، یا کسی بھائی نے اس کاروبار میں اپنا پیسہ ملا دیا، پھر سالہا سال گزرنے کے بعد جب ان کی اولاد بڑی ہوئی تو اب جھگڑے کھڑے ہو گئے۔ اور جھگڑے ایسے وقت میں کھڑے ہوئے جب ڈور الجھی ہوئی ہے۔ اور جب وہ جھگڑے انتہاء کی حد تک پہنچے تو اب مفتی صاحب کے پاس چلے آرہے ہیں کہ اب آپ بتائیں کہ ہم کیا کریں۔ مفتی صاحب بے چارے ایسے وقت میں کیا کریں گے۔ اب اس وقت یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے کہ جس وقت کاروبار کے اندر شرکت تھی، اور بیٹے اپنے باپ کے ساتھ مل کر کاروبار کر رہے تھے، اس وقت بیٹے کس حیثیت میں کام کر رہے تھے؟

مشترک مکان کی تعمیر میں حصہ داروں کا حصہ:

یا مثلاً ایک مکان بن رہا ہے، تعمیر کے دوران کچھ پیسے باپ نے لگا دیے، کچھ

پیسے ایک بیٹے نے لگا دیئے، کچھ دوسرے بیٹے نے لگا دیئے، کچھ تیسرے بیٹے نے لگا دیئے۔ لیکن یہ پتا نہیں کہ کون کس حساب سے کس طرح سے کس تناسب سے لگا رہا ہے، اور یہ بھی پتا نہیں کہ جو پیسے تم لگا رہے ہو وہ آیا بطور قرض کے دے رہے ہو اور اس کو واپس لو گے، یا مکان میں حصہ دار بن رہے ہو، یا بطور امداد اور تعاون کے پیسے دے رہے ہو، اس کا کچھ پتا نہیں۔ اب مکان تیار ہو گیا اور اس میں رہنا شروع کر دیا۔ اب جب باپ کا انتقال ہوا یا آپس میں دوسرے مسائل پیدا ہوئے تو اب مکان پر جھگڑے کھڑے ہو گئے۔ اب مفتی صاحب کے پاس چلے آ رہے ہیں کہ فلاں بھائی یہ کہتا ہے کہ میرا اتنا حصہ ہے، مجھے اتنا ملنا چاہئے۔ دوسرا کہتا ہے مجھے اتنا ملنا چاہئے۔ جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ بھائی! جب تم نے اس مکان کی تعمیر میں پیسے دیئے تھے، اس وقت تمہاری کیا نیت تھی؟ کیا تم نے بطور قرض دیئے تھے؟ یا تم مکان میں حصہ دار بننا چاہتے تھے؟ یا باپ کی مدد کرنا چاہتے تھے؟ اس وقت کیا بات تھی؟ تو یہ جواب ملتا ہے کہ ہم نے تو پیسے دیتے وقت کچھ سوچا ہی نہیں تھا، نہ تو ہم نے مدد کے بارے میں سوچا تھا، اور نہ حصہ داری کے بارے میں سوچا تھا، اب آپ کوئی حل نکالیں۔ جب ڈور الجھ گئی اور سرا ہاتھ نہیں آ رہا ہے تو اب مفتی صاحب کی مصیبت آئی کہ وہ اس کا حل نکالیں کہ کس کا کتنا حصہ بنتا ہے۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ معاملات کے بارے میں ہی حضور اقدس نبی کریم ﷺ کی تعلیم پر عمل نہیں کیا۔ نفلیں ہو رہی ہیں، تہجد کی نماز ہو رہی ہے، اشراق کی نماز ہو رہی ہے، لیکن معاملات میں سب الم غلم ہو رہا ہے، کسی چیز کا کچھ پتا نہیں۔ یہ سب کام حرام ہو رہا ہے۔ جب یہ معلوم نہیں کہ میرا حق کتنا ہے اور دوسرے کا حق کتنا ہے، تو اس صورت میں جو کچھ تم اس میں سے کھا رہے ہو، اس کے حلال ہونے میں بھی شبہ ہے۔ جائز نہیں۔

حضرت مفتی صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ اور ملکیت کی وضاحت:

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی فرماتے ہیں: ”میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہٗ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ ان کا ایک مخصوص کمرہ تھا اس میں آرام فرمایا کرتے تھے۔ ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی، اسی پر آرام کیا کرتے تھے۔ اسی پر لکھنے پڑھنے کا کام کیا کرتے تھے۔ وہیں پر لوگ آکر ملاقات کیا کرتے تھے۔ میں یہ دیکھتا تھا کہ جب اس کمرے میں کوئی سامان باہر سے آتا تو فوراً واپس بھجوا دیتے تھے۔ مثلاً حضرت والد صاحب نے پانی منگوایا، میں گلاس میں پانی بھر کر پلانے چلا گیا۔ جب آپ پانی پی لیتے تو فوراً فرماتے کہ یہ گلاس واپس رکھ آؤ جہاں سے لائے تھے۔ جب گلاس واپس لے جانے میں دیر ہو جاتی تو ناراض ہو جاتے۔ اگر پلیٹ آجاتی تو فوراً فرماتے کہ یہ پلیٹ واپس باورچی خانے میں رکھ آؤ۔ ایک دن میں نے کہا کہ حضرت! اگر سامان واپس لے جانے میں تھوڑی دیر ہو جایا کرے تو معاف فرما دیا کریں۔ فرمانے لگے تم بات سمجھتے نہیں ہو۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں نے اپنے وصیت نامہ میں لکھا ہوا ہے کہ اس کمرے میں جو سامان بھی ہے وہ میری ملکیت ہے، اور باقی کمروں میں اور گھر میں جو سامان ہے وہ تمہاری والدہ کی ملکیت ہے۔ اس لئے میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کبھی دوسرے کمروں کا سامان یہاں پر آ جائے، اور اسی حالت میں میرا انتقال ہو جائے تو اس وصیت نامہ کے مطابق تم یہ سمجھو گے کہ یہ میری ملکیت ہے، حالاں کہ وہ میری ملکیت نہیں ہے۔ اس وجہ سے میں کوئی چیز دوسروں کی اپنے کمرے میں نہیں رکھتا، واپس کروا دیتا ہوں۔“

حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ کی احتیاط:

جب حضرت والد صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ کی وفات ہو گئی، تو میرے شیخ حضرت

ڈاکٹر عبدالحئی صاحب قدس اللہ سرہ تعزیت کے لئے تشریف لائے۔ حضرت والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو بہت ہی والہانہ تعلق تھا، جس کا ہم اور آپ تصور نہیں کر سکتے، چوں کہ آپ ضعیف تھے، اس وجہ سے اس وقت آپ پر کمزوری کے آثار نمایاں تھے، مجھے اس وقت خیال آیا کہ حضرت والا پر اس وقت بہت ضعف اور غم ہے تو اندر سے میں حضرت والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا خمیرہ لے آیا جو آپ تناول فرمایا کرتے تھے۔ اور حضرت والا کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ حضرت آپ خمیرہ کا ایک چمچہ تناول فرمالیں۔ حضرت والا نے اس خمیرہ کو دیکھتے ہی کہا کہ تم یہ خمیرہ کیسے لے آئے، یہ خمیرہ تو اب میراث کا اور ترکہ کا ایک حصہ بن گیا ہے، اب تمہارے لئے یہ جائز نہیں کہ اس طرح یہ خمیرہ اٹھا کر کسی کو دے دو، اگرچہ وہ ایک چمچہ کے برابر ہی کیوں نہ ہو۔ میں نے کہا کہ حضرت! حضرت والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے جتنے ورثاء ہیں، وہ سب الحمد للہ بالغ ہیں اور وہ سب یہاں موجود ہیں۔ اور سب اس بات پر راضی ہیں کہ آپ یہ خمیرہ تناول فرمالیں۔ تب حضرت نے وہ خمیرہ تناول فرمایا۔

حساب اسی دن کرلیں:

اس کے ذریعہ حضرت والا نے یہ سبق دے دیا کہ یہ بات ایسی نہیں ہے کہ آدمی رواروی میں گزر جائے۔ فرض کریں کہ اگر تمام ورثاء میں ایک وارث بھی نابالغ ہوتا یا موجود نہ ہوتا اور اس کی رضا مندی شامل نہ ہوتی تو اس خمیرہ کا ایک چمچہ بھی حرام ہو جاتا۔ اس لئے شریعت کا یہ حکم ہے کہ جونہی کسی کا انتقال ہو جائے تو جلد از جلد اس کی میراث تقسیم کر دو، یا کم از کم حساب کر کے رکھ لو کہ فلاں کا اتنا حصہ ہے اور فلاں کا اتنا حصہ ہے، اس لئے کہ بعض اوقات تقسیم میں کچھ تاخیر ہو جاتی ہے، بعض اشیاء کی قیمت لگانی پڑتی ہے اور بعض اشیاء کو فروخت کرنا پڑتا ہے، لیکن حساب اسی

دن ہو جانا چاہئے۔ آج اس وقت ہمارے معاشرے میں جتنے جھگڑے پھیلے ہوئے ہیں، ان جھگڑوں کا ایک بڑا بنیادی سبب حساب کتاب کا صاف نہ ہونا اور معاملات کا صاف نہ ہونا ہے۔ [1]

حقیقی مفلس کون؟

حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ نے صحابہ کرام سے پوچھا کہ بتلاؤ مفلس کون ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم لوگ تو اس شخص کو مفلس سمجھتے ہیں جس کے پاس روپیہ پیسہ نہ ہو۔ آں حضرت ﷺ نے فرمایا:

حقیقی مفلس وہ نہیں جس کے پاس روپیہ پیسہ نہ ہو، بل کہ حقیقی مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے جب حاضر ہوگا تو اس طرح حاضر ہوگا کہ اس کے اعمال نامے میں بہت سارے روزے ہوں گے، بہت سی نمازیں اور وظیفے ہوں گے، تسبیحات اور نوافل کا ڈھیر ہوگا، لیکن دوسری طرف کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کو دھوکہ دیا ہوگا، کسی کی دل آزاری کی ہوگی، کسی کو تکلیف پہنچائی ہوگی، اور اس طرح اس نے بہت سے انسانوں کے حقوق غصب کئے ہوئے ہوں گے۔

اب اصحاب حقوق اللہ تعالیٰ سے فریاد کریں گے کہ یا اللہ! اس شخص نے ہمارا حق غصب کیا تھا، اس سے ہمارا حق دلوایئے۔ اب وہاں پر روپے پیسے تو چلیں گے نہیں کہ ان کو دے کر حساب کتاب برابر کر لیا جائے، وہاں کی کرنسی تو نیکیاں ہیں، چناں چہ صاحب حقوق کو اس کی نیکیاں دینی شروع کی جائیں گی، کسی کو نماز دے دی جائے گی، کسی کو روزے دے دیئے جائیں گے، اس طرح ایک ایک صاحب حق اس کی نیکیاں لے کر چلتے جائیں گے یہاں تک کہ اس کی ساری نیکیاں ختم ہو جائیں گی

[1] اصلاحی خطبات: ۹/۷۵ تا ۸۷

اور یہ شخص خالی ہاتھ رہ جائے گا، نماز روزے کے جتنے ڈھیر لایا تھا، وہ سب ختم ہو جائیں گے، لیکن حق والے اب بھی باقی رہ جائیں گے۔

تو اب اللہ تعالیٰ حکم فرمائیں گے کہ اب حق دلوانے کا طریقہ یہ ہے کہ صاحبِ حق کے اعمال میں جو گناہ ہیں وہ اس شخص کے نامۂ اعمال میں ڈال دیئے جائیں۔ چناں چہ وہ شخص نیکیوں کا انبار لے کر آیا تھا، لیکن بعد میں نیکیاں تو ساری ختم ہو جائیں گی، اور دوسرے لوگوں کے گناہوں کے انبار لے کر واپس جائے گا، یہ شخص حقیقی مفلس ہے۔[۱]

اندازہ لگائیں کہ حقوق العباد کا معاملہ کتنا سنگین ہے، لیکن ہم لوگوں نے اس کو دین سے بالکل خارج کر دیا ہے، قرآن کریم تو کہہ رہا ہے: اے ایمان والو! اسلام میں داخل ہو جاؤ، آدھے نہیں، بل کہ پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔[۲] تمہارا وجود، تمہاری زندگی، تمہاری عبادت، تمہارے معاملات، تمہاری معاشرت، تمہارے اخلاق، ہر چیز اسلام کے اندر داخل ہونی چاہئے، اس کے ذریعہ تم صحیح معنی میں مسلمان بن سکتے ہو۔ یہی وہ چیز تھی جس کے ذریعہ درحقیقت اسلام پھیلا ہے۔ اسلام محض تبلیغ سے نہیں پھیلا، بل کہ انسانوں کی سیرت اور کردار سے پھیلا ہے، مسلمان جہاں بھی گئے انہوں نے اپنی سیرت اور کردار کا لوہا منوایا، اس سے اسلام کی طرف رغبت اور کشش پیدا ہوئی۔ اور آج ہماری سیرت اور کردار دیکھ کر لوگ اسلام سے متنفر ہو رہے ہیں۔

آج ہم لوگ یہ عزم کریں کہ اپنی زندگی میں اسلام کو داخل کریں گے، زندگی کے ہر شعبے میں اسلام کو داخل کریں گے، عبادات بھی، معاملات بھی، معاشرت بھی، اخلاق بھی، ہر چیز اسلام کے مطابق بنانے کی کوشش کریں گے۔

---

[۱] مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم، رقم: ۲۵۸۱

[۲] البقرة: ۲۰۸

تکلیف سے بچاؤ کا گیارھواں راستہ

خوش اخلاقی:

"عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا"۔[۱]

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایمان والوں میں زیادہ کامل ایمان والے وہ لوگ ہیں جو اخلاق میں زیادہ اچھے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ ایمان اور اخلاق میں ایسی نسبت ہے کہ جس کا ایمان کامل ہوگا، اُس کے اخلاق لازماً بہت اچھے ہوں گے، اور علیٰ ہذا جس کے اخلاق بہت اچھے ہوں گے اُس کا ایمان بھی بہت کامل ہوگا۔ واضح رہے کہ ایمان کے بغیر اخلاق بل کہ کسی عمل کا حتیٰ کہ عبادات کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہے۔ ہر عمل اور ہر نیکی کے لئے ایمان بمنزلہ روح اور جان کے ہے، اس لئے اگر کسی شخصیت میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کے بغیر اچھے اخلاق نظر آئیں، تو وہ حقیقی اخلاق نہیں ہے، بل کہ اخلاق کی صورت ہے، اس لئے اللہ کے یہاں اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔[۲]

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ ارشاد فرماتے تھے کہ صاحبِ ایمان بندہ اپنے اچھے اخلاق سے اُن لوگوں کا درجہ حاصل کر لیتا ہے جو رات بھر نفلی نمازیں پڑھتے ہوں، اور دن کو ہمیشہ روزہ رکھتے

---

[۱] ابوداؤد، کتاب السنّة، باب الدلیل علی زیادة الایمان ......، رقم: ۴۶۸۲

[۲] معارف الحدیث: ۲/۱۶۵، ۱۶۶

ہوں۔[1]"

مطلب یہ ہے کہ اللہ کے جس بندہ کا حال یہ ہو کہ وہ عقیدہ اور عمل کے لحاظ سے سچا مؤمن ہو، اور ساتھ ہی اس کو حسنِ اخلاق کی دولت بھی نصیب ہو تو اگرچہ وہ رات کو زیادہ نفلیں نہ پڑھتا ہو، اور کثرت سے نفلی روزے نہ رکھتا ہو، لیکن پھر بھی وہ اپنے حسن اخلاق کی وجہ سے اُن شب بیدار عبادت گزاروں کا درجہ پالے گا جو قائم اللیل اور صائم النہار ہوں یعنی جو راتیں نفلوں میں کاٹتے ہوں اور دن کو عموماً روزہ رکھتے ہوں۔[2]

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تم دوستوں میں مجھے زیادہ محبوب وہ ہیں جن کے اخلاق زیادہ اچھے ہیں۔[3]"

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک حدیث میں جس کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اس طرح ہے کہ:

"إِنَّ مِنْ أَحَبِّكُمْ إِلَيَّ وَأَقْرَبِكُمْ مِنِّي مَجْلِسًا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ أَحَاسِنَكُمْ أَخْلَاقًا"[4]

ترجمہ: "تم دوستوں میں مجھے زیادہ محبوب وہ ہیں اور قیامت کے دن اُن ہی کی نشست بھی میرے زیادہ قریب ہوگی جن کے اخلاق تم میں زیادہ بہتر ہیں۔"

گویا رسول اللہ ﷺ کی محبوبیت اور قیامت کے دن آپ کا قرب نصیب

[1] ابوداؤد، كتاب الأدب، باب في حسن الخلق، رقم: ٤٧٩٨
[2] معارف الحديث: ١٦٧/٢
[3] بخاري، كتاب فضائل اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم، باب مناقب عبدالله بن مسعود رضي الله عنه، رقم: ٣٧٥٩
[4] ترمذي، كتاب البر والصلة، باب في معالي الأخلاق، رقم: ٢٠١٨

ہونے میں حسنِ اخلاق کی دولت کو خاص دخل ہے۔[1]

دین میں اخلاق کا درجہ

رسول اللہ ﷺ نے اپنی تعلیم میں ایمان کے بعد جن چیزوں پر بہت زور دیا ہے، اور انسان کی سعادت کو ان پر موقوف بتلایا ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آدمی اخلاقِ حسنہ اختیار کرے، اور برے اخلاق سے اپنی حفاظت کرے۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے جن مقاصد کا قرآن مجید میں ذکر کیا گیا ہے، اُن میں ایک یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آپ ﷺ کو انسانوں کا تزکیہ کرنا ہے ﴿وَيُزَكِّيهِمْ﴾[2] اور اس تزکیہ میں اخلاق کی اصلاح اور درستگی کی خاص اہمیت ہے۔

حدیث کی مختلف کتابوں میں خود آپ ﷺ سے یہ مضمون روایت کیا گیا ہے:

میں اخلاق کی اصلاح کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں۔[3]

یعنی اصلاحِ اخلاق کا کام میری بعثت کے اہم مقاصد اور میرے پروگرام کے خاص اجزاء میں سے ہے۔

ہونا بھی یہی چاہئے تھا کیوں کہ انسان کی زندگی اور اس کے نتائج میں اخلاق کی بڑی اہمیت ہے، اگر انسان کے اخلاق اچھے ہوں تو اس کی اپنی زندگی بھی قلبی سکون اور خوش گواری کے ساتھ گزرے گی اور دوسروں کے لئے بھی اس کا وجود رحمت اور چین کا سامان ہوگا، اور اس کے برعکس اگر آدمی کے اخلاق برے ہوں، تو خود بھی وہ زندگی کے لطف و مسرت سے محروم رہے گا اور جن سے اس کا واسطہ اور تعلق ہوگا، ان کی زندگیاں بھی بے مزہ اور تلخ ہوں گی۔ یہ تو خوش اخلاقی اور بداخلاقی کے وہ نقد دنیوی نتیجے ہیں جن کا ہم روزمرہ مشاہدہ اور تجربہ کرتے رہتے ہیں، لیکن مرنے کے

[1] معارف الحديث: ١٦٩/٢، ١٧٠
[2] البقرة: ١٢٩
[3] مسند احمد: ٣٨١/٢، رقم: ٨٧٢٩

بعد ہمیشہ رہنے والی زندگی میں ان دونوں کے نتیجے ان سے بدرجہا زیادہ اہم نکلنے والے ہیں، آخرت میں خوش اخلاقی کا نتیجہ ارحم الراحمین کی رضا اور جنت ہے اور بداخلاقی کا انجام خداوند قہار کا غضب اور دوزخ کی آگ ہے۔ "اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا!"[1]

اخلاق کے مراتب

اخلاق کے تین مراتب ہیں:

پہلا مرتبہ:

اخلاق کا ایک مرتبہ وہ ہے جو یہودیوں کو ملا، اسے اخلاق حمیدہ کہتے ہیں۔ وہ یہ تھا کہ تم لوگوں کے ساتھ برابری کا معاملہ رکھو۔ ﴿اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ﴾[2] تَرجَمَہ: "جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ۔" مطلب یہ ہے کہ جتنا کوئی تمہیں تکلیف پہنچاتا ہے اپنا بدلہ لینے کے لئے تم بھی اتنی ہی تکلیف پہنچا سکتے ہو۔ البتہ اس سے زیادہ تکلیف نہ پہنچانا۔

دوسرا مرتبہ:

اخلاق کا ایک مرتبہ عیسائیوں کو بھی ملا۔ ان کو یہودیوں سے بلند مرتبے کا اخلاق ملا جسے "اخلاق کریمانہ" کہتے ہیں۔ وہ اخلاق یہ تھے کہ اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچائے تو تم اس کو معاف کر دو۔ اسی لئے نصاریٰ جو پہاڑی کا وعظ دہراتے ہیں اس میں وہ کہتے ہیں کہ اگر تمہارے ایک رخسار پر کوئی تھپڑ لگائے تو تم اپنا دوسرا رخسار بھی اس کے سامنے پیش کر دو۔ وہ اسے اخلاق کا بڑا مرتبہ سمجھتے ہیں۔

تیسرا مرتبہ:

اخلاق کا ایک مرتبہ امت مسلمہ کو بھی ملا جسے "اخلاق عظیمہ" کہتے ہیں۔

---

[1] معارف الحدیث: ٢/١٦٤، ١٦٥ [2] المائدہ: ٤٥

چناں چہ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا: ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾[1] اور آپ تو اخلاق کے بلند مرتبے پر فائز ہیں۔

اخلاق عظیمہ یہ ہیں ﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ اے محبوب! انہیں معاف کر دیجیے۔ ﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ اور ان کے لئے اللہ کے حضور استغفار کیجیے۔ ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ﴾[2] اور ان کو اپنے مشورے میں شامل بھی کر لیجیے۔ یعنی اپنے بھائی کی غلطی کو فقط معاف ہی نہیں کرنا بل کہ اس کے لئے اللہ کے حضور استغفار بھی کرنی ہے اور پھر پہلے والے تعلقات کو بحال بھی رکھنا ہے۔ اور انہیں اپنے مشوروں میں شامل بھی رکھنا ہے۔ اسی لئے اللہ رب العزت نے ایمان والوں کی صفت قرآن میں ارشاد فرمائی کہ ﴿وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾[3] وہ غصے کو پی جانے والے ہوتے ہیں اور وہ انسانوں کو معاف کر دینے والے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکاروں سے محبت فرماتے ہیں۔

گویا ہم نے دوسروں کو فقط معاف ہی نہیں کرنا بل کہ ہم نے ان کی غلطیوں کے باوجود ان کو اپنے قریب کرنا ہے۔ اسی لئے اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا: ﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۗ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ تم برائی کو اچھائی کے ساتھ دھکیلو۔ جب تم برائی کا بدلہ اچھائی کے ساتھ دو گے تو نتیجہ یہ نکلے گا ﴿فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ﴾[4] کہ تمہارے اور جس کے درمیان دشمنی ہے وہ بندہ پھر تمہارا جگری یار بن جائے گا۔ یوں دشمنی دوستی میں بدل جائے گی اور نفرتوں کی بجائے دلوں میں محبتیں پیدا ہو جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ نے جو یہ ارشاد فرمایا کہ ﴿وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ﴾[5] اور جو انسانوں کو نفع پہنچاتا ہے اللہ تعالیٰ اسے زمین میں جما دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ

---

[1] ن: ٤ [2] ال عمران: ١٥٩ [3] آل عمران: ١٣٤
[4] حٰمٓ السجدۃ: ٣٤ [5] الرعد: ١٧

ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے قدم زمین میں جما دیا کرتے ہیں۔ یہ ایک خدائی قانون ہے کہ جو بندہ دوسروں کے فائدے کے لئے زندگی گزارے گا اللہ تعالیٰ اس کے اپنے قدم زمین میں جما دے گا۔[1]

''حسنِ اخلاق'' کسے کہتے ہیں؟

''خُلق'' اصل میں عادت کو کہتے ہیں۔ ''حُسْنُ الْخُلُقْ'' کا مطلب ہوا ''اچھی عادت، اچھے اخلاق''۔ حسنِ اخلاق کیا ہے؟ اس کا حاصل اور لب لباب جو علماءِ کرام نے لکھا ہے، تین چیزیں ہیں۔

1. بَذْلُ الْمَعْرُوْف
2. کَفُّ الْاَذٰی
3. طَلَاقَةُ الْوَجْهِ

1. بَذْلُ الْمَعْرُوْف کا مطلب یہ ہے: آپ دوسرے کے ساتھ اچھا اور خیر خواہی کا معاملہ کریں اور روپے، پیسے اور زبان سے اُسے جو کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہوں، پہنچانے کی کوشش کریں۔ ہر آدمی یہ سوچے کہ وہ دوسرے کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے اور پھر جو سمجھ میں آئے اور اس کا موقع بھی مل جائے تو وہ فائدہ پہنچائے۔

2. کَفُّ الْاَذٰی کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کو تکلیف نہ پہنچائے۔ اس بات کا خیال رکھے کہ میری کسی بات یا کسی فعل سے دوسرے کو ناحق ادنیٰ ناگواری اور دل آزاری نہ ہو۔

3. طَلَاقَةُ الْوَجْهِ کے معنی ہیں خندہ پیشانی سے ملنا۔ مطلب یہ ہے کہ جب آپ کسی سے ملیں تو آپ کے چہرے پر بشاشت ہو۔ دیکھنے والا یہ محسوس کرے کہ مجھ سے ملتے ہوئے خوش ہوا ہے۔ اس سے اس کے دل میں بھی خوشی پیدا ہوگی۔

---
[1] خطبات فقیر: ۸/۲۳۴

حسنِ اخلاق کا حاصل یہ تین چیزیں ہیں۔

''بَذْلُ الْمَعْرُوْف'' کی صورتیں:

بذل المعروف یعنی دوسروں کو فائدہ پہنچانے میں بہت سے طریقے ایسے بھی ہیں جن میں کوئی وقت، محنت اور پیسہ بھی خرچ نہیں ہوتا مثلاً آپ چلے جا رہے ہیں۔ راستہ میں کوئی ایسی چیز دیکھتے ہیں جس سے چلنے والوں کو تکلیف پہنچ سکتی ہے۔ آپ نے چلتے چلتے اسے ہٹا دیا۔ اس پر کوئی وقت اور محنت خرچ نہیں ہوئی لیکن آپ نے اپنے اس عمل سے لوگوں کے ساتھ ایک حسنِ سلوک کر دیا۔

آپ بس میں بیٹھے ہیں آپ کے پاس ایک ضعیف آدمی کھڑا ہے بے چارہ تھک رہا ہے۔ آپ نے تھوڑا سا سرک کر اس کو جگہ دے دی تو آپ نے اس کے ساتھ حسنِ سلوک کر دیا۔

گھر گئے، دیکھا کہ کوئی ایسا مختصر سا کام ہے جس کے کرنے سے بیوی کو خوشی ہو سکتی ہے، وہ کر دیا تو یہ بھی بذل المعروف ہے۔ کسی بات سے بچے کو خوشی ہو سکتی ہے، وہ کر دی تو یہ بھی بذل المعروف ہے۔

بذل المعروف کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ آپ کہیں بیٹھے ہیں اور دوسرا شخص آپ کے برابر میں آ گیا۔ اگرچہ اس کے بیٹھنے کے لئے جگہ کافی ہے لیکن آپ اس کے لئے تھوڑے سے سرک گئے تو اس کے دل میں خوشی پیدا ہو جائے گی کہ آپ نے اس کی قدر کی، اس کی اہمیت کا احساس کیا اور اس کی عزت کی۔ اور اگر سرکنے کی جگہ نہیں ہے تو روایات میں یہاں تک آتا ہے کہ تھوڑے سے ہل جائیں تاکہ اسے معلوم ہو کہ آپ نے اس کے آنے کو محسوس کیا۔ اس سے اس کے دل میں خوشی پیدا ہو جائے گی۔

غرض یہ کہ بذل المعروف (یعنی دوسرے کے ساتھ اچھا معاملہ کرنے) کے بے شمار طریقے ہو سکتے ہیں۔ گھر میں بھی ہو سکتے ہیں اور سفر میں بھی ہو سکتے ہیں۔

دفتر میں بھی ہوسکتے ہیں اور مسجد میں بھی ہوسکتے ہیں وغیرہ وغیرہ اور ہر موقع کے لئے آدمی خود سوچ سوچ کر یہ کام کرسکتا ہے لیکن یہ کام تب ہی ہوگا جب آدمی کو اس بات کا شوق ہو کہ وہ دوسروں کے ساتھ حسنِ سلوک کرے۔[1]

"کف الأذیٰ" کی تفصیل:

"کف الاذیٰ" کا معنی و مطلب یہ ہے کہ کسی دوسرے کو آپ کی وجہ سے ناحق تکلیف نہ ہو۔ بعض لوگوں کی عادت سگریٹ پینے کی ہوتی ہے، ایسے لوگ بعض مرتبہ دورانِ سفر بھی سگریٹ پیتے رہتے ہیں اور برابر والوں پر دھواں چھوڑتے رہتے ہیں جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے، یہ جائز نہیں۔

بعض پان والے پان کھاتے ہیں اور قریب ہی اس کی پیک تھوکتے رہتے ہیں۔ دوسروں کو اس سے گھن آتی ہے یہ بھی تکلیف دینے والی چیز ہے۔ بعض نسوار کھانے والے بیچ بیچ تھوکتے رہتے ہیں حالاں کہ برابر میں دوسرے افراد موجود ہوتے ہیں۔ اس سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے۔

بعض لوگ ریل میں پہلے سے پہنچ جاتے ہیں حالاں کہ ان کی ریزرویشن (Reservation) نہیں ہوتی کپڑا بچھا کر جگہ پر قبضہ کرلیا۔ بعض مرتبہ کوئی شخص صرف ایک ٹکٹ لیتا ہے لیکن دو آدمیوں کی جگہ پر قبضہ کرلیتا ہے۔ یہ صرف حسنِ اخلاق کی بات نہیں بل کہ یہ تو حق کی ادائیگی اور گناہوں سے بچنے کی بات ہے۔ جتنے کا ٹکٹ تم نے لیا ہے، اتنے کا دوسروں نے بھی لیا ہے۔ تمہیں بھی ایک آدمی کی جگہ گھیرنے کا حق ہے، دوسرے کو بھی اتنی ہی جگہ گھیرنے کا حق ہے۔ تم نے دو آدمیوں کی جگہ پر قبضہ کرکے دوسرے کا حق مار لیا۔ اسی طرح ایسے طریقے سے بیٹھنا کہ جس سے برابر والے کو تنگی ہو رہی ہو جائز نہیں۔

اسی طرح اگر کسی کے منہ میں بدبو ہو تو اس کے لئے مجلس جانا کہ جس کی وجہ

[1] اصلاحی تقریریں: ۸۲/۵

سے دوسروں کو تکلیف ہو، جائز نہیں۔ حدیث میں ہے جس کا مفہوم یہ ہے:

"جس شخص نے کچی پیاز کھائی ہو یا کچا لہسن کھایا ہو تو وہ مسجد میں نہ آئے"۔[1]

اس کی وجہ یہ ہے کہ کچے پیاز اور لہسن کے کھانے سے منہ میں بدبو پیدا ہوجاتی ہے جس سے برابر والوں کو تکلیف ہوتی ہے اور مسجد میں فرشتے بھی ہوتے ہیں، انہیں بھی تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے منع کیا گیا ہے۔ اندازہ کیجئے کہ لہسن اور پیاز سے تکلیف ہی کتنی ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ تکلیف تو سگریٹ اور بیڑی سے ہوتی ہے اور اس سے زیادہ تکلیف وہ بو منہ کی ہوتی ہے اگر کسی کے منہ میں پائیریا کی بیماری ہے اور ایسی ہی تکلیف بغلوں سے ہوتی ہے اگر کسی کی بغلیں صاف نہ رہتی ہوں، سخت گرمی کے موسم میں پسینوں کے باوجود نہاتے نہ ہوں۔ اس سے کپڑوں میں پسینے کی بدبو آجاتی ہے جس سے برابر والوں کو تکلیف پہنچتی ہے۔[2]

گھریلو آدابِ معاشرت کی رعایت نہ رکھنے کی مثالیں

عام طور پر گھروں میں پانی پینے کے مٹکے یا کولر وغیرہ کی جگہ مقرر ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ گلاس یا پیالہ وغیرہ رکھا رہتا ہے۔ اب مثلاً گھر کے ایک فرد نے وہاں سے پانی پیا، اور اُس گلاس کو مقررہ جگہ کے علاوہ کسی دوسری جگہ رکھ دیا۔ اب جب دوسرا فرد پانی پینے آئے گا اور اُسے مقررہ جگہ پر گلاس نہیں ملے گا تو اُسے تکلیف ہوگی، اور اگر اُسے رات کے وقت پیاس لگی اور وہ رات تین بجے سخت اندھیرے میں اٹھ کر پانی کی جگہ پر آیا تو ایسی صورت میں اس جگہ پر گلاس نہ ملنے کی صورت میں بہت زیادہ تکلیف ہوگی اور جب تکلیف ہوگی تو اس کے منہ سے کوئی نامناسب کلمہ نکل جائے گا اور پھر اس پر جھگڑا کھڑا ہوجائے گا۔

اسی طرح تولیہ کا معاملہ ہے۔ عام طور پر تولیہ لٹکانے کی ایک جگہ مقرر ہوتی

[1] ترمذی، باب ماجاء فی کراھیۃ اکل الثوم والبصل: ۳/۲

[2] اصلاحی تقریریں: ۸۰/۵ تا ۸۵

ہے۔ گھر کے ایک فرد نے وضو کیا تولیہ استعمال کیا اور اُسے اس کی مقررہ جگہ پر ڈالنے کے بجائے کہیں اور ڈال دیا، بعد میں کسی دوسرے نے وضو کیا، تولیہ تلاش کیا تو وہ اپنی جگہ پر نہیں۔ اب وہ گیلے ہاتھوں کے ساتھ مختلف جگہوں پر تولیہ تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ تو یہ بھی اسے ایذاء پہنچانا ہے۔

رات کے وقت عام طور پر لوگ دروازوں کو بند کرکے اور کنڈی لگا کر سوتے ہیں۔ اب مثلاً ایک گھر میں سب لوگ اسی طرح دروازہ بند کرکے سوئے ہوئے ہیں۔ ایک صاحب تہجد کے لئے اٹھے اور دھڑام سے دروازہ کھولا جس سے دوسرے کی نیند خراب ہوگئی۔ اب اس نے اٹھ کر تہجد تو پڑھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک زبردست کبیرہ گناہ بھی کر ڈالا۔

گھروں میں جب اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال نہیں رکھا جاتا تو پھر جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں، میاں بیوی کے جھگڑے، ساس بہو کے جھگڑے، بہو اور نند کے جھگڑے وغیرہ۔ جتنے جھگڑے گھروں میں ہوتے ہیں، زیادہ تر اسی وجہ سے ہوتے ہیں کہ اس بات کی رعایت نہیں رکھی جاتی کہ ایک کے فعل سے دوسروں کو تکلیف نہ پہنچے۔[1]

ہمیشہ کا لفظ بڑا خطرناک ہے

ایک صاحب نے بڑی اچھی بات کہی کہ "ہمیشہ" کا لفظ بڑا خطرناک لفظ ہے، اور گھر کی گفتگو میں عام طور پر یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ایک روز سالن میں غلطی سے نمک زیادہ ہوگیا تو شوہر بیوی سے کہتا ہے کہ تم تو ہمیشہ ہی نمک زیادہ کر دیتی ہو۔ حالاں کہ وہ ہمیشہ ایسا نہیں کرتی، یہ سن کر اس کا دل جلا اور اس نے کہا کہ تم تو ہمیشہ ہی ایسی باتیں کرتے رہتے ہو حالاں کہ شوہر بھی ہمیشہ ایسی باتیں نہیں کرتا، تو یہ

[1] اصلاحی تقریریں: ۶۸/۵

سن کر اس کا دل ٹوٹا اور پھر لڑائی جھگڑا ہوگیا۔ الفاظ کی رعایت نہ رکھنا بہت بڑے بڑے جھگڑوں کا باعث بنتا ہے۔

کفُّ الاذیٰ کی مثالیں:

عام طور پر مسجدوں میں وضو کرنے کے لئے چوکیاں بنی ہوتی ہیں۔ ایک صاحب آئے، وضو کیا اور گیلا پاؤں اس چوکی پر رکھ دیا۔ اس حدیث "اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ"[1] سے معلوم ہوا کہ اس نے گناہ کا کام کیا اس لئے کہ یہ بیٹھنے کی جگہ تھی۔ اس کا خشک رہنا ضروری تھا۔ جب آپ نے اُسے بھگو دیا تو اب وہاں کوئی شخص کیسے بیٹھ سکے گا، اگر بیٹھے گا تو اس کے کپڑے گیلے ہو جائیں گے، سردی کا موسم ہے تو اور زیادہ تکلیف پہنچے گی۔

شرعی قاعدہ یہ ہے کہ عام جگہ جہاں پر بیٹھنے کا سب کو برابر کا حق حاصل ہے، وہاں اگر کوئی شخص پہلے پہنچ جائے تو دوسرے آدمی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اُسے اس جگہ سے اٹھائے۔ مثلاً مسجد میں سب کا برابر حق ہے۔ جو شخص جہاں بیٹھ گیا، وہ اسی کی جگہ ہوگئی، اب ایک دوسرا شخص وہاں پہنچ گیا اور اُسے وہاں سے ہٹا کر خود اس جگہ پر بیٹھنے کی کوشش کی تو اس کا یہ عمل شرعاً درست نہیں۔ اس طرح کرنے سے عام طور پر لڑائی جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔

تبسم ...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص سنت

"طلاقة الوجه" (یعنی خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا) یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص سنت ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ تھی کہ عام طور پر آپ کے چہرۂ انور پر تبسم رہتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے جب کبھی بھی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا، آپ نے تبسم کے ساتھ

[1] بخاری، کتاب الایمان: ۶/۱

ملاقات فرمائی۔ [1]

نبی کریم ﷺ جب گھر تشریف لے جاتے تو آپ کے چہرۂ مبارک پر بشاشت ہوتی۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے۔ ہاں! اگر آپ کبھی کوئی ناجائز بات دیکھتے تو آپ کے چہرۂ انور پر اس سے ناگواری کے آثار ظاہر ہوتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:

میں نے حضور ﷺ کے لئے ایک تکیہ خریدا تھا (تاکہ اس کے ساتھ ٹیک لگا سکیں) اور اس پر کوئی تصویر تھی (اس وقت تک تصویر کی حرمت سے متعلق احکام آئے ہی نہیں تھے یا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو حکم معلوم نہ تھا) آپ فرماتی ہیں: میں نے دیکھا کہ جب آپ تشریف لائے تو آپ کا چہرہ ناگواری کی وجہ سے سرخ ہوگیا، میں نے عرض کیا: میں اپنے گناہوں کی معافی مانگتی ہوں، مجھ سے کیا غلطی ہوئی۔ (حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے معافی پہلے مانگی، غلطی بعد میں پوچھی، یہ ادب کی بات ہے) آپ نے یہ سن کر تصویر کے متعلق مسئلہ بتایا، یہ خاص حالت کا بیان ہے ورنہ عام حالات میں آپ کے چہرے مبارک پر تبسم ہوتا تھا۔ [2]

بعض لوگوں کے نہ مسکرانے کی وجوہات:

بہت سے لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ کبھی مسکراتے ہی نہیں، ہر وقت ان کا چہرہ مغموم رہتا ہے، ماتھے پر شکنیں پڑی رہتی ہیں، دوسرا آدمی دیکھ دیکھ کر ڈرتا رہتا ہے کہ نجانے یہ کب ناراض ہوجائے اور کب اسے غصہ آجائے۔

اس کی مختلف وجوہات ہیں۔ ① بعض لوگوں کو یہ عادت کسی بیماری کی وجہ سے پڑ جاتی ہے۔ ہر وقت بیماری کی تکلیف اور شدت کی وجہ سے غمگین رہتے ہیں،

[1] شمائل الترمذی، باب ماجاء فی ضحک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ص۱۵

[2] بخاری، باب ہل یرجع اذا رأی منکراً: ۲/۷۷۸

چہرے پر مسکراہٹ نہیں آتی ② بعض لوگوں کو زیادہ مصروفیات اور تفکرات میں گھرے رہنے کی وجہ سے یہ عادت پڑ جاتی ہے کہ کاموں اور تفکرات کی وجہ سے پریشان سے رہتے ہیں، اس لئے چہرہ پر مسکراہٹ نہیں آتی۔ ③ بعض لوگوں میں زیادہ غموں اور صدموں کے آنے کی وجہ سے یہ صورت پیدا ہوجاتی ہے۔

اگر غیر اختیاری طور پر کسی مجبوری کی وجہ سے یہ حالت پیش آجائے کہ آدمی کی عادت مسکرانے کی نہ رہے تو یہ معاف ہے لیکن ہر شخص کو یہ تو مجبوریاں لاحق نہیں ہوتیں، اس لئے عام حالات میں ایسی عادت بنانا درست نہیں۔

مسکرانے کے فوائد:

مسکرانا حضور ﷺ کی ایسی پیاری اور بہترین سنت ہے کہ اگر کوئی شخص اس کو اپنا لے تو اس کو اپنی زندگی میں اتنی آسانیاں میسر آئیں گی کہ ان کا تصور کرنا مشکل ہے اس کے ساتھ ساتھ اس عمل پر زبردست ثواب بھی ہے، اس لئے کہ جس شخص سے آپ مسکرا کر ملیں گے، اس کے دل میں ٹھنڈک پڑ جائے گی، اس طرح دوسرے مسلمان کو خوش کرنے کا ثواب بھی آپ کو ملے گا۔

اگر آپ اس عادت کو جاری رکھیں گے تو دنیا میں اس کا فائدہ یہ بھی ظاہر ہوگا کہ سب لوگ آپ سے محبت کریں گے، ہر ایک آپ کی بات توجہ سے سنے گا اور آپ کی بات ماننے کی کوشش کرے گا اور آپ کے ساتھ تعاون کرے گا۔

کسی سے کوئی بات بغیر مسکرائے کرکے دیکھیں اور پھر وہی بات مسکرا کر کریں، آپ خود محسوس کریں گے کہ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ تجربہ کرکے دیکھ لیں دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہوگا۔ جو بات آپ نے مسکرا کر کی اس کا اثر کچھ اور ہوگا اور جو بغیر مسکرائے کی، اس کا اثر اور ہوگا۔

آپ اس کی عادت بنا کر تجربہ کیجئے، تاجر اپنے گاہک کے ساتھ مسکرا کر بات

کرے، افسر اپنے ماتحت کے ساتھ مسکرا کر بولے، ماتحت اپنے افسر کے ساتھ، استاذ شاگرد کے ساتھ اور شاگرد استاذ کے ساتھ مسکرا کر بات کر کے دیکھے وہ خود بخود اس کا فرق محسوس کریں گے۔

ہمیں ایک دوسرے سے ملنے اور کام کاج کے دوران خندہ پیشانی اور مسکرانے کی عادت بنانی ہوگی اور اس کی مشق کرنی ہوگی۔ مشق کے بغیر اس کی عادت بننا مشکل ہے، صرف سننے اور علم میں لانے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا، بل کہ اس کی عادت ڈالنی پڑے گی۔ اگر کسی غم، پریشانی یا تکلیف وغیرہ کی وجہ سے چہرے پر مسکراہٹ نہیں آ رہی تو بتکلف مسکرانے کی کوشش کریں، رفتہ رفتہ تکلف کے بغیر خود بخود مسکرانے کی عادت پڑ جائے گی اور پھر آپ جب بھی کسی سے بات کریں گے تو ان شاء اللہ مسکرا کر کریں گے۔

کسی سے خندہ پیشانی سے ملنا اور مسکرا کر بات کرنا دیکھنے میں اگرچہ یہ ایک چھوٹی سی سنت ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک بہت بڑی سنت ہے، یہ دنیا و آخرت بنانے والی سنت ہے۔ یہ ایک ایسی سنت ہے کہ جو شخص اسے اپنا لے گا، وہ انسانوں کا محبوب بن جائے گا، دنیا اُسے عزت کی نظر سے دیکھے گی، اس سے محبت کرے گی اور اس کی پیروی کرے گی۔

اس بات سے بہت ہی دل دکھتا ہے کہ ہمارے ہاں اس سنت پر عمل کرنے کا رواج بہت ہی کم ہے۔ بہت کم لوگوں کے چہروں پر ملاقات کے وقت مسکراہٹ نظر آتی ہے، دوکان پر جائیں، دوکان دار کے چہرے پر مسکراہٹ کم نظر آئے گی، گاہک کے چہرے پر مسکراہٹ کم نظر آئے گی، دو عام ملاقاتیوں کے چہرے پر مسکراہٹ بہت کم نظر آتی ہے۔ ہمارے ہاں اس سنت پر بہت کم عمل کیا جاتا ہے۔

لیکن بہت ہی دکھے دل سے کہنا پڑتا ہے کہ بہت سے وہ اعمال جو نبی اکرم ﷺ نے اپنی امت کو سکھائے تھے اور ہم نے ان پر عمل کرنا تقریباً چھوڑ دیا لیکن

یورپ کے لوگوں نے انہیں اختیار کر لیا۔ یہ اعمال وہ تھے جو دنیاوی ترقی کے لئے بے نظیر تھے چوں کہ وہ لوگ صرف دنیا کے طالب ہیں تو انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی ان تعلیمات کو لے لیا جن سے دنیاوی ترقیاں ملتی ہیں اور چوں کہ انہیں آخرت سے کوئی سروکار نہیں اور آخرت پر ان کا عقیدہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے، اس لئے آخرت سے متعلق تعلیمات کو چھوڑ دیا، مسکرانے کا عمل ایک ایسا عظیم عمل ہے کہ جس کی وجہ سے زبردست دنیاوی ترقیاں ہوتی ہیں چناں چہ انہوں نے اس عمل کو اپنا لیا اور اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔

یورپ کے مختلف ممالک خصوصاً برطانیہ، سوئٹزر لینڈ اور بعض دیگر ممالک میں مسکرانے کی عادت عام ہے۔ برطانیہ میں آپ جس سے بھی ملاقات کریں گے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت وہ مسکرا کر بات کرے گا۔ آپ کسی سے راستہ پوچھیں، وہ مسکرا کر جواب دے گا حالاں کہ وہ آپ کا کام کر رہا ہے۔

حتیٰ کہ وہاں پر پولیس والا سپاہی بھی مسکرا کر چالان کرتا ہے۔ ان کے ہاں چالان کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے تو پولیس والا آتا ہے اور ہاتھ میں ایک ٹکٹ تھما دیتا ہے، اس ٹکٹ پر لکھا ہوتا ہے کہ آپ فلاں تاریخ تک اتنی رقم عدالت میں جمع کرا دیں، اگر جمع نہیں کرائیں گے تو آپ کی گاڑی ضبط ہو جائے گی۔

لیکن ٹکٹ دینے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ آئے گا، گڈ مارننگ (Good Morning) کہے گا، مسکرا کر اسے ٹکٹ دے گا اور پھر کہے گا (Very Sory) (معاف کرنا) مسکرا کر اسے رخصت کرے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں کسی شخص کا پولیس والوں سے جھگڑا نہیں ہوتا جب کہ یہاں آئے دن جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ کیوں کہ یہاں پر پولیس والے بدتمیزی سے بات کرتے رہتے ہیں حالاں کہ انہیں یہ حق حاصل نہیں کہ کسی سے بدتمیزی سے بات کریں، انہیں چالان کرنے کا حق ہے لیکن بدتمیزی سے

بات کرنے کا حق نہ انہیں قانون نے دیا ہے اور نہ شریعت نے دیا ہے۔ برطانیہ میں اس بات کی پابندی کی جاتی ہے کہ پولیس والا مسکرا کر بات کرے، بدتمیزی اور سخت لہجے میں بات نہ کرے۔

برطانیہ اور سوئٹزر لینڈ میں تقریباً سو فیصد یہ عادت پائی جاتی ہے کہ جب بھی کسی سے بات کریں گے، پوچھیں گے یا کسی بات کا جواب دیں گے تو مسکرا کر بولیں گے اور دیگر بعض ممالک میں بھی یہ عادت بکثرت پائی جاتی ہے۔

مسکرانے کے معاشرتی اثرات:

خندہ پیشانی سے ملنے اور مسکرانے کی عادت کو اپنانا ہمارے لئے بہت اہم ہے ہمیں چاہئے کہ ہم آج سے اس پر عمل شروع کریں اور اگر ملتے وقت کسی کو مسکرانا یاد نہ رہے تو اسے یاد دلا دیں کہ بھائی آپ مسکرائے نہیں۔ اگر آپس میں اس کا معمول بنا لیا جائے اور بھولنے کی صورت میں یاد دہانی کرائی جانے لگے تو ہمارے معاشرہ میں شہد ہی شہد گھل جائے۔ ہمارے درمیان جو تلخیاں، کشیدگیاں اور نفرتیں پھیلی ہوئی ہیں، وہ سب کی سب ختم ہو جائیں۔ اور ہماری زندگی جنت والی زندگی کا نمونہ بن جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اس پر عمل کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ (آمین)[1]

خندہ پیشانی سے ملاقات کرنا "صدقہ" ہے:

نبی اکرم ﷺ نے صدقہ کی بہت سی قسمیں بیان فرمائی ہیں کہ یہ عمل بھی صدقہ ہے، فلاں عمل بھی صدقہ ہے، اور صدقہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس عمل پر ایسا ہی ثواب ہے جیسے صدقہ کرنے کا ثواب ہے، پھر اسی حدیث کے آخر میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

"كُلُّ مَعْرُوْفٍ صَدَقَةٌ وَإِنَّ مِنَ الْمَعْرُوْفِ أَنْ تَلْقٰى أَخَاكَ

[1] اصلاحی تقریریں: ۳/۹۹ تا ۱۰۲

بِوَجْهٍ طَلْقٍ"[1]

ترجمہ: ہر نیکی صدقہ ہے اور نیکیوں میں سے ایک نیکی یہ ہے کہ اپنے بھائی کے ساتھ شگفتہ اور مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ ملو۔ جب تم کسی سے ملاقات کرو تو تم کو یہ احساس ہو کہ تمہاری ملاقات سے اس کو خوشی ہوئی ہے اور اس ملاقات سے اس کے دل میں ٹھنڈک محسوس ہو، اس کو صدقہ کرنے میں شمار فرمایا ہے۔

لہٰذا جو لوگ دوسروں سے ملاقات کے وقت اور برتاؤ کے وقت لئے دبے ہوتے ہیں اور وقار کے پردے میں اپنے آپ کو ریزرو رکھتے ہیں، وہ لوگ سنت طریقہ پر عمل نہیں کرتے، سنت طریقہ یہ ہے کہ جب اپنے مسلمان بھائی سے ملے تو وہ خوش خلقی کے ساتھ شگفتگی کے ساتھ ملے اور اس کو خوش کرنے کی کوشش کرے۔

دوسروں کو خوش رکھئے

"قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مِنْ أَحَبِّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى إِدْخَالُ السُّرُوْرِ عَلَى الْمُسْلِمِ."[2]

ترجمہ: "حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو اعمال اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں، ان اعمال میں سے ایک عمل کسی مؤمن کے دل میں خوشی داخل کرنا اور اس کو خوشی سے ہم کنار کرنا ہے۔"

اس حدیث کا مضمون دوسری احادیث اور دلائل سے بھی ثابت ہے، حضور اقدس ﷺ نے متعدد احادیث میں اور اپنے قول و فعل کے ذریعہ یہ بات واضح فرمائی ہے کہ کسی بھی صاحب ایمان کو خوش کرنا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں: جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے تو اللہ جل

[1] ترمذی، باب ماجاء فی طلاقة الوجه: ۲/۱۸

[2] کنزالعمال، کتاب الزکوۃ قسم الاقوال: ۶/۱۸۴، رقم الحدیث: ۱۶۴۱۰

جلالہ جواب میں زبان حال سے گویا یوں فرماتے ہیں: اگر مجھ سے محبت کرتے ہو تو میں تو تمہارے ساتھ دنیا میں ملنے والا نہیں ہوں کہ تم کسی وقت مجھ سے ملاقات کرکے اپنی محبت کا اظہار کرو۔ لیکن اگر تم کو میرے ساتھ محبت ہے تو اس کا تقاضہ یہ ہے کہ میرے بندوں کے ساتھ محبت کرو، میری مخلوق سے محبت کرو، اور میری مخلوق سے محبت کرنے کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کو حتی الامکان خوش کرنے کی اور خوش رکھنے کی کوشش کرو۔

اس بارے میں ہمارے معاشرے میں افراط وتفریط پائی جاتی ہے، اعتدال نہیں ہے، کچھ لوگ تو وہ ہیں جو کسی دوسرے مسلمان کو خوش کرنے کی کوئی اہمیت ہی نہیں سمجھتے اور ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ کتنی بڑی عبادت ہے۔ کسی بھی مسلمان کو خوش کر دیا یا کسی انسان کو خوش کر دیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس پر کتنا اجر وثواب عطا فرماتے ہیں، اس کا ہمیں احساس ہی نہیں۔ بزرگوں نے فرمایا:

ع دل بدست آور کہ حج اکبر است

"کسی مسلمان کا دل ہاتھ میں لے لینا یعنی اس کے دل کو خوش کر دینا یہ حج اکبر ہے۔"

بزرگوں نے ویسے ہی اس کو حج اکبر نہیں کہہ دیا بلکہ کسی مسلمان کے دل کو خوش کر دینا واقعی اللہ تعالیٰ کے محبوب اعمال میں سے ہے۔

دوسروں کو خوش کرنے کا نتیجہ:

ذرا اس بات کو سوچیں کہ اگر اس حدیث کی تعلیم پر ہم سب عمل کرنے لگیں اور ہر انسان اس بات کی فکر کرے کہ میں کسی دوسرے کو خوش کروں تو یہ دنیا جنت کا نمونہ بن جائے، کوئی جھگڑا باقی نہ رہے، پھر کوئی حسد باقی نہ رہے اور کسی بھی شخص کو دوسرے سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ لہٰذا اہتمام کرکے دوسرے کو خوش کرو، تھوڑی سی

تکلیف اٹھا کر اور قربانی دے کر دوسروں کو خوش کرو، اگر تم تھوڑی سی تکلیف اٹھا لو گے اور اس کے نتیجے میں دوسروں کو راحت اور خوشی مل جائے گی تو دنیا میں چند لمحوں اور چند منٹوں کی جو تکلیف اٹھائی ہے اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ آخرت میں جو ثواب تمہیں عطا فرمائیں گے وہ دنیا کی اس معمولی سی تکلیف کے مقابلے میں کہیں زیادہ عظیم ہے۔

گناہ کے ذریعے دوسروں کو خوش نہ کریں:

دوسری طرف بعض لوگوں میں یہ بے اعتدالی پائی جاتی ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ چوں کہ دوسرے مسلمان کو خوش کرنا بڑی عبادت ہے، لہٰذا ہم تو یہ عبادت کرتے ہیں کہ دوسروں کو خوش کرتے ہیں، چاہے وہ خوش کرنا کسی گناہ کے ذریعہ ہو یا کسی ناجائز کام کے ذریعہ ہو، جب اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا کہ دوسروں کو خوش کرو تو ہم یہ عبادت انجام دے رہے ہیں۔ حالاں کہ یہ گمراہی کی بات ہے، اس لئے کہ دوسروں کو خوش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مباح اور جائز طریقے سے خوش کرو، اب اگر ناجائز طریقے سے دوسروں کو خوش کرو گے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ گناہ کرکے اللہ تعالیٰ کو تو ناراض کر دیا اور بندے کو خوش کر دیا، یہ کوئی عبادت نہیں۔ لہٰذا اگر دوسرے کی مروّت میں آکر یا اس کے تعلقات سے مرعوب ہو کر گناہ کا ارتکاب کر لیا تو یہ کوئی دین نہیں، یہ کوئی عبادت نہیں۔

فیضی شاعر کا واقعہ

اکبر بادشاہ کے زمانے میں "فیضی" بہت بڑے ادیب اور شاعر گزرے ہیں، ایک مرتبہ وہ حجام سے داڑھی منڈوا رہے تھے، ایک صاحب ان کے پاس سے گزرے، انہوں نے جب دیکھا کہ فیضی صاحب داڑھی منڈوا رہے ہیں تو ان سے کہا:

"آغا ریش می تراشی؟"

ترجمہ: "جناب! آپ یہ داڑھی منڈوا رہے ہیں؟"

جواب میں فیضی نے کہا:

"بلے! ریش می تراشم، و لے دلے کسے نمی خراشم"

ترجمہ: "جی ہاں! داڑھی تو منڈوا رہا ہوں لیکن کسی کا دل نہیں دکھا رہا۔"

مطلب یہ تھا کہ میرا عمل میرے ساتھ ہے اور میں کسی کی دل آزاری نہیں کر رہا، اور تم نے جو میرے اس عمل پر مجھے ٹوکا تو اس کے ذریعہ تم نے میرا دل دکھایا۔

اس پر ان صاحب نے جواب میں کہا:

"دلے کسے نمی خراشی، و لے دلے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) می خراشی"

یعنی جو یہ کہہ رہے ہو کہ میں کسی کا دل نہیں دکھا رہا ہوں، ارے اس عمل کے ذریعہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل دکھا رہے ہو۔[1]

تکلیف پہنچانا صرف زبان یا ہاتھ سے نہیں ہوتا بل کہ بسا اوقات احکام کی خلاف ورزی کر کے بھی تکلیف پہنچائی جاتی ہے۔ فیضی شاعر نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تکلیف پہنچائی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی خلاف ورزی کر کے پہنچائی ہے۔ ہم اپنے اردگرد کے ماحول پر نظر دوڑائیں تو نہ جانے کتنے لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کی خلاف ورزی کر کے دل آزاری کے مرتکب ہو رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کی تعمیل کی توفیق نصیب فرمائے۔ (آمین)

اللہ والے دوسروں کو خوش رکھتے ہیں

لہٰذا بعض لوگوں کے ذہن میں بھی اور زبان پر بھی یہ بات رہتی ہے کہ ہم تو

---

[1] اصلاحی خطبات: ص۲۸٤

دوسرے لوگوں کا دل خوش کرتے ہیں، اور اب دوسروں کا دل خوش کرنے کے لئے کسی گناہ کا ارتکاب بھی کرنا پڑا تو کر گزریں گے۔ بھائی! اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو پامال کر کے کسی انسان کا دل خوش کیا، تو کیا خوش کیا کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو تو ناراض کر دیا، یہ تو کوئی عبادت نہیں ہے دوسروں کو خوش رکھنے والی حدیث کا منشا یہ ہے جو جائز امور ہیں، ان میں مسلمانوں کو خوش کرنے کی فکر کرو۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

"یہ معمول صوفیاء کا مثل طبعی کے ہے۔"

یعنی صوفیاء کرام جو اللہ کے دوست اور اللہ کے ولی ہوتے ہیں، ہر مسلمان کو خوش کرنے کی فکر ان کی طبیعت بن جاتی ہے، ان کے پاس آ کر آدمی ہمیشہ خوش ہو کر جاتا ہے، ملول ہو کر نہیں۔ اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل سے ان کو اس سنت پر عمل کی توفیق ہوتی ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کو خوش کرتے ہیں۔ پھر آگے فرمایا:

"اس کی ایک شرط یہ ہے، وہ یہ کہ دوسروں کو سرور میں داخل کرنے سے خود شرور میں داخل نہ ہو جائے۔"

یعنی دوسروں کا تو دل خوش کر رہا ہے اور ان کو سرور دینے کی فکر میں ہے لیکن اس کے نتیجے میں خود شرور میں یعنی معاصی اور گناہ میں داخل ہو گیا، ایسا نہ کرے۔

امر بالمعروف کو نہ چھوڑے

"بعض لوگ تو اسی وجہ سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرتے۔" مثلاً اگر فلاں کو نماز پڑھنے کے لئے کہیں گے تو اس کا دل برا ہوگا، اگر فلاں کو کسی گناہ پر ٹوکیں گے تو اس کا دل برا ہوگا، اور ہم سے کسی کا جی برا نہ ہو۔ پھر فرمایا:

"کیا ان کو قرآن پاک کا یہ حکم نظر نہیں آیا کہ:

﴿وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ﴾ [1]

ترجمہ: "تم کو اللہ کے دین کے بارے میں ان پر ترس نہ آئے۔"

یعنی ایک شخص دین کی خلاف ورزی کر رہا ہے، گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے، اس کے بارے میں تمہارے دل میں یہ شفقت پیدا نہ ہو کہ اگر میں اس کو گناہ کرنے پر ٹوکوں گا تو اس کا دل دکھے گا۔

نرم انداز سے نہی عن المنکر کرے

البتہ یہ ضروری ہے کہ اس کو کہنے کے لئے طریقہ ایسا اختیار کرے جس سے اس کا دل کم سے کم دکھے، دل آزار اسلوب اختیار نہ کرے بل کہ نرمی کا انداز ہو، اس میں ہمدردی ہو، محبت ہو، شفقت ہو، خیر خواہی ہو، اخلاص ہو، غصہ نکالنا مقصود نہ ہو۔ لیکن یہ سوچنا کہ اگر میں اس کو ٹوکوں گا تو اس کا دل دکھے گا، چاہے کتنے بھی نرم انداز میں کہوں تو یہ سوچ درست نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا تمام مخلوق کو راضی کرنے سے مقدم ہے۔ لہٰذا دونوں انتہائیں غلط ہیں، افراط بھی اور تفریط بھی۔ بس اپنی طرف سے ہر مسلمان کو خوش کرنے کی کوشش کرو، لیکن جہاں اللہ کی حدود آجائیں، حرام اور ناجائز امور آجائیں تو پھر کسی کا دل دکھے یا خوش ہو، اس وقت بس اللہ ہی کا حکم ماننا ہے، اس وقت اطاعت صرف اللہ اور اللہ کے رسول ہی کی کرنی ہے، کسی اور کی پروا نہیں کرنی ہے۔ البتہ حتی الامکان نرمی کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ [2]

نظم وضبط کی پابندی تکلیف سے بچنے کا ایک حل

ہر جگہ اور ہر ادارے کے نظم وضبط کے کچھ قانون وآداب ہوتے ہیں جن کی رعایت رکھنا ضروری ہوتا ہے، نظم وضبط انسانی شرافت کا ایک اہم خاصہ ہے۔ اس

[1] النور: ۲ [2] اصلاحی خطبات: ۹/۲۸۱

طرح ادارے اور گھر سے باہر راستے پر چلنے، گاڑی میں بیٹھنے، گاڑی چلانے کے بھی اپنے اپنے آداب ہیں۔

بالکل اسی طرح کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جن کے کرنے کے لئے اجتماع کی صورت بن جاتی ہے کیوں کہ کئی لوگوں کا ایک ہی کام ہوتا ہے اور کام کے حل کرنے کی جگہ ایک ہوتی ہے، مثلاً بل جمع کرانا، پٹرول ڈلوانا، ٹکٹ لینا یا کسی کام کی درخواستیں وصول یا جمع کرانا، یہ ایسے مقامات ہوتے ہیں جہاں پر کئی افراد جمع ہوتے ہیں اور بیک وقت سب کا کام ہونا ممکن نہیں ہوتا تو ایسی صورت میں اگر ایک دوسرے سے تعاون نہ کیا جائے تو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور دوسروں کی حق تلفی کا گناہ بھی اور اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنے کا وبال بھی ہوتا ہے۔

مختلف جگہوں پر ایسے کاموں کے لئے لائن لگانی پڑتی ہے رش زیادہ ہے تو لائن لگائی جاتی ہے۔ اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ جو شخص آپ سے آگے کھڑا ہے، اس کی اجازت کے بغیر اس کی جگہ پر جانا یا اس سے آگے بڑھنا حرام ہے، لائن کی پابندی کرنا بہت ضروری ہے۔ بعض لوگ اس میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں کہ ہم لائن کے پابند نہیں، ہمیں کون روک سکتا ہے۔ جانور کو تو کوئی بھی نہیں روک سکتا، لیکن اگر وہ انسان ہے تو انسان ہونے کے ناطے تو اُسے رکنا چاہئے اسلامی احکام کا تقاضا بھی ہے۔

اکثر تجربہ یہ ہے کہ جو شخص لائن توڑ کر اپنا حق وصول کرتا ہے، آگے جا کر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا، جتنے لوگوں کا حق دبا کر، یا حق مار کر ان کی بددعائیں لے کر وہ آگے جاتا ہے تو کوئی ایسی ناگہانی پریشانی آجاتی ہے کہ جتنا وقت لائن میں لگتا اس سے زیادہ وقت وہاں لگانا پڑتا ہے، مثلاً ہم لوگ کسی گاڑی میں بیٹھے تھے گیس بھروانے کی لمبی لائن تھی، ڈرائیور نے لائن میں گاڑی کھڑی کرنے کے بجائے اپنی گاڑی آگے لے جا کر کھڑی کردی، کسی نے اعتراض کیا اس کو سمجھا دیا جب گاڑی کا نمبر آیا اچانک گیس کا پریشر ختم ہوگیا اور گیس نہیں بھروا سکے بسا اوقات

لائن توڑ کر اپنا کام کروالیا آگے گاڑی پنکچر ہوگئی۔

کبھی لائن توڑ کر انسان آگے پہنچ جاتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ لائن توڑ کر میں اتنے لوگوں سے آگے نکل گیا، اور میرا کام ہوگیا، حالاں کہ در حقیقت اُس نے اتنے لوگوں کا حق مار کر اللہ کو ناراض کیا۔ ایسے وقت میں اگر ہم نظم وضبط کی پابندی کریں تو دنیا و آخرت میں اجر کا باعث ہوگا اور اگر جلد بازی سے کام لیا تو دنیا میں بھی طعن و تشنیع کا نشانہ بنے گا اور آخرت میں بھی دوسروں کا حق مارنے کی وجہ سے مجرم ٹھہرے گا۔

یورپ کے معاشرے میں اگرچہ بہت ساری خرابیاں ہیں، لیکن معاشرہ کے آداب کے سلسلے میں ان میں بہت سی خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب بھی پانچ، سات آدمی کسی کام کے لئے جمع ہو جائیں تو اپنی لائن خود لگا لیتے ہیں، کسی کو کہنا نہیں پڑتا کہ لائن بنالو، خود بخود لائن بناتے ہیں اور لائن لگا کر پھر ایک دوسرے سے فاصلے پر کھڑے ہوتے ہیں تاکہ دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے۔ جب کہ ہمارے ہاں اولاً تو لائن لگانے کا رواج نہیں اور اگر کہیں لگتی ہے تو عام طور پر دھکم پیل ہوتی ہے اور ایک طوفانِ بدتمیزی برپا ہوتا ہے حالاں کہ شریعت اسلامی کا تقاضا وہ ہے جو اس معاملے میں یورپ کے لوگ کرتے ہیں کہ "اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ"[1] یہ اصول اسلام کا تھا لیکن اہل اسلام نے اسے چھوڑ دیا اور یورپ والوں نے اختیار کرلیا۔

تکلیف سے بچاؤ کا بارہواں راستہ

مخلوقِ خدا سے ہمدردی و خیر خواہی:

"وَعَنْ تَمِيْمٍ الدَّارِيِّ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:

[1] اس حدیث کی تمام تفصیل "تکلیف سے بچنے کا پانچواں راستہ" میں گزر چکی ہے وہاں دیکھ لی جائے۔

اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ قُلْنَا لِمَنْ قَالَ لِلّٰهِ وَلِكِتَابِهٖ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ."[1]

تَرْجَمَہ: "حضرت تمیم داری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "دین، نصیحت ہے" (یعنی نصیحت اور خیر خواہی اعمالِ دین میں سے افضل ترین عمل ہے یا نصیحت اور خیر خواہی دین کا ایک مہتم بالشان نصب العین ہے) ہم نے (یعنی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے) پوچھا کہ یہ نصیحت اور خیر خواہی کس کے لئے ہے اور کس کے حق میں کرنی چاہئے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے لئے، اللہ تعالیٰ کی کتاب کے لئے، اللہ کے رسول کے لئے، مسلمانوں کے اماموں (یعنی اسلامی حکومت کے سربراہوں اور علماء) کے لئے اور تمام مسلمانوں کے لئے۔"

اس حدیث میں نصیحت اور خیر خواہی کو اعمال دین میں سے بتایا گیا ہے، اس میں چند الفاظ ذکر ہوئے ہیں ان کا مطلب ومفہوم ذکر کیا جاتا ہے تاکہ اس حدیث کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا آسان ہو جائے۔

❶ لِلّٰهِ: اللہ کے حق میں خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر ایمان لائے اس کی وحدانیت وحاکمیت کا اعتقاد رکھے، اُس کی صفات وکارسازی میں کسی غیر کو شریک کرنے سے اجتناب کرے اُس کی عبادت اخلاصِ نیت کے ساتھ کرے، اُس کے اوامر ونواہی (احکامات) کی اطاعت وفرمانبرداری کرے اس کی نعمتوں کا اقرار واعتراف کرے اور اس کا شکر کرے اُس کے نیک اور فرمانبردار بندوں سے محبت رکھے اور بدکار وسرکش بندوں سے دور رہے۔

❷ وَلِكِتَابِهٖ: خدا کی کتاب کے حق میں خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کا

[1] مسلم، باب بيان أن الدين النصيحة: ۱/۵۴

عقیدہ رکھے کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے اس میں جو کچھ لکھا ہے اس پر ہر حالت میں عمل کرے تجوید و ترتیل اور غور و فکر کے ساتھ اس کی تلاوت کرے اور اُس کی تعظیم و احترام میں کوئی کوتاہی نہ کرے۔

❸ وَلِرَسُوْلِهٖ: اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کے حق میں خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کی سچے دل سے تصدیق کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول اور اس کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں اُن کی نبوت پر ایمان لائے وہ اللہ کی طرف سے جو پیغام پہنچائیں اور جو احکامِ دین ہیں اُن کو قبول کرے اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری کرے اُن کو اپنی جان، اپنی آل اولاد، اپنے ماں باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ عزیز و محبوب رکھے ان کے اہل بیت اور ان کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے محبت رکھے اور ان کی سنت پر عمل کرے۔

❹ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ: مسلمانوں کے اماموں کے حق میں خیر خواہی یہ ہے کہ جو شخص اسلامی حکومت کی سربراہی کر رہا ہو اُس کے ساتھ وفاداری کو قائم رکھے، احکام و قوانین کی بے جا طور پر خلاف ورزی کر کے اُن کے نظمِ حکومت میں خلل و ابتری پیدا نہ کرے اچھی باتوں میں اُن کی پیروی کرے اور بری باتوں میں ان کی اطاعت سے اجتناب کرے اگر وہ اسلام اور اپنے عوام کے حقوق کی ادائیگی میں غفلت و کوتاہی کا شکار ہوں تو ان کو مناسب اور جائز طریقوں سے متنبہ کرے اور ان کے خلاف بغاوت کا علم بلند نہ کرے اگرچہ وہ کوئی ظلم ہی کیوں نہ کریں!

علماء کرام جو مسلمانوں کے علمی و دینی رہنما ہوتے ہیں ان کی عزت و احترام کرے، شرعی احکام اور دینی مسائل میں وہ قرآن و سنت کے مطابق جو کچھ کہیں اس کو قبول کرے اور اس پر عمل کرے، ان کی اچھی باتوں اور ان کے نیک اعمال کی پیروی کرے۔

❺ وَعَامَّتِهِمْ: تمام مسلمانوں کے حق میں خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ ان کی

دینی و دنیاوی خیر و بھلائی کا طالب رہے ان کو دین کی تبلیغ کرے ان کو دنیا کے جائز راستوں پر چلانے کی کوشش کرے اور ان کو کسی بھی طرح نقصان پہنچانے کے بجائے نفع پہنچانے کی سعی (کوشش) کرے۔

واضح رہے کہ یہ حدیث بھی "جوامع الکلم" میں سے ہے، اس کے مختصر الفاظ حقیقت میں دین و دنیا کی تمام بھلائیوں اور سعادتوں پر حاوی ہیں اور تمام علوم اوّلین و آخرین اس چھوٹی سی حدیث میں درج ہیں۔

"حضرت جریر ابن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے اس بات پر بیعت کی کہ پابندی کے ساتھ نماز پڑھوں گا، زکوٰۃ ادا کروں گا اور ہر مسلمان کے حق میں خیر خواہی کروں گا۔"[1]

اللہ تعالیٰ کی تمام تر عبادت و طاعت کا تعلق دو ہی چیزوں سے ہے ① حقوق اللہ ② حقوق العباد، لہٰذا حضرت جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حقوق اللہ میں خاص طور پر ان عباداتِ کا ذکر کیا جو تمام بدنی اور مالی عبادتوں میں شہادتین کے بعد سب سے اعلیٰ و افضل ہیں اور ارکان اسلام میں سے اہم ترین ہیں یعنی نماز اور زکوٰۃ، جہاں تک روزہ اور حج کا تعلق ہے تو ہو سکتا ہے کہ جس وقت حضرت جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیعت کی ہو اس وقت تک یہ دونوں روزہ اور حج مسلمانوں پر فرض نہ قرار دیئے گئے ہوں! اسی طرح حقوق العباد سے متعلق اس چیز کو ذکر کیا جس کے دائرے میں بندوں کے تمام حقوق آجاتے ہیں یعنی خیر خواہی۔

انہی حضرت جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک واقعہ اسی موقع کے نہایت مطابق ہے اور جس سے اُن کی مذکورہ بالا بیعت کا ایک عملی نمونہ سامنے آتا ہے منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک گھوڑا تین سو درہم میں خریدا، پھر انہوں

[1] بخاری، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم الدین النصیحۃ: ۱/۲۳

نے بیچنے والے سے کہا تمہارا گھوڑا تو تین سو درہم سے زیادہ قیمت کا ہے کیا تم اس کی قیمت پانچ سو درہم لینا پسند کرو گے؟ وہ اسی طرح اس کی قیمت سو سو درہم بڑھاتے گئے اور آخر کار انہوں نے اس گھوڑے کی قیمت میں آٹھ سو درہم ادا کئے جب لوگوں نے ان سے اس گھوڑے کی قیمت بڑھانے کا سبب پوچھا تو انہوں نے فرمایا اصل بات یہ ہے کہ میں نے رسولِ کریم ﷺ سے یہ بیعت کی تھی کہ ہر مسلمان سے خیر خواہی کروں گا (چناں چہ میں نے دیکھا کہ اس گھوڑے کا مالک وہ قیمت طلب نہیں کر رہا ہے جو حقیقت میں ہونی چاہئے تو میں نے اس کی خیر خواہی کے پیشِ نظر اس کو زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کی)۔[1]

دین اور خیر خواہی لازم وملزوم

عربی گرامر میں جملے کے دو جزء ہوتے ہیں ① مبتدا ② خبر۔ عام طور پر پہلا معرفہ ہوتا ہے اور دوسرا نکرہ۔ لیکن یہاں پر عجیب معاملہ ہے لفظ اَلدِّیْنُ (جو کہ مبتدا ہے) بھی معرفہ ہے اور اَلنَّصِیْحَۃُ (جو کہ خبر ہے) بھی معرفہ ہے (یعنی دونوں کے شروع میں الف لام ہے جو نکرہ کو معرفہ بناتا ہے)۔ علماء نے لکھا ہے کہ جب دونوں کو معرفہ لایا جائے تو وہ لازم وملزوم ہوا کرتے ہیں اور ان میں چولی دامن کا ساتھ ہوا کرتا ہے۔ اس کا یہ معنی بنے گا کہ جو دین ہے وہ سراسر خیر خواہی ہے۔ اور جو کچھ خیر خواہی ہے وہ سراسر دین ہے۔ آپ کو جہاں دین ملے گا وہاں آپ کو خیر خواہی ملے گی اور جہاں آپ کو خیر خواہی ملے گی سمجھ لینا کہ وہاں دین موجود ہے۔ جہاں آپ کو مسلمان دوسرے مسلمان کا بدخواہ نظر آئے تو سمجھ لینا کہ دین درمیان میں سے نکل چکا ہے۔

اسی لئے ایمان والوں کو چاہئے کہ ان کی سوچ ہمیشہ مثبت ہو، منفی سوچ سے بچیں۔ دوسروں کی برائیوں کو بھی نظر انداز کر دیا کریں اور اپنی طرف سے ان کے

[1] مسلم، باب بیان أن الدین النصیحة، حاشیة النووی: ۱/۵۵

ساتھ اچھائی کا معاملہ کریں اس کو خیر خواہی کہتے ہیں۔ ایسا بندہ اللہ تعالیٰ کو بڑا پسند ہوتا ہے جو دوسروں کی خیر خواہی کرتا ہے۔ چناں چہ نبی عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ نے ارشاد فرمایا اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ[1] تَرْجَمَہ: ''دین سراسر خیر خواہی ہے۔''

جیسے کہتے ہیں کہ فلاں بندے نے دو لفظوں میں بات سمجھا دی۔ اسی طرح نبی عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ نے ان دو لفظوں میں پورا دین سمجھا دیا۔

مؤمن کا تو کام ہی یہ ہے کہ ساری مخلوق کی خیر خواہی کرے، ہر ایک کو اس سے فائدہ پہنچے، بجائے کسی کو تکلیف پہنچانے کے ان کے دکھ درد میں کام آئے۔ اس کا طرزِ زندگی ایسا ہو کہ اس کے عزیز رشتہ دار، پڑوسی، محلّہ دار، دوست احباب۔ سب کو یقین ہو کہ یہ ایسا بااخلاق انسان ہے کہ ہمیں اس سے تکلیف نہیں پہنچ سکتی۔

حضرت مولانا احمد علی لاہوری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی فرمایا کرتے تھے: اللہ تعالیٰ کو عبادت سے نبی اکرم ﷺ کو اطاعت سے اور مخلوقِ خدا کو خدمت سے راضی کرو۔ آپ مخلوقِ خدا کی خدمت کو اپنا نصب العین بنالیں۔ بزرگوں کا قول ہے:

''ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد
ہر کہ خود را دید او محروم شد''

تَرْجَمَہ: ''جو کوئی بھی خدمت کرتا ہے وہ مخدوم بن جاتا ہے اور جو کوئی اپنے آپ کو دیکھتا رہتا ہے (کہ کوئی اس کی خدمت کرے آخر کار) وہ محروم رہ جاتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق کے ساتھ بڑا پیار ہے۔ آپ اس کا تجربہ کر لیں کہ کسی نے اپنے ہاتھوں سے محنت کر کے کوئی چیز بنائی، وہ چیز پتھر ہی کیوں نہ ہو، لیکن اس بنانے والے کو اس بنائے ہوئے پتھر سے محبت ہوجاتی ہے کہ اس پتھر کے بنانے میں وقت لگایا ہے، میں نے محنت کی ہے، یہ میری دولت ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی

[1] بخاری، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم الدین النصیحة: ۱/۱۳

مخلوق کو بنایا اور ان کو پیدا کیا، اس لئے ان کو اپنی مخلوق سے محبت ہے، لہٰذا اگر ان سے محبت کا دعویٰ ہے تو ان کی مخلوق سے بھی محبت کرنی ہوگی۔

مخلوق سے ہمدردی خالق سے محبت کی علامت

① حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالیٰ نے فرمایا: جب ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، اور اس سے محبت کی دعائیں مانگتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں اپنی محبت عطا فرما۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یوں فرما رہے ہیں: تم مجھ سے محبت کرنا چاہتے ہو؟ حالاں کہ تم نے مجھے دیکھا تو ہے نہیں کہ براہِ راست تم مجھ سے محبت کرسکو، اور مجھ سے اسی طرح کا تعلق قائم کرسکو جیسے کسی چیز کو دیکھتے ہوئے کیا جاسکتا ہے، لیکن اگر تمہیں مجھ سے تعلق قائم کرنا ہے تو میں نے دنیا میں اپنی محبت کا مظہر ان بندوں کو بنایا ہے۔ لہٰذا تم میرے بندوں سے محبت کرو اور میرے بندوں پر رحم کھاؤ۔ اور ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرو، اس سے میری محبت پیدا ہوگی۔ اور مجھ سے محبت کرنے کا طریقہ بھی یہی ہے۔

لہٰذا یہ سمجھنا کہ ہم تو اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ یہ بندے کیا چیز ہیں؟ یہ مخلوق کیا چیز ہیں؟ یہ تو حقیر ہیں۔ اور پھر ان مخلوق کی طرف حقارت کی نگاہ ڈالنا، ان کو برا سمجھنا اور ان کو کمتر جاننا، یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ سے جو محبت ہے، وہ جھوٹی محبت ہے، اس لئے کہ جس کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے محبت ہوگی، اس کو اللہ کی مخلوق سے ضرور محبت ہوگی۔

② جب حضرت نوح عَلَيْهِ السَّلَام کی قوم پر طوفان آچکا، ساری قوم اس طوفان کے نتیجے میں ہلاک ہوگئی تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ حضرت نوح عَلَيْهِ السَّلَام کو حکم دیا کہ اب تمہارا کام یہ ہے کہ تم مٹی کے برتن بناؤ، چناں چہ حضرت نوح عَلَيْهِ السَّلَام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں مٹی کے برتن بنانا شروع کردیئے اور دن

رات اس میں لگے رہے۔

جب کئی دن گزر گئے اور برتنوں کا ڈھیر لگ گیا تو دوسرا حکم یہ دیا کہ اب سب برتنوں کو ایک ایک کر کے توڑو حضرت نوح عَلَيْهِ السَّلَام نے عرض کیا کہ یا اللہ! میں نے بڑی محنت سے اور آپ کے حکم پر بنائے تھے اب آپ ان کو توڑنے کا حکم دے رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہمارا حکم یہ ہے کہ اب ان کو توڑ دو۔ چناں چہ حضرت نوح عَلَيْهِ السَّلَام نے ان کو توڑ دیا لیکن دل دکھا کہ اتنی محنت سے بنائے اور ان کو تڑوا دیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے نوح! تم نے اپنے ہاتھوں سے یہ برتن بنائے اور میرے حکم سے بنائے، ان برتنوں سے تمہیں اتنی محبت ہوگئی کہ جب میں نے تمہیں ان کو توڑنے کا حکم دیا تو تم سے توڑا نہیں جا رہا تھا، دل یہ چاہ رہا تھا کہ یہ برتن جو میری محنت اور میرے ہاتھ سے بنے ہوئے ہیں، کسی طرح بچ جائیں تو بہتر ہے اس لئے کہ تمہیں ان برتنوں سے محبت ہوگئی تھی۔ لیکن تم نے ہمیں نہیں دیکھا کہ ساری مخلوق ہم نے اپنے ہاتھ سے بنائی، اور تم نے ایک مرتبہ کہہ دیا:

﴿رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا﴾[1]

تَرجَمَہ: "اے اللہ! زمین میں بسنے والے سب کافروں کو ہلاک کر دے، اور ان میں سے کوئی باقی نہ رہے۔" تمہارے اس کہنے پر ہم نے اپنی مخلوق کو ہلاک کردیا۔

اشارہ اس بات کی طرف فرمایا کہ جس مٹی سے تم برتن بنا رہے تھے، باوجود یہ کہ وہ مٹی تمہاری پیدا کی ہوئی نہیں تھی اور اپنی خواہش سے وہ برتن نہیں بنا رہے تھے۔ بل کہ میرے حکم سے بنا رہے تھے پھر بھی تمہیں ان سے محبت ہوگئی تھی تو کیا ہمیں اپنی مخلوق سے محبت نہیں ہوگی؟ جب محبت ہے تو پھر تمہیں بھی میری مخلوق کے ساتھ

[1] سورۃ نوح: ۲۶

محبت کرنی پڑے گی اگر تمہیں میرے ساتھ محبت ہے۔[۱]

حضرت یوسف علیہ السلام کی خیر خواہی

﴿وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ۗ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۗ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾[۲]

ترجمہ: ”اور داخل ہوئے قید خانہ میں اس کے ساتھ دو جوان، کہنے لگا ان میں سے ایک میں دیکھتا ہوں کہ نچوڑتا ہوں شراب اور دوسرے نے کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ اٹھا رہا ہوں اپنے سر پر روٹی کہ جانور کھاتے ہیں اس میں، بتلا ہم کو اس کی تعبیر، ہم دیکھتے ہیں تجھ کو نیکی والا۔“

اس آیت کے تحت مفتی شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

قصہ یوسف علیہ السلام کو اوّل سے آخر تک دیکھئے تو اس میں سینکڑوں عبرت و موعظت (نصیحت) کے مواقع اور انسانی زندگی کے مختلف ادوار کے لئے اہم ہدایتیں ہیں، یہ ذیلی قصہ بھی بہت سی ہدایات اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔

واقعہ یہ ہوا کہ یوسف علیہ السلام کی برأت اور پاکی بالکل واضح ہو جانے کے باجود عزیز مصر اور اس کی بیوی نے بدنامی کا چرچا ختم کرنے کے لئے کچھ عرصہ کے لئے یوسف علیہ السلام کو جیل میں بھیج دینے کا فیصلہ کر لیا، جو درحقیقت یوسف علیہ السلام کی دعا اور خواہش کی تکمیل تھی، کیوں کہ عزیز مصر کے گھر میں رہ کر عصمت بچانا ایک سخت اور مشکل معاملہ ہو گیا تھا۔[۳]

یوسف علیہ السلام جیل میں پہنچے تو ساتھ دو مجرم قیدی اور بھی داخل ہوئے، ان

[۱] اصلاحی خطبات: ۲۲۲/۸ [۲] یوسف: ۳۶

[۳] معارف القرآن: ۶۷/۵، یوسف: ۳۶

میں سے ایک بادشاہ کا ساقی اور دوسرا باورچی تھا، علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ نے بحوالہ ائمہ تفسیر لکھا ہے: یہ دونوں اس الزام میں گرفتار ہوئے تھے کہ انہوں نے بادشاہ کو کھانے وغیرہ میں زہر دینے کی کوشش کی تھی، مقدمہ زیر تحقیق تھا، اس لئے ان دونوں کو جیل میں رکھا گیا۔[۱]

یوسف علیہ السلام جیل میں داخل ہوئے تو اپنے پیغمبرانہ اخلاق اور رحمت و شفقت کے سبب سب قیدیوں کی دل داری اور خبر گیری کرتے تھے، جو بیمار ہو گیا اس کی عیادت اور خدمت کرتے، جس کو غمگین و پریشان پایا اس کو تسلی دیتے، صبر کی تلقین اور رہائی کی امید سے اس کا دل بڑھاتے تھے، خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام دینے کی فکر کرتے، اور رات بھر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتے تھے، اُن کے یہ حالات دیکھ کر جیل کے سب قیدی آپ کی بزرگی کے معتقد ہو گئے، جیل کا افسر بھی متاثر ہوا، اس نے کہا کہ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں آپ کو چھوڑ دیتا، اب اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

یہ دو قیدی جو یوسف علیہ السلام کے ساتھ جیل میں گئے تھے ایک روز انہوں نے کہا کہ آپ ہمیں نیک صالح بزرگ معلوم ہوتے ہیں، اس لئے آپ سے ہم اپنی خواب کی تعبیر دریافت کرنا چاہتے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور بعض دوسرے ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ یہ خواب انہوں نے حقیقۃً دیکھے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ خواب کچھ نہ تھا، محض یوسف علیہ السلام کی بزرگی اور سچائی کی آزمائش کے لئے خواب بنایا تھا۔[۲]

بہر حال اُن میں سے ایک یعنی شاہی ساقی نے تو یہ کہا: میں نے خواب میں دیکھا کہ میں انگور سے شراب نکال رہا ہوں، اور دوسرے یعنی باورچی نے کہا: میں

[۱] تفسیر ابن کثیر: ص۶۸۵، یوسف: ۳۶

[۲] تفسیر ابن کثیر: ص۶۸۶، یوسف۳۶

نے دیکھا کہ میرے سر پر روٹیوں کا کوئی ٹوکرا ہے، اس میں سے جانور نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں، اور درخواست کی کہ ہمیں ان دونوں خوابوں کی تعبیر بتلائیے۔

علامہ ابن کثیر رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی نے فرمایا: اگرچہ ان دونوں کے خواب الگ الگ تھے اور ہر ایک کی تعبیر متعین تھی، اور یہ بھی متعین تھا کہ شاہی ساقی بری ہو کر اپنی ملازمت پر پھر فائز ہوگا، اور باورچی کو سولی دی جائے گی، تاکہ وہ ابھی سے غم میں نہ گھلے، بل کہ اجمالی طور پر یوں فرمایا کہ تم میں سے ایک رہا ہو جائے گا، اور دوسرے کو سولی دی جائے گی۔

آخر میں حضرت یوسف عَلَيْهِ السَّلَام نے فرمایا: ﴿قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيٰنِ﴾[1] میں نے تمہارے خوابوں کی تعبیر جو دی ہے محض اٹکل اور تخمینہ سے نہیں بل کہ یہ خدائی فیصلہ ہے جو ٹل نہیں سکتا، جن حضرات مفسرین نے ان لوگوں کے خوابوں کو غلط اور بناوٹی کہا ہے انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جب یوسف عَلَيْهِ السَّلَام نے خوابوں کی تعبیر بتلائی تو یہ دونوں بول اٹھے کہ ہم نے تو کوئی خواب دیکھا نہیں محض بات بنائی تھی، اس پر حضرت یوسف عَلَيْهِ السَّلَام نے فرمایا ﴿قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيٰنِ﴾[2] چاہے تم نے یہ خواب دیکھا یا نہیں دیکھا اب واقعہ یوں ہی ہوگا، جو بیان کیا گیا ہے، مقصد یہ ہے کہ جھوٹا خواب بنانے کے گناہ کا جو ارتکاب تم نے کیا تھا اب اس کی سزا یہی ہے جو تعبیر خواب میں بیان ہوئی۔

نبی اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی اپنی اُمت کے ساتھ خیر خواہی و شفقت

حضور اقدس نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جو تمام دنیا کے لئے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجے

[1] یوسف: ٤١

[2] تفسیر ابن کثیر: ص:٢٨٦، یوسف: ٤١

گئے، جب آپ پر کفار کی طرف سے اینٹیں برسائی جارہی تھیں، آپ کو پتھر مارے جارہے تھے، آپ کے پاؤں زخم سے لہولہان تھے، لیکن اس وقت بھی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے کہ:

"اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ"[1]

تَرجَمَۃ: "اے اللہ! میری قوم کو ہدایت عطا فرما، ان کو علم نہیں ہے، یہ مجھے جانتے نہیں ہیں، یہ نادان ہیں، اور نادانی میں یہ حرکت کر رہے ہیں، اے اللہ! ان کو ہدایت عطا فرما۔"

زبان پر یہ الفاظ اس لئے جاری ہوئے کہ کفار کے ان اعمال سے تو نفرت اور بغض ہے۔ لیکن ان کی ذات سے نفرت نہیں، اور ذات بحیثیت ذات کے میرے اللہ کی مخلوق ہے اور میرے اللہ کی مخلوق سے مجھے محبت ہے۔[2]

آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اپنی اُمت کے کتنے خیر خواہ تھے اس کا اندازہ اس آیتِ مبارکہ سے لگائیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾[3]

تَرجَمَۃ: "تمہاری تکلیف اُن پر شاق گزرتی ہے۔"

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز تم کو مشقت میں ڈالنے والی ہے وہ نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کو نہایت ہی شاق و گراں گزرتی ہے۔

یعنی تمہاری تکلیف سے نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کو ضرور تکلیف ہوتی ہے۔ تمہارے درد کو وہ درد سمجھتے ہیں واضح ہو کہ نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی یہ صفت کفار اور مؤمنین دونوں کے حق میں تھی۔

(1) نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جب کفار کو کفر و شرک میں دیکھتے اور خیال فرمایا کرتے کہ یہ لوگ

[1] بخاری: کتاب احادیث الأنبیاء: ١/٤٩٥، رقم: ٣٤٧٧

[2] اصلاحی خطبات: ٨/٢٢٧ [3] التوبة: ١٢٨

کس انجام بد کا شکار ہونے والے ہیں۔ یہ لوگ کیوں کر اپنے ہاتھوں اپنے لیے ہلاکت کا کنواں کھود رہے ہیں، تب حضور ﷺ کے دل پر نہایت صدمہ گزرتا تھا۔

بسا اوقات یہ کیفیت اس قدر بڑھ جاتی کہ اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کی تسلی و سکون کے لیے اپنا کلام و پیغام بھیجتے۔

سورۂ یٰسین میں ہے ﴿فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ﴾[1] ان کی باتوں سے آپ اپنا جی برا نہ کریں۔

سورۂ آل عمران میں ہے ﴿وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ﴾[2] کفر میں بڑھ بڑھ کر حصہ لینے والوں کی حالت سے آپ غمگین نہ ہوں۔

واقعات بدر میں مذکور ہے کہ جب کفار مکہ قید کر لیے گئے تو رات کو نبی اکرم ﷺ کو نیند نہ آئی، اِدھر سے اُدھر حضور ﷺ کروٹیں لیتے تھے کرب و اضطراب نمایاں تھا، ایک انصاری نے عرض کیا: حضور ﷺ کو کچھ تکلیف ہے، فرمایا: نہیں، مگر عباس کے کراہنے کی آواز میرے کان میں آرہی ہے، اس لیے مجھے چین نہیں پڑتا۔

انصاری چپکے سے اُٹھا، اس نے جا کر عباس کی مشک بندی کھول دی، انہیں آرام مل گیا، تو وہ فوراً سو گئے۔ انصاری پھر حاضر خدمت ہوگیا، حضور ﷺ نے پوچھا: اب عباس کی آواز کیوں نہیں آتی۔ انصاری بولا: میں نے ان کے بندھن کھول دیے ہیں، فرمایا: جاؤ سب قیدیوں کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرو۔ جب حضور ﷺ کو اطلاع دی گئی کہ سب قیدی اب آرام سے ہیں، تب نبی کریم ﷺ کا اضطراب دور ہوا اور حضور خواب شیریں سے استراحت گزیں ہوئے۔

ذرا سوچنا ہے، قیدی وہ تھے جنہوں نے ۱۳ سال تک متواتر اہل ایمان کو ستایا

[1] یٰسٓ: ۷۶ [2] آل عمران: ۱۷۶

تھا، کسی کو آگ پر لٹایا کسی کو خون میں نہلایا، کسی کو بھاری پتھروں کے نیچے دبایا، کسی کو سخت اذیتوں کے بعد خاک و خون میں سلایا تھا اور پھر اُن پر یہ نرمی، یہ سلوک!۔

عباس حضور ﷺ کے چچا تھے، اور جہاں تک معتبر روایات سے معلوم ہوا ہے، وہ بادلِ ناخواستہ صرف قوم کے اکراہ و اجبار (مجبور کرنے سے) سے بدر میں آئے تھے اس وجہ سے حضور کے عدل و انصاف نے ان میں اور دوسرے قیدیوں میں کوئی امتیازی فرق قائم کرنا پسند نہ فرمایا۔

لیکن حضور ﷺ کی رحم دلی اور طبعی شفقت و رأفت کا یہ عالم تھا کہ جب تک سب قیدیوں کے با آرام ہونے کی رپورٹ نہ لی اس وقت تک حضور ﷺ کو نیند تک نہ آئی۔

﴿عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾[1] کا یہ جلوہ ایسے حملہ آوران و دشمنانِ جانی و ایمانی کے مقابلہ میں تھا۔

۲ جب نبی ﷺ ہجرت فرما کر رونق افروز مدینہ ہو چکے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ﴾[2] کا مفہوم ظاہر فرمایا اور اہلِ مکہ پر قحط شدید کی آفت کو اُتارا قحط اس شدت کا تھا کہ اہلِ مکہ کی آنکھوں کی روشنی بھی کم ہوگئی۔

ابوسفیان اموی ہمیشہ مسلمانوں سے برسرِ پرخاش (لڑائی پر آمادہ) رہا کرتا تھا۔ وہ خود دربار مصطفوی ﷺ میں حاضر ہوا اور نہایت ادب سے عرض کیا: حضور ﷺ ہمیشہ احسان اور صلہ رحم کی تعلیم دیا کرتے ہیں۔ ہم حضور ﷺ کے قرابتی (رشتہ دار) ہیں اور رحم کے ملتجی (درخواست)۔ احسان فرمایئے اور دعا کیجیے کہ اس قحط شدید سے ہمیں نجات ملے۔

نبی کریم ﷺ نے ثمامہ بن اُثال سردار نجد کو "جو دولتِ ایمانی سے مالا مال

[1] التوبۃ: ۱۲۸ [2] الانفال: ۳۳

ہو چکا تھا" حکم بھیج دیا کہ مکہ میں فوراً غلہ پہنچانے کا بندوبست کرے اس کے علاقہ میں اناج بکثرت تھا، اُس نے غلہ صرف اسی لئے روک رکھا تھا اور منفعت تجارت کو بھی نظر انداز کر دیا تھا کہ اہل مکہ دشمنانِ رسول ہیں، اب حکم نبوی کی تعمیل ہوئی اور اہل مکہ کی جان میں جان آئی۔

یہ بھی دشمنوں کے مقابلہ میں ﴿عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾[1] کا ایک ثبوت تھا۔

۳ جنگ طائف ان حملہ آوروں کے ساتھ ہوئی جن سے حنین واوطاس میں شدید محاربہ (مقابلہ) ہوا تھا، یہ لوگ ان مقامات سے شکست کھا کر طائف کے قلعہ میں جمع ہو گئے تھے اور ابھی ان کی فوجی طاقت زوروں پر تھی۔ نبی کریم ﷺ نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ چند روز کے بعد حضور ﷺ کو معلوم ہوا کہ دشمن محاصرہ کی شدت سے سخت تکلیف میں ہے، بھوک نے اُن کی ہلاکت کو بہت قریب کر دیا ہے۔ حضور ﷺ نے محاصرہ اٹھا دینے کا حکم دے دیا۔ چند صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے جنگی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے عرض بھی کیا کہ اب تو قلعہ فتح ہی ہونے والا ہے۔ مگر حضور ﷺ نے ازراہ کرم جو حکم دیا تھا، اُس کی تعمیل کرائی۔[2] یہ واقعہ ﴿عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾[3] کا تیسرا نمونہ ہے۔

ان نظائر سے واضح ہو جاتا ہے۔ ایسے نظائر اور بھی بہت ہیں کہ قلبِ رحیم اور طبعِ کریم پر اہل محاربہ کی حالت زبوں اور انجام بد کا کیا اثر ہوا کرتا تھا۔

اہل اسلام کے متعلق حضور ﷺ کی رحمت و شفقت کا بیان بے پایاں ہے۔

عبادات و معاملات میں ایسی مثالیں بکثرت ملتی ہیں کہ اُمت کو دشواری سے بچانے کے لئے یا اُمت کی آسانی کے لئے حضور کیا کچھ توجہ فرمایا کرتے تھے،

---

[1] التوبۃ: ۱۲۸ [2] مسلم، باب غزوۃ طائف: ۲/۱۰۱
[3] التوبۃ: ۱۲۸

یعنی اُمت کی تکلیف اور اُمت کی راحت کو اپنی راحت قرار دے رکھا تھا۔

صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس اور ابوحبہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے: شب معراج کو پچاس نمازیں فرض کی گئی تھیں۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے نبی کریم ﷺ سے فرمایا: "اِنَّ اُمَّتَكَ لَا تُطِيْقُ" (آپ کی اُمت میں اتنی عبادت کی طاقت نہیں) تب حضور ﷺ نے رجوع الی اللہ فرمایا۔ تخفیف ہوئی موسیٰ علیہ السلام نے پھر بھی حضور ﷺ کو وہی کہا جو پہلے کہا تھا اور نبی کریم ﷺ ہر بار رجوع الی اللہ فرماتے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پانچ نمازیں رہ گئیں۔[1]

اس واقعہ سے دو نتیجے صاف طور پر برآمد ہوتے ہیں:

اوّل: نبی کریم ﷺ فرمان رحمٰن کے کتنے مطیع تھے کہ جب پچاس نمازوں کا حکم ہوا تو حضور نے اس بارہ میں ذرا بھی لب کشائی نہیں فرمائی۔

دوم: حضور ﷺ اپنی امت پر کس قدر مہربان تھے کہ جب موسیٰ کلیم اللہ جیسے تجربہ کار نبی نے "اِنَّ اُمَّتَكَ لَا تُطِيْقُ" کو دُہرایا تو فوراً اس پاک فطرت کا ظہور ہوا جو ﴿عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ میں پنہاں تھی اور حضور ﷺ نے بار بار رجوع الی اللہ فرمایا۔

اس حسنِ ادب اور التماس و التجا کا ثمرہ یہ ہوا کہ تعداد تو پچاس سے پانچ رہ گئی اور ثواب وہی پچاس کا رکھا گیا۔

میرا خیال ہے کہ اگر سیدنا موسیٰ علیہ السلام "اِنَّ اُمَّتَكَ لَا تُطِيْقُ" کے جملہ کا استعمال نہ فرماتے اور حضور ﷺ کو کسی اور دلیل سے التماس تخفیف پر مائل کرنا چاہتے تو وہ اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکتے۔

نبی اکرم ﷺ کے کمال عبودیت اور شوق عبادت کے سامنے تو پچاس

---

[1] بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب کیف فرضت الصلوٰۃ فی الاسراء: ۱/۵۰

نمازوں کی کثرت بھی کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ آپ کا قلبِ شاکر اور وہ لسان ذاکر جو یادِ الٰہی سے ایک دم کے لئے غافل نہ ہوتے ہوں، ان کے لئے محدود وقت میں معدود رکعتوں کا ادا کر لینا کیا دشوار ہو سکتا ہے۔

④ ماہِ رمضان تھا، نبی اکرم ﷺ مدینہ سے مکہ معظمہ کو تشریف لا رہے تھے، حضور ﷺ روزے رکھا کرتے تھے، جب مقام عسفان پہنچے تو حضور ﷺ نے پانی منگایا اور دستِ مبارک کو بلند کرتے ہوئے لوگوں کو دکھلا کر پانی پی لیا اور پھر مکہ پہنچنے تک روزہ نہ رکھا۔[1]

یہ ترجمہ تو صحیح بخاری کی روایت عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ہے، لیکن دیگر روایات میں صراحت ہے کہ نبی ﷺ نے اس لئے روزہ افطار فرمایا اور روزہ نہ رکھا کہ اہلِ لشکر کو سفر میں روزہ کی شدت تکلیف دہ تھی اور امت کی تکلیف سے حضور ﷺ خود تکلیف محسوس فرماتے تھے۔[2]

⑤ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے دو رات تراویح کی نماز لوگوں کے ساتھ پڑھی اور تیسری شب کو حضور ﷺ مسجد میں نماز کے لئے تشریف نہ لے گئے۔ اور پھر صبح لوگوں سے فرمایا:

"قَدْ رَأَيْتُ الَّذِي صَنَعْتُمْ فَلَمْ يَمْنَعْنِي مِنَ الْخُرُوجِ إِلَيْكُمْ إِلَّا أَنِّي خَشِيتُ أَنْ تُفْرَضَ عَلَيْكُمْ."[3]

ترجمہ: "اس نماز کے لئے تمہارا آنا، انتظار کرنا وغیرہ میں نے دیکھا، مجھے آنے میں صرف یہ خیال مانع ہوا کہ کہیں یہ نماز تم پر فرض نہ کر دی جائے۔"

[1] بخاری، باب من أفطر في السفر ليراه الناس: ۱/۲۶۱
[2] مسلم، باب جواز الصوم والفطر في شهر رمضان: ۱/۳۵۶
[3] نسائي، باب قيام شهر رمضان: ۱/۲۳۸

⑥ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نماز تہجد میں تھے، میں حضور ﷺ کے ساتھ جا شامل ہوا۔ حضور ﷺ نے میری اقتداء کو محسوس کیا تو نماز ہلکی کر دی۔[1]

⑦ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے نبی اکرم ﷺ کے طرزِ عمل کو ان الفاظ میں روایت فرمایا ہے:

"إِنْ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيَدَعُ الْعَمَلَ وَهُوَ يُحِبُّ أَنْ يَعْمَلَ بِهِ خَشْيَةَ أَنْ يَعْمَلَ بِهِ النَّاسُ فَيُفْرَضَ عَلَيْهِمْ."[2]

ترجمہ: "نبی کریم ﷺ ایسے عمل کو بھی چھوڑ دیتے جس کا کرنا حضور ﷺ کو پسند ہوتا، اس خیال سے کہ لوگ بھی عمل کرنے لگیں گے اور کہیں وہ عمل فرض نہ ٹھہرایا جائے۔"

ان جملہ روایات سے ثابت ہو جاتا ہے کہ ﴿عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ کی صفت حضور ﷺ میں کیسی مستحکم تھی اور امت کی تکلیف کا خیال حضور ﷺ پر کس قدر تھا۔

یہ محبت، یہ شفقت، یہ الفت، یہ پیار تو ماں باپ کو بھی اپنی سب اولاد کے ساتھ یکساں نہیں ہوتا جو حضور ﷺ کو اپنی امت کے ساتھ تھا۔

بے شک حضور ﷺ کی رحمت رب العالمین کے بعد ہر ایک رحم کرنے والے اور محبت کرنے والے سے برتر اور بڑھ کر تھی۔

﴿حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ﴾[3]

[1] مسلم، باب أمر الأئمة بتخفيف الصلوة: ۱/۱۸۸
[2] بخاري، باب تحريض النبيّ على قيام الليل والنوافل من غير ايجاب: ۱/۱۵۲
[3] التوبة: ۱۲۸

جب حرص کا استعمال علیٰ کے صلہ سے کیا جاتا ہے تو اس کے معنی شدت طلب ہوتے ہیں آیت کا ترجمہ یہ ہوا کہ "ہمارا نبی ﷺ تم لوگوں کی نفع رسانی کا کمال درجہ طالب وشائق ہے۔"

آیت بالا سے بوضوح ثابت ہے کہ نبی ﷺ کو بنی نوع کے مفاد اور رفاہ وصلاح کی آرزو بدرجہ کمال تھی۔

سورۃ یوسف میں ہے:

﴿وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾[1]

ترجمہ: "بہت لوگ ہیں جو ایمان نہ لائیں گے اگرچہ تجھ کو اُن سے ایمان لے آنے کی بڑی چاہت ہے۔"

اس آیت سے بھی یہی استفادہ ہوا کہ حضور ﷺ کا منتہائے نظر اور کمال آرزو یہی تھا کہ تمام عالم کے سر ایک ہی مالک وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ کے سامنے جھکے ہوئے ہوں۔

ربّ واحد کا دین واحد ہی تمام اصناف انسانی کو متحد و متفق بنانے والا ہو۔

قریش کے سردار عتبہ نے ایک بار نبی ﷺ سے مل کر یہ عرض کیا تھا۔

(الف) کیا تم مال و دولت چاہتے ہو؟

میرا ذمہ ہے کہ سب سے زیادہ زر و مال تیرے پاس جمع کر دوں گا۔

(ب) کیا تم ریاست کے خواہاں ہو؟

ہم سب تجھے اپنا رئیس تسلیم کر لیتے ہیں۔

(ج) کیا تم تخت قائم کرنا چاہتے ہو؟

میں سارے عرب سے تیری فرماں روائی کی تصدیق کرا دوں گا۔

نبی ﷺ نے فرمایا، مجھے نہ زر و دولت کی ضرورت ہے اور نہ ریاست و

[1] یوسف: ۱۰۳

حکومت کی آرزو ہے۔ میں تو رب العالمین کا پیغام لے کر آیا ہوں اور اُسی کا ہر ایک سننے والے کان تک پہنچا دینا میرا مقصود اعلیٰ ہے۔[1]

ایک بار ابوجہل لعین نے حضور ﷺ کو مضروب کیا۔ حمزہ عم رسول ﷺ نے یہ واقعہ سنا تو انہوں نے ابوجہل کو جا پیٹا اور پھر نبی ﷺ کو آ کر بتلایا۔ محمد تم کو خوش ہونا چاہئے کہ میں نے ابوجہل سے تمہارا انتقام لے لیا۔

نبی ﷺ نے جواب دیا۔ مجھے انتقام وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں تم مسلمان ہو جاؤ تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔

سیدنا حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دل میں یہ بات جم گئی اور وہ مسلمان ہو گئے۔[2]

ان واقعات سے ظاہر ہے کہ نبی ﷺ کا دامن اغراض کے گرد و غبار سے بلند تر تھا۔ حضور ﷺ کی تعلیم اور تعلّم کے لئے بے حد سرگرمی کسی ذاتی مفاد پر مبنی نہ تھی، انتقام اور دیگر رذائل سے حضور ﷺ کے اخلاق عالیہ پاک وصاف تھے یعنی حضور ﷺ کی آرزو اپنے نفس کے لئے کچھ بھی نہ تھی۔ حضور ﷺ کا پیکر محبت کل تھا اور حضور ﷺ کا وجود منفعت عامہ اور جُود عامہ کے صفات سے متشکل و مجسم تھا۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم۔

حضور ﷺ کی اُن ادعیہ پر نظر ڈالو جو وقتاً فوقتاً حضور ﷺ نے اُمت کے حق میں فرمائی ہیں۔ وفات سے ایک ماہ بیشتر ایک خطبہ کے آغاز میں فرمایا:

"مسلمانو! اللہ تمہیں سلامتی سے رکھے، تمہاری حفاظت فرمائے، تمہیں شر سے بچائے، تمہاری مدد کرے، تم کو بلند کرے، ہدایت اور توفیق دے، اپنی پناہ میں رکھے، آفتوں سے بچائے۔ تمہارے دین کو تمہارے لئے محفوظ بنائے۔"

ذرا ان الفاظ پر غور کرو، ایک کے بعد دوسری دُعا اور دوسری کے بعد تیسری گویا

[1] الروض الأنف: ۲/۴۷، باب بين النبي صلى الله عليه وسلم وبين قريش

[2] الروض الأنف: ۲/۴۴، اسلام حمزة رضي الله تعالى عنه

دعا و برکت دیتے تھکتے ہی نہیں۔ یہ اسی صفت حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ کا ظہور ہے۔

اور یہ خصوصیت ذات ہمایونی ہی کی ہے۔

؎ يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا
عَلٰى نَبِيِّكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ

﴿بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ [1]

تَرْجَمَہ: ”وہ مومنوں سے بہت پیار کرنے والا اور اُن پر ہمیشہ رحم کرنے والا ہے۔“

آیت بالا میں نبی ﷺ کو رَءُوْفٌ اور رَحِيْمٌ کے اسماء سے یاد فرمایا گیا ہے۔ رَءُوْف رافت سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔

رَحِيْمٌ رحم سے صفت مشبّہ کا صیغہ ہے۔

لہٰذا رَءُوْفٌ کے معنی کامل العطوف ہیں اور رَحِيْمٌ کے معنی دائم الرحمت ہیں۔

سورۂ حج اور سورۂ بقرہ میں ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ [2]

تَرْجَمَہ: ”اللہ تعالیٰ انسانوں پر رؤف ورحیم ہے۔“

نبی ﷺ کے حق میں یہ امر نہایت شرف وعزت اور غایت تکریم وحرمت کا موجب ہے کہ حضور ﷺ کی صفت میں وہ دو نام بحالت ترکیبی تجویز فرمائے گئے جو اسی ترکیب کے ساتھ خود ذات پاک سبحانی کے لئے مستعمل ہوئے ہیں۔

ہاں اللہ تعالیٰ کی رافت ورحمت کو عوام الناس پر عام فرمایا گیا ہے اور حضور کی رافت ورحمت کو بالخصوص مومنین کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔ فہم معانی میں اس عموم و خصوص کا امتیاز یاد رکھتے ہوئے مومنین کے لئے شکر وابتہاج کا مقام ہے کہ اُن کو المضاعف (دوہری) رحمت وعطوفت کا مورد ومصداق بنایا گیا ہے۔

---

[1] التوبة: ۱۲۸ [2] بقرة: ۱۴۳

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

”اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَتَخَوَّلُنَا بِالْمَوْعِظَةِ فِي الْاَيَّامِ، مَخَافَةَ السَّآمَةِ عَلَيْنَا.“ [1]

تَرْجَمَہ: ”نبی کریم ﷺ ہم کو گاہ بگاہ وعظ سنایا کرتے تھے اس اندیشہ سے کہ روزانہ وعظ کا سننا ہم پر گراں نہ گزرے۔“

نبی ﷺ کا یہ اصول از راہِ شفقت ورافت تھا کہ سامعین جس قدر بھی سنیں نشاطِ طبع اور حضورِ قلب سے سنیں اور آئندہ کے لئے شوق تمام باقی رہے:

عادتِ مبارکہ تھی کہ جب بحالت نماز کسی بچہ کے رونے کی آواز سن پاتے تو نماز ہلکی فرما دیتے کہ ماں بچہ کو جلد سنبھال سکے۔ [2]

عادتِ مبارکہ تھی کہ سوار ہو کر کسی کو پاپیادہ ہمرکاب چلنے کی اجازت نہ فرماتے تھے۔ اگرچہ بہت سے فدائی اس خدمت کے تمنائی رہتے، یا تو اسے سوار کرا لیتے تھے یا واپس لوٹا دیتے تھے۔

عادتِ مبارکہ تھی کہ جب کوئی مسلمان مقروض ہو جاتا تو اس کا قرض بیت المال سے قبل از تدفین ادا فرما دیتے تھے۔ مگر خود کسی مردہ کا مال قبول نہ فرمایا کرتے تھے۔

فرمایا کرتے تھے کسی کی غیبت میرے سامنے مت کرو۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی کی طرف سے میری صاف دلی میں فرق آئے۔ بارہا ایسا ہوا کہ ساری ساری رات اُمت کے حق میں دعا کرتے ہوئے گزر جاتی تھی۔ چھوٹے بچوں کو پیار کرتے ان کو خود سلام کیا کرتے، ان کے سر پر دستِ شفقت رکھتے، گلی میں کھیلتے ہوئے بچوں کو اپنی سواری پر آگے پیچھے سوار کر لیتے، غلاموں کے ساتھ زمین پر بیٹھ کر کھانا کھانے میں شامل ہو جاتے۔

---

[1] مسلم، صفات المنافقين، رقم: ۲۸۲۱

[2] بخاری، باب من أخف الصلاة عند بكاء الصبي: ۹۸/۱

ان سب امور کا ظہور از راہ شفقت و رافت ہوا کرتا تھا اور اس بلند ترین رافت و رحمت کا ظہور حضور پُر نور کے خصائص میں سے تھا۔[1]

خاموش خدمت

صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں غریبوں، ناداروں، اور بیواؤں کی خدمت کرنے کے لئے آدمیوں کو مقرر کیا ہوا تھا۔ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہ فہرست دیکھی تو ایک بڑھیا کے نام کے سامنے اس کی خدمت کرنے کے لئے کسی کا نام نہیں لکھا ہوا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سمجھے کہ شاید یہ کام کسی نے ذمہ نہیں لیا۔ انہوں نے دل میں سوچا کہ ان کا کام میں کر دوں گا۔ چناں چہ اگلے دن فجر کی نماز پڑھ کر اس عورت کے گھر گئے تو دیکھا کہ جھاڑو بھی دیا ہوا ہے اور پانی بھی بھرا ہوا ہے۔ پوچھا، اماں! یہ خدمت کون کر گیا ہے؟ کہنے لگی کہ کوئی آتا ہے اور وہ پانی بھی بھر جاتا ہے اور جھاڑو بھی دے جاتا ہے، مجھے آج تک اس کے نام کا پتہ نہیں ہے، نہ میں نے پوچھا اور نہ کبھی اس نے بتایا ہے۔

انہوں نے سوچا کہ اچھا میں اگلی دفعہ فجر سے پہلے جاؤں گا، جب فجر سے پہلے گئے تو دیکھا کہ سب کام ہوا پڑا ہے، پھر انہوں نے سوچا کہ میں اب تہجد پڑھتے ہی آ جاؤں گا، چناں چہ تہجد کے وقت آئے تو دیکھا کہ جھاڑو بھی دیا ہوا ہے اور پانی بھی بھرا ہوا ہے۔ وہ بھی آخر عمر ابن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، کہنے لگے کہ اچھا میں کل دیکھوں گا۔ چناں چہ انہوں نے اگلے دن عشا کی نماز پڑھی اور راستے میں ایک جگہ چھپ کر بیٹھ گئے تاکہ دیکھ سکوں کہ بڑھیا کے گھر میں کون جاتا ہے۔

جب آدھی رات کا وقت ہوا اور اندھیرا گہرا ہو گیا تو دیکھا کہ ایک آدمی جس کے پاؤں میں جوتے نہیں تھے، ننگے پاؤں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس بڑھیا کے گھر جا

۱ رحمۃ للعالمین: ۲/۷۸ تا ۸۲

رہا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور پوچھنے لگے "مَنْ اَنْتَ" تو کون ہے؟ جواب ملا، میں ابوبکر ہوں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حیران ہو کر پوچھنے لگے، اے امیر المومنین! رات کی تاریکی اور تنہائی میں کیا آپ اس بڑھیا کی خدمت کرنے جا رہے ہیں اور پھر پوچھا کہ آپ کے پاؤں میں تو جوتے بھی نہیں، اس طرح ننگے پاؤں کیوں چل رہے ہیں؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا، عمر! میں نے اس لئے جوتے نہ پہنے کہ ایسا نہ ہو کہ میرے پاؤں کے جوتے کی آواز سے کسی سونے والے کی نیند میں خلل آ جائے اور کسی کو میرے اس عمل کا پتہ چل جائے۔[1]

ہمیں بھی چاہئے کہ ہم بھی جو کام کریں خالص اللہ کی رضا کے لئے کریں۔ پھر دیکھنا کہ اللہ تعالیٰ ہم پر کس طرح مہربانی فرمائیں گے۔

اسی طرح آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے محلہ والوں کی بکریوں کا دودھ بھی دوھ کر دیا کرتے تھے۔ جب یہ خلیفہ بنے تو محلّہ کی ایک لڑکی نے کہا (اب تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ بن گئے ہیں لہٰذا) ہمارے گھر کی بکریوں کا دودھ اب تو کوئی دوھ کر نہیں دے گا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ سن کر فرمایا نہیں۔ میری عمر کی قسم! میں آپ لوگوں کے لئے دودھ ضرور دوہا کروں گا اور مجھے امید ہے کہ خلافت کی ذمہ داری جو میں نے اٹھائی ہے یہ مجھے ان اخلاق کریمانہ سے نہیں ہٹائے گی جو پہلے سے مجھ میں ہیں۔ چناں چہ خلافت کے بعد بھی محلّہ والوں کا دودھ دوہا کرتے اور بعض دفعہ از راہ مذاق محلّہ کی لڑکی سے کہتے اے لڑکی! تم کیسا دودھ نکلوانا چاہتی ہو؟ جھاگ والا یا بغیر جھاگ کے۔ کبھی وہ کہتی جھاگ والا اور کبھی کہتی بغیر جھاگ کے، بہرحال جیسے وہ کہتی ویسے یہ کرتے۔[2]

۱ سیر الصحابہ: ۱/۱۹۱

۲ کنزالعمال، کتاب الخلافۃ، قسم الافعال: ۵/۲۴۴، رقم الحدیث: ۱۴۰۷۳

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے ”جس طرح مال کی زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے اسی طرح جسم کی زکوٰۃ دینا بھی ضروری ہے اور جسم کی زکوٰۃ یہ ہے کہ دوسروں کی خدمت کرے اور ان کے غم کو اپنا غم بنالے۔“

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ:

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے غلام حضرت اسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: میں ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ حرہ کی طرف جا رہا تھا۔ ایک جگہ آگ جلتی ہوئی جنگل میں نظر آئی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ شاید یہ کوئی قافلہ ہے جو رات ہو جانے کی وجہ سے شہر میں نہیں گیا، باہر ہی ٹھہر گیا، چلو اس کی خبر لیں۔ رات کو حفاظت کا انتظام کریں۔

وہاں پہنچے تو دیکھا ایک عورت ہے جس کے ساتھ چند بچے ہیں جو رو رہے ہیں اور چلا رہے ہیں اور ایک دیگچی چولہے پر رکھی ہے جس میں پانی بھرا ہوا ہے اور اس کے نیچے آگ جل رہی ہے۔ انہوں نے سلام کیا اور قریب آنے کی اجازت لے کر اس کے پاس گئے اور پوچھا کہ یہ بچے کیوں رو رہے ہیں۔ عورت نے کہا کہ بھوک کی وجہ سے رو رہے ہیں۔ دریافت فرمایا کہ اس دیگچی میں کیا ہے۔ عورت نے جواب دیا:

پانی بھر کر بہلانے کے واسطے آگ پر رکھ دی ہے کہ ذرا ان کو تسلی ہو جائے اور سو جائیں۔

امیر المؤمنین عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اور میرا اللہ ہی کے یہاں فیصلہ ہوگا کہ میری اس تنگی کی خبر نہیں لیتے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رونے لگے اور فرمایا: اللہ تجھ پر رحم کرے بھلا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تیرے حال کی کیا خبر ہے۔ کہنے لگی کہ وہ ہمارے امیر ہیں اور ہمارے حال کی خبر بھی نہیں رکھتے۔ اسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجھے ساتھ لے کر واپس ہوئے اور ایک بوری میں بیت المال سے کچھ آٹا اور کھجوریں اور چربی اور کچھ کپڑے اور کچھ درہم لئے، غرض اس بوری کو بھر لیا اور فرمایا کہ یہ میری کمر پر رکھ دے۔ میں نے عرض کیا کہ میں لے چلوں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ نہیں میری کمر پر رکھ دے۔ دو تین مرتبہ جب میں نے اصرار کیا تو فرمایا کیا قیامت میں بھی میرے بوجھ کو تو ہی اٹھائے گا اس کو میں ہی اٹھاؤں گا اس لئے کہ قیامت میں مجھ ہی سے اس کا سوال ہوگا۔

میں نے مجبور ہو کر بوری کو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کمر پر رکھ دیا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہایت تیزی کے ساتھ اس کے پاس تشریف لے گئے، میں بھی ساتھ تھا، وہاں پہنچ کر اس دیگچی میں آٹا اور کچھ چربی اور کھجوریں ڈالیں اور اس کو چلانا شروع کیا اور چولہے میں خود ہی پھونک مارنے لگے۔

اسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ آپ کی گنجان داڑھی سے دھواں نکلتا ہوا میں دیکھتا رہا حتیٰ کہ حریرہ سا تیار ہوگیا۔ اس کے بعد آپ نے اپنے دست مبارک سے نکال کر ان کو کھلایا۔ وہ سیر ہو کر خوب ہنسی کھیل میں مشغول ہو گئے اور جو بچا تھا وہ دوسرے وقت کے واسطے ان کے حوالے کر دیا۔[1] وہ عورت بہت خوش ہوئی اور کہنے لگی اللہ تعالیٰ تمہیں جزائے خیر دے۔ تم تھے اس کے مستحق کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جگہ تم ہی خلیفہ بنائے جاتے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو تسلی دی اور فرمایا کہ جب تم خلیفہ کے پاس جاؤ گی تو مجھ کو بھی وہیں پاؤ گی۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے قریب ہی ذرا ہٹ کر زمین پر بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد چلے آئے اور فرمایا: میں اس لئے بیٹھا تھا کہ میں نے ان کو روتے ہوئے دیکھا تھا۔ میرا دل چاہا کہ تھوڑی دیر ان کو ہنستے ہوئے بھی دیکھوں۔[2]

---

[1] سیر الصحابة: ۱۷۱/۱

[2] أسد الغابة في معرفة الصحابة: ۱۵۵/٤، فضائل عمر ابن الخطاب رضي الله عنه

صبح کی نماز میں اکثر سورۂ کہف، طٰہٰ وغیرہ بڑی سورتیں پڑھتے اور روتے کہ کئی کئی صفوں تک آواز جاتی۔ ایک مرتبہ صبح کی نماز میں سورۂ یوسف پڑھ رہے تھے۔ ﴿اِنَّمَا اَشْکُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰہِ﴾ [1] پر پہنچے تو روتے روتے آواز نہ نکلی۔ تہجد کی نماز میں بعض مرتبہ روتے روتے گر جاتے اور بیمار ہو جاتے۔

یہ ہے اللہ تعالیٰ کا خوف اس شخصیت میں جس کے نام سے بڑے بڑے نامور بادشاہ ڈرتے تھے، کانپتے تھے۔ آج بھی چودہ سو برس گزرنے کے باوجود ان کا دبدبہ مانا ہوا ہے آج کوئی بادشاہ نہیں حاکم نہیں کوئی معمولی سا امیر بھی اپنی رعایا کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا ہے......؟؟؟

ایثار و ہمدردی کی تین بہترین مثالیں

❶ حضرت ابوجہم بن حذیفہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کہتے ہیں کہ یرموک کی لڑائی کے دوران میں اپنے چچازاد بھائی کی تلاش میں نکلا کہ وہ لڑائی میں شریک تھے اور ایک مشکیزہ پانی کا میں نے اپنے ساتھ لیا کہ ممکن ہے وہ پیاسے ہوں تو پانی پلاؤں۔ اتفاق سے وہ ایک جگہ اس حالت میں پڑے ہوئے ملے کہ دم توڑ رہے تھے اور جان کنی شروع تھی۔

میں نے پوچھا پانی کا گھونٹ دوں انہوں نے اشارے سے ہاں کی اتنے میں دوسرے صاحب نے جو قریب ہی پڑے تھے اور وہ بھی مرنے کے قریب تھے آہ کی۔ میرے چچازاد بھائی نے آواز سنی تو مجھے ان کے پاس جانے کا اشارہ کیا۔ میں ان کے پاس پانی لے کر گیا وہ ہشام بن ابی العاص رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ تھے اُن کے پاس پہنچا ہی تھا کہ اُن کے قریب ایک تیسرے صاحب اسی حال میں پڑے دم توڑ رہے تھے۔ انہوں نے آہ کی۔ ہشام رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے مجھے اُن کے پاس جانے کا اشارہ

[1] یوسف: ۸٦

کر دیا۔ میں اُن کے پاس پانی لے کر پہنچا تو ان کا دم نکل چکا تھا۔ ہشام رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کے پاس واپس آیا تو وہ بھی جاں بحق ہو چکے تھے ان کے پاس سے اپنے بھائی کے پاس لوٹا تو اتنے میں وہ بھی ختم ہو چکے تھے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ [1]

اس نوع کے متعدد واقعات کتب حدیث میں ذکر کیے گئے۔ کیا انتہا ہے اس ایثار کی کہ اپنا بھائی آخری دم توڑ رہا ہو اور پیاسا ہو ایسی حالت میں کسی دوسرے کی طرف توجہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے چہ جائے کہ اس کو پیاسا چھوڑ کر دوسرے کو پانی پلانے چلا جائے۔ اور ان مرنے والوں کی روحوں کو اللہ جل شانہ اپنے لطف و فضل سے نوازیں کہ مرنے کے وقت بھی جب ہوش و حواس سب ہی کے جواب دے دیتے ہیں یہ لوگ ہمدردی میں جان دیتے ہیں۔

❷ حضرت ابن عمر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا فرماتے ہیں کہ ایک صحابی رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کو کسی شخص نے بکری کی سری ہدیہ کے طور پر دی۔ انہوں نے خیال فرمایا: میرے فلاں ساتھی زیادہ ضرورت مند ہیں، کنبہ والے ہیں وہ اور ان کے گھر والے زیادہ محتاج ہیں اس لئے ان کے پاس بھیج دی ان کو ایک تیسرے صاحب کے متعلق یہی خیال پیدا ہوا اور ان کے پاس بھیج دی۔ غرض اسی طرح سات گھروں میں پھر کر وہ سری سب سے پہلے صحابی رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کے گھر لوٹ آئی۔ [2]

اس واقعہ سے ان حضرات کا عام طور سے محتاج اور ضرورت مند ہونا بھی معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی کہ ہر ایک کو دوسرے کی ضرورت کا زیادہ خیال و لحاظ رہتا تھا۔

❸ حضرت ابوہریرہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ فرماتے ہیں: نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا:

[1] حیاة الصحابة: ۱/۲۷۵

[2] مستدرك حاكم: كتاب التفسير: ۲/۵۷۰، الحشر: ۹

”ایک آدمی نے دوسرے آدمی سے اس کی کوئی جائیداد خریدی، خریدنے والے نے اس زمینی جائیداد میں ایک مٹکا مدفون پایا جس میں سونا بھرا ہوا تھا۔ خریدار نے فروخت کرنے والے سے کہا کہ اپنا سونا مجھ سے لے لو، میں نے تم سے زمین خریدی ہے (زمین میں مدفون) سونا تو نہیں خریدا (جو بغیر کسی عوض کے یہ لے لوں)۔

جائیداد فروخت کرنے والے نے کہا: میں نے تو تمہارے ہاتھ زمین ہی نہیں بیچی بل کہ اس میں جو کچھ ہے وہ بھی تمہارے ہاتھ فروخت کر دیا (دونوں میں اختلاف ہوا، کوئی بھی وہ سونا لینے کے لئے تیار نہ تھا) لہٰذا دونوں اپنا مقدمہ ایک تیسرے شخص کے پاس لے گئے اور اسے ثالث بنایا، اس نے کہا: کیا تم میں سے کسی کی اولاد ہے؟ ایک نے کہا ہاں میرا ایک لڑکا ہے۔ دوسرے نے کہا ہاں میری ایک لڑکی ہے۔ ثالث نے کہا کہ اس لڑکے کا نکاح لڑکی سے کر دو اور اس سونے میں سے ان دونوں پر خرچ کرو اور صدقہ دو۔[1]“

مال و دولت، سونے چاندی اور دیگر اموالِ دنیا کی محبت انسانی فطرت میں شامل ہے، خود قرآن کریم میں بھی حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ”مرغوب چیزوں کی محبت لوگوں کے لئے مزین کر دی گئی ہے، جیسے عورتیں، بیٹے اور سونے چاندی کے جمع کیے ہوئے خزانے، نشان دار گھوڑے، چوپائے اور کھیتی، یہ دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور لوٹنے کا اچھا ٹھکانہ تو اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔[2]“

فطرتِ انسانی تبدیل تو ہو نہیں سکتی، لہٰذا یہ بھی ممکن نہیں کہ انسان کے دل سے ان اشیاء کی محبت ختم ہو جائے اور نہ ہی یہ مطلوب ہے، بل کہ ان اشیاء کی محبت کو اللہ کی محبت پر قربان کر دینا مطلوب ہے۔ اللہ کے حکم پر ان اشیاء کو اور مال و دولت کو قربان کر دینا یہ مقصود ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب الانبیاء: ۴۹۴/۱

[2] آل عمران: ۱۴

چناں چہ مال کمانے کے جن طریقوں سے اللہ نے منع کر دیا ان سے رک جانا خواہ ان طریقوں سے کتنا ہی مال کیوں نہ ملے ضروری ہے۔ لیکن یہی مال ہے جس کی وجہ سے انسان اللہ سے اور اس کے احکامات سے سب سے زیادہ غفلت کرتا ہے۔ زر، زن، زمین نے دنیا میں فساد برپا کیا ہوا ہے، باہمی حسد، رقابت، کینہ پروری، بغض و عناد کی بڑی وجہ یہی ہے۔ اسی کی خاطر لوگوں نے حرام و حلال کی تمیز ختم کر دی، اسی کی وجہ سے جھگڑے ہوتے ہیں اور یہی مال ہے جو باہمی خونریزی تک انسان سے کروا دیتا ہے۔

مال و دولت سے محبت کی اس فضا میں کسی انسان کا خوفِ الٰہی کی بناء پر ناجائز، حرام اور مشکوک مال سے اجتناب کرنا ایک غیر معمولی بات اور اللہ کے نزدیک بڑی قدر و قیمت رکھنے والا عمل ہے۔

حدیثِ بالا میں بیان کردہ واقعہ مال سے بے رغبتی اور دنیا سے عدم محبت کا عجیب واقعہ ہے۔ زر و جواہرات سے لبریز کسی کو کوئی برتن ملے اور کوئی چیز اس کے لینے سے مانع بھی نہ ہو، پھر بھی اس شبہ کی بناء پر کہ یہ دوسرے کا ہے، اسے لینے کے لئے تیار نہ ہو، ایک غیر معمولی بات ہے۔

یہ بھی عجیب اللہ کی شان ہے کہ صرف خریدار ہی نہیں وہاں تو زمین فروخت کرنے والا بھی اتنا ہی دیانت دار ہے۔ خریدار کہتا ہے کہ مجھے زمین کی کھدائی سے یہ مٹکا جو زر و جواہرات سے بھرا ہوا ہے ملا ہے یہ یقیناً تمہارا ہے تم اسے لے لو، جواب میں بیچنے والا کہتا ہے:

نہیں یہ میرا نہیں، میں نے تو زمین فروخت کر دی ہے اور جو کچھ اس میں تھا وہ سب کچھ تمہارا ہو گیا۔ دونوں اس کو لینے کے لئے تیار نہیں بالآخر ایک تیسرے شخص کو حکم اور ثالث بنایا گیا، اس نے سوچا کہ یوں تو جھگڑا ختم ہی نہ ہوگا اس کا کوئی دوسرا حل نکالنا چاہئے۔

چناں چہ اس نے ان سے پوچھا کہ تم لوگوں کی کوئی اولاد ہے؟ ایک نے کہا کہ میرا ایک لڑکا ہے دوسرے نے کہا میری ایک لڑکی ہے۔ ثالث نے فیصلہ کیا کہ ان دونوں کا باہم نکاح کر دیا جائے اور یہ سارا مال نصف نصف ان دونوں پر خرچ کر دیا جائے اور کچھ مال اللہ کی راہ میں صدقہ بھی دیا جائے۔

ثالث کا یہ فیصلہ بھی بہت عمدہ ہے اس اعتبار سے کہ اس نے سوچا جب یہ دونوں اتنے دیانت دار ہیں تو یقیناً ان کی اولاد بھی دیانت دار اور خوفِ خدا رکھنے والی ہوگی۔ اور جب ان کا نکاح ہوگا تو ان کی اولاد بھی نہایت شریف اور صالح پیدا ہوگی، گویا اس طرح شریف اور صالح اولاد کے وجود کا ذریعہ یہ فیصلہ ہو جائے گا۔

نصیحت آموز پہلو

بلاشبہ اس واقعہ میں حرص و ہوس کے مارے ہوئے ہمارے معاشرہ کے لئے بڑے نصیحت آموز پہلو ہیں۔

❶ دیانت داری ایک ایسا مبارک وصف ہے کہ اس کے بہترین نتائج اللہ تعالیٰ دنیا میں انسان کو نصیب فرماتے ہیں اور آخرت میں تو خوب ہی عطا فرمائیں گے۔

❷ اس واقعہ سے انسان کے دل میں مال کی بے رغبتی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

❸ حرام سے اجتناب اور مشتبہ سے بچنا تقویٰ کہلاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دونوں حضرات تقویٰ کی صفت سے متصف تھے جب ہی دونوں ایک دوسرے کے لئے ضد کرتے رہے اور خود لینے پر راضی نہ ہوئے۔

❹ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان کو ان معاملات میں جو بظاہر بڑے چھوٹے اور روز مرہ پیش آنے والے ہیں، اختلاف کی صورت میں کسی صاحب رائے اور دین دار شخص کو ثالث بنا لیا جائے جو اپنی عقل و فراست اور علم و تجربہ کو بروئے کار لاتے ہوئے دونوں کے درمیان صحیح فیصلہ کر دے۔

❺ غیر متوقع طور پر حاصل ہونے والے مال میں سے صدقہ کر دینا مستحب ہے اور اس سے مال میں بے برکتی ختم ہو جاتی ہے۔[۱]

نفرت گناہ سے ہو گناہ کرنے والے سے نہ ہو

جتنے اولیاء کرام رَحِمَهُمُ اللهُ تَعَالیٰ گزرے ہیں، ان سب کا حال یہ تھا کہ وہ اگر مخلوق کو برے حال میں دیکھتے، یا فسق و فجور میں اور گناہوں کے اندر مبتلا دیکھتے تو، وہ اولیاء ان گناہوں سے تو نفرت کرتے تھے۔ اس لئے کہ گناہوں سے نفرت کرنا واجب ہے۔ ان کے فسق و فجور سے اور ان کے اعمال سے نفرت کرنا واجب ہے، لیکن دل میں اس آدمی سے نفرت نہیں ہوتی تھی، اس کی حقارت دل میں نہیں ہوتی تھی۔

حضرت جنید بغدادی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالیٰ دریائے دجلہ کے کنارے چہل قدمی کرتے ہوئے جا رہے تھے، قریب سے ایک کشتی گزری، اس کشتی میں اوباش (بے ہودہ) قسم کے نوجوان بیٹھے ہوئے تھے، اور گاتے بجاتے ہوئے جا رہے تھے۔ جب گانا بجانا ہو رہا ہو اور ہنسی مذاق کی محفل ہو، اس موقع پر اگر کوئی دین دار پاس سے گزرے تو اس کا مذاق اُڑانا بھی تفریح کا ایک حصہ ہوتا ہے۔

چناں چہ ان اوباش لوگوں نے حضرت جنید بغدادی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالیٰ کا مذاق اُڑایا، اور آپ پر کچھ فقرے کسے، حضرت کے ساتھ ایک صاحب اور تھے، انہوں نے یہ صورت حال دیکھ کر فرمایا کہ حضرت! آپ ان کے حق میں بددعا فرما دیں، کیوں کہ یہ لوگ اتنے گستاخ ہیں کہ ایک طرف تو خود فسق و فجور اور گناہوں میں مبتلا ہیں۔ دوسری طرف اللہ والوں کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔

حضرت جنید بغدادی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالیٰ نے فوراً دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے، اور فرمایا اے اللہ! آپ نے ان نوجوانوں کو جس طرح یہاں دنیا میں خوشیاں عطا فرمائی

[۱] قصص الحدیث: ص ۲٤۲

ہیں ان کے اعمال ایسے کر دیجئے کہ وہاں آخرت میں بھی ان کو خوشیاں نصیب ہوں۔

دیکھئے: ان کی ذات سے نفرت نہیں فرمائی، اس لئے کہ یہ تو میرے اللہ کی مخلوق ہے۔[1]

حیوانات کے ساتھ خیر خواہی کی مثالیں

(۱) حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ مصر فتح کرنے کے بعد جب اپنے خیمے میں واپس آئے تو دیکھا کہ ایک کبوتر نے گھونسلہ بنا لیا ہے۔ آپ نے حکم دیا کہ میرے خیمے کو نہ اکھاڑا جائے۔ آپ نے بقیہ سفر خیمے کے بغیر پورا کیا مگر اپنے آرام کی خاطر کبوتر کو بے آرام کرنا پسند نہ کیا۔[2]

(۲) حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں: ایک بزرگ تھے جو بہت بڑے عالم، فاضل، محدث اور مفسر تھے۔ ساری عمر درس و تدریس اور تالیف و تصنیف میں گزری اور علوم کے دریا بہا دیئے، جب ان کا انتقال ہوا تو خواب میں کسی نے ان کو دیکھا تو ان سے پوچھا کہ حضرت! آپ کے ساتھ کیسا معاملہ ہوا؟ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ مجھ پر اپنا فضل فرمایا۔ لیکن معاملہ بڑا عجیب ہوا، وہ یہ کہ ہمارے ذہن میں یہ تھا کہ ہم نے الحمدللہ زندگی میں دین کی بڑی خدمت کی ہے۔ درس و تدریس کی خدمت انجام دی، وعظ اور تقریریں کیں، تالیفات اور تصنیفات کیں۔ دین کی تبلیغ کی، حساب و کتاب کے وقت ان خدمات کا ذکر سامنے آئے گا۔ اور ان خدمات کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اپنا فضل و کرم فرمائیں گے۔

لیکن ہوا یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم تمہیں بخشتے ہیں، لیکن معلوم بھی ہے کہ کس وجہ سے بخش رہے ہیں؟ ذہن میں یہ آیا

[1] اصلاحی خطبات: ۲۲٤/۸

[2] معجم البلدان للحموی: ۲٦۳/۱٤ فسطاط

کہ ہم نے دین کی جو خدمات انجام دیں تھیں، ان کی بدولت اللہ تعالیٰ نے بخش دیا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں، ہم تمہیں ایک اور وجہ سے بخشتے ہیں۔ وہ یہ کہ ایک دن تم کچھ لکھ رہے تھے...... اس زمانے میں لکڑی کے قلم ہوتے تھے، اس قلم کو روشنائی میں ڈبو کر پھر لکھا جاتا تھا...... تم نے لکھنے کے لئے اپنا قلم روشنائی میں ڈبویا۔ اس وقت ایک مکھی اس قلم پر بیٹھ گئی اور وہ مکھی قلم کی سیاہی چوسنے لگی، تم اس مکھی کو دیکھ کر کچھ دیر کے لئے رک گئے۔ اور یہ سوچا کہ یہ مکھی پیاسی ہے، اس کو روشنائی پی لینے دو، میں بعد میں لکھ لوں گا۔ تم نے اس وقت جو قلم کو روکا تھا، وہ خالصۃً میری اور میری مخلوق کی محبت میں اخلاص کے ساتھ روکا تھا۔ اس وقت تمہارے دل میں کوئی اور جذبہ نہیں تھا۔ جاؤ، اس عمل کے بدلے میں آج ہم نے تمہاری مغفرت کر دی۔[1]

(۳) مسلم شریف میں ایک روایت ہے: ایک طوائف اور فاحشہ عورت تھی، ساری زندگی طوائفی کا کام کیا، ایک مرتبہ وہ کہیں سے گزر رہی تھی راستے میں اس نے دیکھا کہ ایک کتا پیاس کی شدت کی وجہ سے زمین کی مٹی چاٹ رہا ہے، قریب میں ایک کنواں تھا، اس عورت نے اپنے پاؤں سے چمڑے کا موزہ اتارا، اور اس موزے میں کنویں سے پانی نکالا اور اس کتے کو پلا دیا۔

اللہ تعالیٰ کو یہ عمل اتنا پسند آیا کہ اس کی مغفرت فرما دی کہ میری مخلوق کے ساتھ تم نے محبت اور رحم کا معاملہ کیا، تو ہم تمہارے ساتھ رحم کا معاملہ کرنے کے زیادہ حق دار ہیں۔[2] لہٰذا اللہ کی مخلوق کے ساتھ رحم کا معاملہ کرنا چاہئے، چاہے وہ حیوان ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت مولانا منظور نعمانی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"بعض اوقات ایک معمولی عمل دل کی خاص کیفیت یا خاص حالات کی وجہ

[1] اصلاحی خطبات: ۲۲۰/۸

[2] مسلم، باب فضل سقی البہائم: ۲۳۷/۲

سے اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی قبولیت حاصل کر لیتا ہے، اور اُس کا کرنے والا اُسی پر بخش دیا جاتا ہے، اس حدیث میں جس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے اُس کی نوعیت بھی یہی ہے۔ آپ ذرا سوچئے! ایک شخص گرمی کے موسم میں اپنی منزل کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اُس کو پیاس لگی ہے، اسی حالت میں اُس کو ایک کنواں نظر پڑ گیا، لیکن پانی نکالنے کا کوئی سامان رسی ڈول وغیرہ وہاں نہیں ہے اس لئے مجبوراً یہ شخص پانی پینے کے لئے خود ہی کنویں میں اتر گیا، وہیں پانی پیا اور نکل آیا، اَب اُس کی نظر ایک کتے پر پڑی، جو پیاس کی شدت سے کیچڑ چاٹ رہا تھا، اُس کو اُس کی حالت پر ترس آیا، اور دل میں داعیہ پیدا ہوا کہ اس کو بھی پانی پلاؤں، اُس وقت ایک طرف اس کی اپنی حالت کا تقاضا یہ ہوگا کہ اپنا راستہ لوں، اور منزل پر جلدی پہنچ کے آرام کروں، اور دوسری طرف اُس کے جذبۂ رحم کا داعیہ یہ ہوگا کہ خواہ میرا راستہ کھوٹا ہو، اور خواہ کنویں سے پانی نکالنے میں مجھے کیسی ہی محنت و مشقت کرنی پڑے لیکن میں اللہ کی اس مخلوق کو پیاس کی تکلیف سے نجات دوں، اس کش مکش کے بعد جب اُس نے اپنی طبیعت کے آرام کے تقاضے کے خلاف جذبۂ رحم کے تقاضے کے مطابق فیصلہ کیا اور کنویں میں اُتر کر موزے میں پانی بھر کر اور منہ میں موزا تھام کر محنت و مشقت سے پانی نکال کے لایا، اور اُس پیاسے کتے کو پلایا، تو اُس بندہ کی اس خاص حالت اور ادا پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کو جوش آ گیا، اور اسی پر اس کی مغفرت کا فیصلہ فرما دیا گیا۔

الغرض مغفرت و بخشش کے اس فیصلہ کا تعلق صرف کتے کو پانی پلانے کے عمل ہی سے نہ سمجھنا چاہئے، بل کہ جس خاص حالت میں اور جس جذبہ کے ساتھ اُس نے یہ عمل کیا تھا، وہ اللہ تعالیٰ کو بے حد پسند آیا اور اسی پر اس بندہ کی مغفرت اور بخشش کا فیصلہ کر دیا گیا۔[1]

۴ ایک مرتبہ حضرت ابراہیم ادہم رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی دو ساتھیوں سمیت سفر میں تھے

[1] معارف الحدیث: ۱۷۷/۲

سخت سردی کا موسم تھا۔ رات کو ایک مسجد میں قیام ہوا جس کے دروازے کا ایک پلہ ٹوٹا ہوا تھا۔ آپ ساتھیوں کے سو جانے کے بعد ساری رات اس پلے کے سامنے کھڑے رہے تا کہ ساتھیوں کو سردی نہ لگے۔[1]

۵ حضرت مولانا روم رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی ایک مرتبہ اپنے شاگردوں کے ہمراہ ایک راستے سے گزر رہے تھے، دیکھا کہ وہاں کتا سویا ہوا ہے، راستہ اتنا چھوٹا تھا کہ اگر آپ گزرتے تو کتے کو جاگنا پڑتا۔ چناں چہ آپ اپنے شاگردوں کے ہمراہ وہیں کھڑے انتظار کرتے رہے۔ کافی دیر کے بعد کتے کی آنکھ کھلی تو وہ لوگوں کو دیکھ کر ایک طرف ہوا تب آپ آگے بڑھے۔

حضرت مولانا روم رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی ایک مرتبہ پگڈنڈی پر جا رہے تھے دونوں طرف کھیتوں میں پانی کی وجہ سے کیچڑ بنا ہوا تھا۔ سامنے سے ایک کتا اسی پگڈنڈی پر چلتا ہوا آیا۔ جب قریب پہنچا تو کتے نے آپ سے بزبان حال ہم کلامی کی۔ آپ نے فرمایا: تو نیچے اتر اور مجھے آگے جانے کا راستہ دے۔ کتے نے کہا: آپ نیچے اتریں اور مجھے جانے کا راستہ دیں۔ آپ نے فرمایا: تو غیر مکلف ہے نیچے اتر اور تیرے جسم کو گندگی لگی تو کوئی حرج نہیں۔

کتے نے جواب دیا: نہیں آپ نیچے اتریں اس لئے کہ نیچے اترنے سے آپ کے کپڑوں کو گندگی لگے گی جو دھل سکتی ہے لیکن اگر آپ نے مجھے نیچے اترنے پر مجبور کیا تو آپ کے دل میں یہ خیال ہوگا کہ میں کتے سے بہتر ہوں اس وجہ سے آپ کے دل پر ایسی سیاہی لگے گی جو پانی سے بھی نہیں دُھل سکے گی۔ مولانا روم رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے نیچے اتر کر کتے کو جانے کا راستہ دے دیا۔ رات تہجد میں اٹھ کر بہت روئے کہ ایک کتے کی وجہ سے مجھے اپنی اوقات معلوم ہوئی۔ الہام ہوا کہ ایک مرتبہ آپ نے اس کتے کو راستے میں سوئے ہوئے دیکھا تھا اور نیند سے نہیں جگایا تھا

[1] مکتوبات فقیر: ص ۵۷

اس لئے ہم نے اس کتے کو ذریعہ بنا کر آپ کو اپنے نفس کی معرفت نصیب کی۔ اس واقعے میں ہمارے لئے بڑا سبق ہے ہمارے اسلاف جانوروں کے آرام کا اتنا خیال کرتے تھے اور آج ہم انسانوں کے آرام کا خیال نہیں کرتے۔

❻ حضرت خواجہ باقی باللہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی ایک مرتبہ سخت سردیوں کے موسم میں تہجد کی نماز پڑھنے کے بعد اپنے لحاف کی طرف بڑھے۔ دیکھا کہ وہاں ایک بلی سوئی ہوئی ہے۔ آپ ساری رات مصلّٰی پر بیٹھ کر ٹھٹھرتے رہے مگر بلی کو بے آرام کرنا پسند نہ کیا۔[1]

باندی کے ساتھ بھلائی وخیر خواہی

حضرت عمر بن عبدالعزیز رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی ایک مرتبہ گرمیوں کی دوپہر میں سوئے ہوئے تھے ایک باندی پنکھا کر رہی تھی۔ پنکھا کرتے کرتے باندی کو نیند آئی تو وہ بیٹھی بیٹھی سوگئی اتنے میں عمر بن عبدالعزیز رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کی آنکھ کھلی آپ نے باندی کو سوتے دیکھا تو اس کے ہاتھ سے پنکھا لے کر پنکھے سے اس باندی کو ہوا پہنچانے لگے تاکہ باندی بھی تھوڑی دیر سکون کی نیند سولے۔ جب باندی کی آنکھ کھلی اور اس نے خلیفہ وقت کو پنکھا کرتے دیکھا تو وہ گھبرا گئی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا ڈرنہیں میں انسان ہوں تو بھی انسان ہے گرمی ہم دونوں کے لئے برابر ہے۔ اتنی دیر تم نے میرے لئے پنکھا کیا ہے اگر میں نے تھوڑی دیر تمہارے لئے پنکھا کیا تو اس میں کیا حرج ہے۔[2]

غیر مسلموں سے ہمدردی و بھلائی

حکیم الامت حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے اپنے استاد حضرت شیخ الہند رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا یہ واقعہ نقل کیا کہ کوئی صاحب لکھنؤ سے حضرت شیخ الہند

[1] مکتوباتِ فقیر: ص ۵۸ [2] مکتوباتِ فقیر: ۵۸

رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کی خدمت میں دیوبند آنے کے لئے روانہ ہوئے راستے میں ایک ہندو بنیا مل گیا، اس نے بتایا کہ میں بھی دیوبند جارہا ہوں تو کہا چلو ساتھ ہو لیتے ہیں ایک سے دو بھلے۔ جب رات کو دیوبند پہنچے تو کافی دیر ہو چکی تھی ان صاحب نے حضرت شیخ الہند رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کو اطلاع کر رکھی تھی کہ ایک بنیا بھی ساتھ ہے۔

ان صاحب نے حضرت رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی سے عرض کیا کہ انہوں نے کہیں اور جانا ہے، یہ میرے ہم سفر تھے، حضرت رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے فرمایا ”نہیں یہ بھی یہیں رہیں گے“ حالاں کہ حضرت شیخ الہند رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی جانتے تھے کہ وہ ہندو ہے اور اس سے کوئی تعلق بھی نہ تھا، اس کے باوجود بنئے کو اپنے گھر روک لیا۔

صحن میں دونوں مہمانوں کی چارپائیاں بچھا دی گئیں وہ جو اصل مہمان تھے وہ فرماتے ہیں کہ تہجد کے وقت آنکھ کھلی تو عجیب منظر دیکھا کہ وہ ہندو تو لیٹا ہوا ہے اور حضرت شیخ الہند رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی اس کے پاؤں دبا رہے ہیں، وہ اٹھنا چاہتا ہے اور حضرت اسے روک دیتے ہیں، یہ ایک دم سے بے تاب ہو کر اٹھے اور کہا کہ حضرت آپ یہ کیا کر رہے ہیں اس کی خدمت تو میرے ذمہ ہے، حضرت رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے فرمایا ”نہیں یہ تمہارا نہیں میرا مہمان ہے۔“ دیکھئے ایک کافر ہندو کے ساتھ ہمارے اکابر کا یہ سلوک تھا۔

حضرت مفتی شفیع صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں: ”ایک مرتبہ میں ہندوستان میں سفر کر رہا تھا۔ انگریزی دورِ حکومت تھا، ریل کا سفر تھا۔ ریل میں رش بہت تھا اور سفر بھی رات بھر کا تھا۔ میرے برابر میں ایک بوڑھا ہندو بنیا آکر بیٹھ گیا۔ دورانِ سفر اس کو نیند آگئی تو میرے کندھے پر سر رکھ کر سو گیا۔ اب میرا مسئلہ یہ ہو گیا کہ اگر میں ذرا سا بھی ہلتا تو اس کی آنکھ کھل جاتی۔ وہ سونے کے بعد خراٹے لینے لگا۔ اس کے منہ سے بدبو بھی آرہی تھی۔ میں نے سوچا کہ ضعیف آدمی ہے اور میرا صاحب بالجنب (عارضی طور پر ساتھ ہونے والا ساتھی) ہے اور قرآن حکیم

میں "صاحب بالجنب" کے ساتھ بھی حسن سلوک کرنے کا حکم آیا ہے۔ اس لئے میں بڑی احتیاط سے بیٹھا کہ کہیں اس کی آنکھ نہ کھل جائے۔ کئی گھنٹے گزر گئے میں نے کروٹ نہیں بدلی۔ وہ خوب سویا، کسی شہر میں گاڑی رکی تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ چوں کہ میں کئی گھنٹے کا جاگا ہوا تھا اس لئے میری آنکھ لگ گئی۔ مجھے اونگھ آگئی تو میرا سر اس کے کندھے سے ہلکا سا ٹکرایا اس نے فوراً مجھے دھکا دیا۔"

اس نے ایک منٹ کے لئے بھی اس کو گوارا نہ کیا کہ کسی مسلمان کو ایک منٹ کے لئے راحت مل جائے جب کہ انہوں نے گھنٹوں تکلیف برداشت کرکے اُسے راحت پہنچائی۔ حضرت مفتی شفیع صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالىٰ کے واقعہ سے بھی یہ بات معلوم ہوئی اور قرآنی آیات اور احادیث سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حسنِ سلوک کا تعلق صرف مسلمان ہی کے ساتھ خاص نہیں بل کہ کافروں کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرنا چاہئے۔ ان کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آنا اور ان کو تکلیف سے بچانا ان کا حق ہے۔[1]

دو سوکنوں کی ہمدردی

بغداد میں ایک بڑا سوداگر رہتا تھا، دور دور سے خریدار اس کے یہاں پہنچتے اور اپنی ضرورت کا سامان خریدتے، اسی کے ساتھ ساتھ خدا نے اس کو گھریلو سکھ بھی دے رکھا تھا۔ اس کی بیوی نہایت خوب صورت، نیک، ہوشیار اور سلیقہ مند تھی۔ سوداگر بھی دل و جان سے اس کو چاہتا تھا اور بیوی بھی سوداگر پر جان چھڑکتی تھی اور نہایت عیش و سکون اور میل و محبت کے ساتھ ان کی زندگی بسر ہو رہی تھی۔

سوداگر کاروباری ضرورت سے کبھی کبھی باہر بھی جاتا اور کئی کئی دن گھر سے باہر سفر میں گزارتا۔ بیوی یہ سمجھ کر کہ یہ گھر سے غائب رہنا کاروباری ضرورت سے ہوتا

[1] اصلاحی تقریریں: ۵/۸۳

ہے، مطمئن رہتی۔ لیکن جب سوداگر جلدی جلدی سفر پر جانے لگا اور زیادہ دنوں تک گھر سے غائب رہنے لگا تو بیوی ذرا کھٹکی اور اس نے سوچا ضرور کوئی راز ہے۔

گھر میں ایک بوڑھی ملازمہ تھی سوداگر کی بیوی کو اس پر بڑا بھروسہ تھا اور اکثر باتوں میں وہ اس ملازمہ کو اپنا رازدار بنا لیتی۔ ایک دن اس نے بڑھیا سے اپنے شبہ کا اظہار کیا اور بتایا کہ مجھے بہت بے چینی ہے۔ بڑھیا بولی: اے بی بی! آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں؟ پریشان ہوں آپ کے دشمن، آپ نے اب کہا ہے دیکھئے میں چٹکی بجاتے میں سب راز معلوم کئے لیتی ہوں اور بڑھیا ٹوہ میں لگ گئی اب جب سوداگر گھر سے چلا تو یہ بھی پیچھے لگ گئی۔ آخر کار اس نے پتہ چلا لیا کہ سوداگر صاحب نے دوسری شادی کر لی ہے اور یہ گھر سے غائب ہو کر اس نئی بیوی کے پاس عیش کرتا ہے۔

بڑھیا یہ راز معلوم کر کے آئی اور بی بی کو سارا قصہ سنایا، سنتے ہی بی بی کی حالت غیر ہو گئی، سوکن کی جلن مشہور ہی ہے۔ لیکن جلد ہی اس بی بی نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور سوچا کہ جو کچھ ہونا تھا ہو ہی چکا ہے اب میں پریشان ہو کر اپنی زندگی کیوں اجیرن بناؤں۔ اور اس نے میاں پر قطعاً ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ اس راز سے واقف ہے وہ ہمیشہ کی طرح سوداگر کی خدمت کرتی رہی اور اپنے برتاؤ اور خلوص و محبت میں ذرا فرق نہ آنے دیا۔

دوسری طرف شریف سوداگر نے بھی اپنی بیوی کے حقوق میں کوئی کمی نہ کی۔ اپنے رویئے میں کوئی تبدیلی نہ آنے دی اور ہمیشہ کی طرح اسی خلوص و محبت سے بیوی کے ساتھ سلوک کرتا رہا۔ شوہر کے اس نیک برتاؤ نے بیوی کو سوچنے پر مجبور کر دیا اور اس نے یہ طے کر لیا کہ وہ شوہر کے اس جائز حق میں ہرگز روڑا نہ بنے گی۔ اس نے سوچا کہ آخر میاں مجھ سے ظاہر کر کے بھی تو دوسرا نکاح کر سکتا تھا۔ میاں نے اس طرح چھپا کر یہ نکاح کیوں کیا۔ اسی لئے تو میرے دل کو تکلیف ہوگی۔ میں

سوکن کو برداشت نہ کرسکوں گی......

کتنا پیارا ہے میرا شوہر، اس نے میرے نازک جذبات کا کیسا خیال رکھا، پھر اس نے اس نئی دلہن کی محبت میں مست ہوکر میرا کوئی حق بھی تو نہیں مارا۔ اس کے سلوک اور محبت میں بھی تو کوئی فرق نہیں آیا۔ آخر مجھے کیا حق ہے کہ میں اس کو اس حق سے روکوں جو خدا نے اس کو دے رکھا ہے مجھ سے زیادہ ناشکرا اور نالائق کون ہوگا۔ جو ایسے مہربان شوہر کے جائز جذبات کا لحاظ نہ کرے...... اور اس کے دل کو تکلیف پہنچائے ...... بیوی یہ سوچ کر بالکل ہی مطمئن ہوگئی۔ سوداگر بیوی کا خوش گوار سلوک اور محبت کا برتاؤ دیکھ کر یہی سمجھتا رہا کہ شاید خدا کی اس بندی کو یہ راز معلوم نہیں ہے اور پوری احتیاط کرتا رہا کہ کسی طرح معلوم نہ ہونے پائے۔ اور دونوں ہنسی خوشی پیار و محبت کی زندگی گزارتے رہے آخر کچھ سالوں کے بعد سوداگر کی زندگی کے دن پورے ہوئے اور اس کا انتقال ہوگیا۔ سوداگر نے چوں کہ دوسری شادی شہر سے دُور بہت خاموشی سے کی تھی اس لئے اس کے رشتہ داروں میں بھی کسی کو بھی یہ راز معلوم نہ تھا، سب یہی سمجھتے رہے کہ سوداگر کی بس یہی ایک بیوی تھی، چناں چہ جب ترکے کی تقسیم کا وقت آیا تو لوگوں نے یہی سمجھ کر ترکہ تقسیم کیا اور اس نیک بیوی کو اس کا حصہ دے دیا۔ سوداگر کی بیوی نے بھی اپنا حصہ لے لیا اور یہ پسند نہ کیا کہ اپنے شوہر کے اس راز کو فاش کرے جو زندگی بھر سوداگر نے لوگوں سے چھپایا۔ لیکن اس نیک بی بی نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ وہ سوداگر کی دوسری بیوی کا حق مار بیٹھے، بے شک کسی کو یہ خبر نہ تھی اور نہ اس کی طرف سے کوئی دعویٰ کرنے والا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو تو سب کچھ معلوم تھا جس کے حضور ہر انسان کو کھڑے ہوکر اپنے اچھے برے اعمال کا جواب دینا ہے۔

سوداگر کی بیوہ یہ سوچ کر کانپ گئی اور اس نے یہ طے کرلیا کہ جس طرح بھی ہوگا وہ اپنے حصے میں سے آدھی رقم ضرور اپنی سوکن بہن کو بھجوائے گی۔ اس نے ایک

نہایت معتبر آدمی کو یہ ساری بات بتا کر اپنے حصے کی آدھی رقم اس کے حوالے کی اور اپنی سوکن بہن کے پاس روانہ کیا۔ اور اس کے یہاں کہلوایا کہ افسوس! آپ کے شوہر اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

مجھے ان کی جائیداد اور ترکے میں سے جو کچھ ملا ہے اسلامی قانون کی رو سے آپ اس میں برابر کی شریک ہیں میں اپنے حصے کی آدھی رقم آپ کو بھیج رہی ہوں امید ہے کہ آپ قبول فرمائیں گی۔ یہ پیغام اور رقم بھیج کر نیک بی بی بہت مطمئن تھیں ان کو ایک روحانی سکون تھا۔ کچھ ہی دنوں میں وہ شخص واپس آگیا اور اس نے وہ ساری رقم واپس لاکر سوداگر کی بیوہ کو دی سوداگر کی بیوہ فکر مند ہوئیں اور وجہ پوچھی۔ قاصد نے جیب سے ایک خط نکالا اور کہا اس کو پڑھ لیجئے اس میں سب کچھ لکھا ہے آپ فکر مند نہ ہوں۔

سوکن کا سبق آموز خط:

پیاری بہن!

آپ کے خط سے یہ معلوم کرکے بڑا رنج ہوا کہ آپ کے اچھے شوہر کا انتقال ہوگیا اور آپ ان کی سرپرستی سے محروم ہوگئیں۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے اور ان پر اپنی رحمتوں اور عنایتوں کی بارش فرمائے۔ میں کس دل سے آپ کے خلوص و ایثار کا شکریہ ادا کروں کہ آپ نے ان کے ترکے میں سے اپنے حصے کی آدھی رقم مجھے بھیجی۔ میں آپ کی اس نیک روش سے، بہت ہی متاثر ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ سوداگر کے اس راز سے کوئی واقف نہ تھا۔ میرا نکاح بہت ہی پوشیدہ طریقے پر ہوا تھا۔ مجھے تو یہ یقین تھا کہ آپ کو بھی اس کی خبر نہیں ہے۔ میں کیا، خود سوداگر مرحوم بھی یہی سمجھتے رہے کہ آپ کو اس دوسری شادی کی اطلاع نہیں ہے اب آپ کے اس خط سے یہ راز کھلا ہے کہ آپ ہمارے راز سے واقف تھیں۔ آپ کو

ضرور اس واقعے سے تکلیف پہنچی ہوگی۔ لیکن اللہ اکبر! آپ کا صبر و ضبط! حقیقت یہ ہے کہ آپ نے جس صبر و ضبط سے کام لیا اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ کبھی اشارے کنائے سے بھی آپ نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ آپ ہماری اس خفیہ شادی سے واقف ہیں۔ آپ کا یہ ایثار اور صبر و تحمل واقعی حیرت انگیز ہے میں تو آپ کے اس کمال سے انتہائی متاثر ہوں۔

دولت کس کو کاٹتی ہے، دولت کے لئے کیا کچھ نہیں کیا جاتا۔ لیکن آفریں آپ کی ایمان داری کو، یہ جانتے ہوئے کہ میرا نکاح راز میں ہے اور وہاں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس کو اس کی خبر ہو اور جو میری طرف سے وکالت کرے مگر آپ نے محض خدا کے خوف سے میرے حق کا خیال رکھا اور اپنے حصے میں سے آدھی رقم مجھے بھیج دی۔ خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین ہو تو ایسا ہو اور خدا کے بندوں کے حقوق ادا کرنے کا جذبہ ہو تو ایسا ہو۔

اچھی بہن! میں آپ کی اس دیانت، خلوص اور حق شناسی سے بہت متاثر ہوں خدا آپ کو خوش رکھے اور دنیا و آخرت میں سرخرو فرمائے۔ لیکن بہن! میں اب اس حصے کی مستحق نہیں رہی ہوں خدا آپ کا یہ حصہ آپ ہی کو مبارک کرے۔ یہ صحیح ہے کہ سوداگر مرحوم نے مجھ سے نکاح کیا تھا اور یہ بھی صحیح ہے کہ وہ میرے پاس آکر کئی کئی دن تک رہتے تھے۔ بے شک ہم نے بہت دنوں عیش و مسرت کی زندگی بسر کی۔ لیکن ادھر کچھ دنوں سے یہ سلسلہ ختم ہوگیا تھا۔ سوداگر مرحوم نے مجھے طلاق دے دی تھی...... اس راز کی آپ کو بھی خبر نہیں ہے۔ میں اس خط کے ساتھ آپ کی اطلاع اور یقین کے لئے طلاق نامے کی نقل بھی بھیج رہی ہوں۔ آخر میں آپ کی بے مثال محبت، عنایت، ایثار، خلوص اور ہمدردی کا پھر شکریہ ادا کرتی ہوں۔

والسلام   آپ کی بہن......

سوداگر کی بیوہ نے اس خاتون کا یہ خط پڑھا تو بہت متاثر ہوئی اور اس کی سچائی

دیانت اور نیکی نے اس کے دل میں گھر کر لیا اور پھر دونوں میں مستقل طور پر خلوص و محبت اور رفاقت کا رشتہ قائم ہوگیا۔[1]

ایثار و ہمدردی کی جیتی جاگتی تصویر

(۱) حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ جو کہ دارالعلوم دیوبند کے مشہور محدث تھے اور سنن ابوداؤد کا درس دیا کرتے تھے۔

حضرت میاں صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ کا گھر دارالعلوم سے کافی فاصلے پر تھا۔ گھر کے قریب راستے میں ایک طوائف کا گھر پڑتا تھا، جو برسوں سے وہاں رہتی تھی، جب اس کا گھر آتا تو حضرت میاں صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ جوتے اتار لیتے، جب اس کا گھر گزر جاتا تو پھر جوتے پہن لیتے۔ والد صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ میں نے پوچھ ہی لیا کہ یہاں سے رات کو گزرتے ہوئے آپ جوتے کیوں اتار لیتے ہیں، جواباً حضرت رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ نے عجیب بات ارشاد فرمائی، فرمایا کہ جب یہ جوان تھی تو اس کے بہت گاہک آتے تھے اب بوڑھی ہوگئی ہے کوئی گاہک نہیں آتا، رات کو دیر تک گاہک کی منتظر رہتی ہے۔ میں رات کو جوتے اس لئے اتار دیتا ہوں کہ کہیں میرے جوتوں کی آہٹ سے اس کو یہ امید نہ بندھ جائے کہ شاید کوئی گاہک آیا ہے۔ مجھے تو اس کے پاس جانا نہیں میں گزر جاؤں گا تو اس کا دل ٹوٹے گا۔ فضول کسی کا دل دکھانا کون سی نیکی کا کام ہے۔ ایک طوائف کے امکانی خطرے کے پیش نظر یہ مستقل معمول بنا رکھا تھا کہ اس کے گھر کے قریب سے رات کو ننگے پاؤں گزرتے تھے۔[2]

(۲) حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں: ایک روز والد صاحب مدظلہم (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَىٰ) اور میں بعد مغرب حضرت

[1] صفة الصفوة: ٢/٣٤٤، رقم: ٣٧١

[2] اصلاحی تقریریں: ٢/٢٤١

مولانا میاں اصغر حسین صاحب کے گھر پر حاضر ہوئے۔ فرمانے لگے، آم چوسو گے؟ والد صاحب نے عرض کیا: آم اور پھر حضرت کے عطا فرمودہ، نُوْرٌ عَلٰی نُوْر، ضرور عطا ہوں۔ میاں صاحب اٹھے، ایک ٹوکری میں آم لا کر رکھے۔ اور ایک خالی ٹوکری گٹھلی اور چھلکوں کے لئے سامنے لا کر رکھ دی۔ ہم آم چوس کر فارغ ہوئے تو والد صاحب گٹھلی اور چھلکوں سے بھری ہوئی ٹوکری اٹھا کر باہر پھینکنے کے لئے چلے۔ پوچھا یہ ٹوکری کہاں لے کر چلے؟ عرض کیا چھلکے باہر پھینکنے کے لئے جا رہا ہوں۔ ارشاد ہوا کہ پھینکنے آتے ہیں یا نہیں؟ والد صاحب نے فرمایا کہ حضرت! یہ چھلکے پھینکنا کون سا خصوصی فن ہے۔ جس کو سیکھنا ضروری ہے؟

فرمایا ہاں! تم اس فن سے واقف نہیں، لاؤ مجھے دو، خود ٹکری اٹھا کر پہلے گٹھلی چھلکوں سے علیحدہ کی اس کے بعد باہر تشریف لائے اور سڑک کے کنارے تھوڑے تھوڑے فاصلے کے ساتھ متعین جگہوں پر چھلکے رکھ دیئے۔ ایک خاص جگہ گٹھلیاں ڈال دیں۔

والد صاحب کے استفسار پر ارشاد فرمایا: ہمارے مکان کے قرب و جوار میں تمام غرباء و مساکین رہتے ہیں۔ زیادہ تر وہی لوگ ہیں جن کو نان جویں بھی بمشکل ہی میسر آتی ہے اگر وہ پھلوں کے چھلکے ایک جگہ دیکھیں گے تو ان کو اپنی غریبی کا شدت سے احساس ہوگا۔ بے مائیگی کی وجہ سے حسرت ہوگی اور اس ایذا دہی کا باعث میں بنوں گا۔ اس لئے متفرق کر کے ڈالتا ہوں اور وہ بھی ایسے مقامات پر جہاں جانوروں کے گلے گزرتے ہیں یہ چھلکے ان کے کام آجاتے ہیں۔ اور گٹھلیاں ایسی جگہ رکھی ہیں جہاں بچے کھیلتے کودتے ہیں بچے ان کو بھون کر کھا لیتے ہیں۔ یہ چھلکے اور گٹھلیاں بھی بہر حال ایک نعمت ہے ان کو بھی ضائع کرنا مناسب نہیں۔[1]

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنے کی ہے کہ میاں صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی خود

[1] اکابر دیوبند کیا تھے: ص ۱۰۲

تو شاید ہی کوئی آم چکھ لیتے ہوں عموماً مہمانوں ہی کے لئے ہوتے تھے اور محلے کے غریب بچوں کو بلا بلا کر کھلانے میں استعمال ہوتے تھے اس کے باوجود چھلکے اور گٹھلیوں کو ایک ساتھ ڈھیر کر دینے سے گریز فرماتے تھے کہ غریبوں کی حسرت کا سبب نہ بن جائیں۔ بعض فقہاء نے بازار کے کھانے سے اس لئے پرہیز فرمایا کہ اس پر غریبوں کی نظریں پڑتی ہیں اور ناداری کے سبب وہ ان کی حسرت کا سبب بنتی ہے۔

دیکھیے ان اللہ والوں کی نظر دنیا کے کاموں میں کیسی دقیق ہوتی ہے۔ اور ہر چیز کا حق کس کس طرح ادا کرتے ہیں۔

(۳) حضرت میاں صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کے لئے جو کھانا گھر سے آتا تھا خود تو بہت کم خوراک لیتے تھے باقی کھانا محلے کے بچوں کو بلا کر کھلاتے تھے۔ جو بوٹی بچ جاتی اس کو بلی کے لئے دیوار پر رکھ دیتے تھے اور جو ٹکڑے بچ جاتے اس کو چھوٹا چھوٹا کر کے چڑیوں کے لئے اور دستر خوان کے ریزوں کو بھی ایسی جگہ جھاڑتے تھے جہاں چیونٹیوں کا بل ہوتا تھا۔[1] حق تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر پہچاننا ان کو ٹھکانے لگانا انہی صاحب بصیرت بزرگوں کا حصہ تھا۔ آج تو ہر گھر میں بچا ہوا کھانا سڑتا ہے اور نالیوں میں جاتا ہے۔ جس کا اگر اہتمام کیا جائے تو بہت سے غریبوں کا پیٹ بھر جائے۔

(۴) اعزاء و اقرباء احباب، اہل محلہ کے حقوق و جذبات کی جس قدر رعایت کرتے ہوئے اس مرد باخدا کو دیکھا اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ میاں صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کا اکثر مکان کچا تھا۔ جس پر ہر سال کہگل ہونا ضروری تھی۔ اگر نہ کی جاتی تو مکان منہدم ہونے کا خطرہ تھا۔ ہر سال برسات سے پہلے اس پر کہگل کرانے کا معمول تھا اور اس وقت گھر کا سارا سامان باہر نکالنا پڑتا تھا۔ ایسے ہی ایک موقع پر والد صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے عرض کیا کہ حضرت! ہر سال آپ کو یہ تکلیف ہوتی ہے۔ اور ہر سال کا خرچ بھی جو اس پر ہوتا ہے وہ جوڑا جائے تو پانچ سات سال میں اتنا ہو

[1] اکابر دیوبند کیا تھے: ص ۱۰۳

جائے گا کہ اس سے پختہ اینٹوں کا مکان بن جائے۔

اخلاق کریمانہ سے کسی کی بات کاٹنے کا وہاں دستور ہی نہ تھا، بڑی دل داری اور حوصلہ افزائی کے ساتھ فرمایا۔ ماشاء اللہ آپ نے کیسی عقل کی بات فرمائی۔ میرا بھی اندازہ یہی ہے۔ پانچ سال میں جتنا خرچ اس پر ہو جاتا ہے اتنے خرچ سے پختہ مکان بنا کر اس غم سے نجات ہو سکتی ہے۔ ہم بڈھے ہو گئے اتنی عقل نہ آئی کہ ایک دفعہ ایسا کر لیتے۔ یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ اس کی جو اصل حقیقت تھی اس کا اظہار اس طرح فرمایا کہ:

میرے پڑوس میں جتنے مکان ہیں سب غریبوں کے ہیں اور کچے ہیں، ایسی حالت میں میاں صاحب کیا اچھا لگتا کہ اپنا مکان پختہ بنا کر بیٹھ جاتا، پڑوسیوں کو حسرت ہوتی۔[1]

اس وقت یہ راز کھلا کہ یہ حضرت کس بلند مقام پر ہیں۔ ان کے اعمال و افعال کا اندازہ لگانا دشوار ہے کہ ان میں کیسے کیسے اسرار پوشیدہ ہیں۔ پڑوسیوں اور غریبوں کی رعایت ان کی خدمت جو حضرت میاں صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کی فطرت بنی ہوئی تھی دوسروں کا اس کی طرف دھیان جانا بھی آسان نہ تھا۔

؎ درنیابد حال پختہ ہیچ خام
بس سخن کوتاہ باید و السلام

میں نے دیکھا کہ اس کے بعد بھی ہمیشہ سالانہ یہ تکلیف برداشت کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ پڑوسیوں نے اپنے مکانات پختہ بنائے تب حضرت میاں صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے بھی اپنے مکان کو پختہ بنوایا۔

یہ حضرت ہیں جن کو سلف کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ حضرت فاروق اعظم رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کے عہد خلافت میں ایک مرتبہ مدینہ طیبہ میں گھی مہنگا ہو گیا۔ تو حضرت امیر المؤمنین

[1] اکابر دیوبند کیا تھے: ص ۱۰۲

سیدنا فاروق اعظم رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے گھی کھانا ترک کر دیا۔ اور فرمایا: میں اس وقت گھی کھاؤں گا جب مدینہ کے عوام گھی کھانے لگیں۔

یہ واقعہ تاریخ میں پڑھا اور سنا تھا مگر ایثار، ہمدردی اور اخوت کے اس مقام بلند کی جیتی جاگتی تصویر حضرت میاں صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی ہی کی زندگی میں نظر آئی۔

حاجت مندوں کے ساتھ بھلائی و خیر خواہی:

”حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کو حق تعالیٰ نے جو کمالات علمی اور عملی، ظاہری اور باطنی عطا فرمائے تھے، حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک شخص کے لئے ان کا ادراک بھی آسان نہ تھا۔ اور کوئی کیسے سمجھے کہ یہ کوئی بڑے عالم یا صاحب کرامات صوفی اور صاحب نسبت شیخ ہیں جب کہ غایت تواضع کا یہ عالم ہو کہ بازار کا سودا سلف نہ صرف اپنے گھر کا، بل کہ محلّہ کی بیواؤں اور ضرورت مندوں کا بھی خود لاتے۔ بوجھ زیادہ ہو جاتا تو بغل میں گٹھڑی دبا لیتے۔ اور پھر ہر ایک کے گھر کا سودا مع حساب کے اس کو پہنچاتے۔[1]“

بسا اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ جب حضرت مفتی صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کسی عورت کو سودا دینے کے لئے جاتے تو وہ دیکھ کر کہتی ”مولوی صاحب! یہ تو آپ غلط لے آئے ہیں۔ میں نے یہ چیز اتنی نہیں، اتنی منگائی تھی“ چناں چہ یہ فرشتہ صفت بزرگ دوبارہ بازار جاتے اور اس عورت کی شکایت دور کرتے۔

تواضع اور سادگی کا یہ وصف اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی عزیز الرحمٰن رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے جانشین مفتی شفیع صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کو بھی خوب عطا فرمایا تھا۔ آپ بھی اپنے علمی و عملی مقام بلند کے باوصف نہ صرف اپنا بل کہ محلّہ کے بے سہارا افراد اور عزیزوں، رشتہ داروں کا کام بھی خود کیا کرتے تھے اور آپ کو کسی کام سے عار نہ تھی۔

[1] مقدمہ فتاوی دارالعلوم دیوبند: ٤٦/١

یہاں تک کہ ایک مرتبہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ نے غایت شفقت کی بنا پر آپ سے فرمایا:

"بھائی مولوی صاحب! دارالعلوم دیوبند کے مفتی ہوگئے ہیں، اس منصب کا بھی کچھ خیال کیا کریں۔ اب آپ کو پتیلی ہاتھ میں لے کر بازار میں نہیں پھرنا چاہیے۔"

مفتی شفیع صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالیٰ فرماتے ہیں: "حضرت مدنی قدس سرہ کی اس تنبیہ پر مجھے خیال ہوا کہ میں واقعۃً اس منصب کی حق تلفی تو نہیں کر رہا۔ لیکن میرے اساتذہ ہی میں سے کسی نے حضرت مدنی قدس سرہ سے فرمایا کہ پہلے مفتی صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالیٰ (یعنی مفتی عزیز الرحمان صاحب) کا حال بھی تو یہی تھا۔"

اس پر حضرت مدنی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالیٰ نے تبسم فرمایا گویا فرما رہے ہوں کہ سادگی اور تواضع کی یہ ادا محبوب تو بہت ہے۔ البتہ اب لوگوں کے مزاج چوں کہ بگڑ گئے ہیں۔ اس لئے قدرے احتیاط کی ضرورت ہے۔[1]

ضعیفوں کے ساتھ خیر خواہی:

حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالیٰ کا شمار بھی اکابر دیوبند میں ہوتا ہے۔ ان کے علم وفضل کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالیٰ کے بلاواسطہ شاگرد اور حضرت شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالیٰ کے ہم سبق ہیں۔ وہ ایک مرتبہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ راستہ میں ایک بوڑھا ملا جو بوجھ لئے جا رہا تھا، بوجھ زیادہ تھا اور وہ بمشکل چل رہا تھا۔ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالیٰ نے یہ حال دیکھا تو اس سے وہ بوجھ لے لیا اور جہاں وہ لے جانا چاہتا تھا وہاں پہنچا دیا۔ اس

[1] اکابر دیوبند کیا تھے: ص ۶۵

بوڑھے نے ان سے پوچھا: "جی! تم کہاں رہتے ہو؟" انہوں نے کہا: "بھائی! میں کاندھلہ میں رہتا ہوں۔"

اس نے کہا: "وہاں مولوی مظفر حسین بڑے ولی ہیں" اور یہ کہہ کر ان کی بڑی تعریفیں کیں، مگر مولانا نے فرمایا: "اور تو اس میں کوئی بات نہیں ہے، ہاں نماز تو پڑھ لیتے ہیں۔" اس نے کہا "واہ میاں! تم ایسے بزرگ کو ایسا کہو؟" مولانا رَحِمَهُ اللهُ تَعَالیٰ نے فرمایا: "میں ٹھیک کہتا ہوں۔" وہ بوڑھا ان کے سر پر ہوگیا، اتنے میں ایک اور شخص آگیا جو مولانا رَحِمَهُ اللهُ تَعَالیٰ کو جانتا تھا، اس نے بوڑھے سے کہا "بھلے مانس! مولوی مظفر حسین یہی ہیں" اس پر وہ بوڑھا مولانا سے لپٹ کر رونے لگا۔

انہی مولانا مظفر حسین صاحب رَحِمَهُ اللهُ تَعَالیٰ کی عادت یہ تھی کہ اشراق کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلا کرتے تھے اور اپنے تمام رشتہ داروں کے گھر تشریف لے جاتے جس کسی کو بازار سے کچھ منگانا ہوتا اس سے پوچھ کر لا دیتے لیکن اس زمانے میں لوگوں کے پاس پیسے کم ہوتے تھے، عموماً چیزیں غلے کے عوض خریدی جاتی تھیں چناں چہ آپ گھروں سے غلہ باندھ کر لے جاتے اور اس سے اشیاءِ ضرورت خرید کر لاتے تھے۔[1]

حکیم الامت حضرت تھانوی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالیٰ

(۱) حضرت والا کو اگر کبھی مسجد میں کسی وجہ سے دیر ہو جاتی تو اصرار کر کے دوسرے امام سے نماز پڑھوا دیتے اور خود وضو وغیرہ سے فارغ ہو کر بعد کو مقتدیوں میں شریک ہو جاتے۔ ویسے بھی عام اصول یہ مقرر فرما رکھا تھا کہ وسیع وقت میں زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ انتظار کیا جائے اور غیر وسیع وقت میں اتنا بھی نہیں تاکہ مقتدیوں کا حرج یا ان کو تکلیف نہ ہو۔[2]

(۲) ایک بار حضرت بڑی پیرانی صاحبہ مدظلہا چھت پر سے گر پڑیں اس وقت

[1] اکابر دیوبند کیا تھے؟ ص ۱۰۰، ۱۰۱
[2] اشرف السوانح: ۱۱۰/۳

حضرت والا خانقاہ میں فجر کی سنتیں پڑھ رہے تھے اسی دوران اطلاع ہوئی۔ حضرت والا نے فوراً نیت توڑ دی اور گھر تشریف لے جا کر ان کی تیمارداری فرمائی۔ جب سب ضروری انتظامات فرما چکے اس وقت واپس تشریف لا کر نماز فجر ادا کی۔ ایسی حالت میں نیت توڑ دینا شرعاً واجب تھا۔[1]

سبحان اللہ! کیا ادائے حقوق اور حفظ حدود ہے ورنہ زاہدانِ خشک تو نماز تو درکنار ایسے مواقع پر وظیفہ بھی چھوڑنا خلاف زہد سمجھتے ہیں جو سراسر حدود شرعیہ سے تجاوز ہے۔[2]

۳ ایک مرتبہ یہ بھی فرمایا کہ میں اس لئے بھی دینی کاموں کو مختلف جگہوں میں تقسیم کرتا رہتا ہوں کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے مرنے کا بھی کسی کو صدمہ نہ ہو۔ کہ اتنے کام ایک ساتھ بند ہوگئے۔ میں تو مسلمانوں کی اتنی تکلیف بھی گوارا نہیں کرتا کہ کوئی میرے مرنے کا بھی افسوس کرے گو طبعی افسوس تو قبضہ سے باہر ہے۔

مفتی شفیع صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ کی اولاد کو مشفقانہ نصیحت

حضرت مولانا مفتی رفیع عثمانی دَامَتْ بَرَکَاتُہُمُ العَالِیَہ فرماتے ہیں:

ایک مرتبہ ہم سارے بہن بھائی اپنے والد صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ کے اردگرد جمع تھے اور ہنس بول رہے تھے کبھی وہ لطائف سناتے اور کبھی ہم۔ بڑا خوشگوار ماحول تھا۔ جب ہنس بول چکے تو فرمایا کہ اب ایک کام کی بات سنو اور ہم سب بھائیوں کو جمع کر کے فرمایا: تمہاری ماں کو تم سے ایک شکایت ہے وہ جس سے کام کو کہتی ہے وہ دوسرے پر ڈال دیتا ہے اور وہ بے چاری پریشان رہتی ہے اور کہتی ہے کہ تم نے اپنے

[1] "كَمَا فِي الدُّرِّ الْمُخْتَارِ -بَابُ إِدْرَاكِ الْفَرِيْضَةِ، وَيَجِبُ الْقَطْعُ لِنَحْوِ إِنْجَاءِ غَرِيْقٍ أَوْ حَرِيْقٍ- فِيْ رَدِّ الْمُخْتَارِ قَوْلُهٗ وَيَجِبُ أَيْ يَفْتَرِضُ قُلْتُ وَلَا شَكَّ أَنَّ الْوَاقِعَةَ الْمَذْكُوْرَةَ نَحْوَ الْإِنْجَاءِ الْمَذْكُوْرِ لِإِشْتِرَاكِ كُلٍّ مِّنْهُمَا فِيْ كَوْنِهٖ صَوْنًا عَنِ الْإِهْلَاكِ اهـ"

[2] اشرف السوانح: ۳/۱۱۰

بیٹوں کو شہزادہ بنا رکھا ہے۔ ان کے دماغ خراب کر دیئے ہیں، بازار سے دودھ دہی لانے کے لئے برتن لے جاتے ہوئے شرماتے ہیں، پہلے تو میں سمجھتا تھا کہ یہ تمہاری سستی کی وجہ سے ہے، مگر جب سے تمہاری ماں نے یہ شکایت کی تو مجھے افسوس ہوا۔ سب سے پہلے والد صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ نے ماں کی خدمت کے بارے میں جو احادیث و فضائل ہیں وہ بیان فرمائے۔

پھر فرمایا: میرے اور اللہ کے درمیان ایک راز تھا جو کبھی بھی کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ آج تمہاری خاطر وہ راز کھول رہا ہوں اور تمہیں اپنے دو واقعے سناتا ہوں۔

۱ ایک واقعہ یہ سنایا کہ دیوبند میں ہمارا گھر غریب جولاہوں کے محلے کے بالکل برابر تھا۔ آگے ہندوؤں کا محلہ تھا پھر مسجد آتی تھی، وہاں ہندوؤں کا ایک کنواں تھا جس سے لوگ پانی بھر کے گھر لے جاتے تھے۔ ایک دن حضرت والد صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ فجر کی نماز کے لئے نکلے تو دیکھا کہ ایک بڑھیا پانی کا گھڑا اٹھائے آرہی تھی اور حضرت نماز فجر کے لئے مسجد جارہے تھے۔ اس نے گھڑا زمین پر رکھا اور تھک کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی کہ کوئی میرا یہ گھڑا اُٹھوا دے۔ فرماتے ہیں: میں نے آگے بڑھ کر گھڑا اٹھوایا، مگر وہ اچھا خاصا وزنی تھا۔ فرمایا کہ بڑی شرم سی آئی کہ اٹھا کر واپس اسی ضعیف بڑھیا کے کاندھوں پر رکھوا دوں۔ وہ گھڑا میں نے اپنے کاندھے پر رکھا اور کہا: اماں مجھے اپنے گھر کا راستہ بتاؤ میں پہنچا کر آتا ہوں۔ چناں چہ وہ بڑھیا آگے اور مفتی اعظم سر پر گھڑا اُٹھائے پیچھے پیچھے، اس کے گھر پہنچ کر جہاں اس نے کہا حضرت نے گھڑا رکھ دیا اور واپس چلے آئے۔

فرماتے تھے کہ جب میں واپس آیا تو وہ ایسی زور زور سے دل کی گہرائیوں سے دین و دنیا کی بھلائی کی دعائیں دے رہی تھی کہ میں دور تک چلا آیا مگر اس کی آوازیں آتی رہیں۔ میں نے سوچا کہ یہ تو بڑے نفع کا سودا ہے چند لمحوں میں اتنی ساری اور اتنی پرخلوص دعائیں مل جاتی ہیں۔ اگلی صبح میں پھر کنویں کے پاس پہنچا تو

دیکھا کہ وہ کنویں میں ڈول ڈال رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ میں پانی بھر دوں، پھر پانی بھر کر اسی جگہ چھوڑ آیا، پھر وہی دعائیں ملیں۔ اس کے بعد سے یہ عزم کر لیا کہ جب تک یہ زندہ ہے یا میں زندہ ہوں تو یہ کام روز کروں گا۔ چناں چہ اس کے بعد جب تک وہ زندہ رہیں کبھی ناغہ نہیں ہوا۔

۲ دوسرا واقعہ یہ سنایا کہ تھانہ بھون کا ریلوے اسٹیشن تنگ وتاریک اور بالکل ویران سا تھا۔ لے دے کر ایک ہی گاڑی آتی تھی اور میں نے حکیم الامت حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ کو اپنے آنے کی اطلاع کر رکھی تھی، جب میں گاڑی سے اسٹیشن پر اترا تو رات کی تاریکی میں قلی قلی کی آواز آئی مگر وہاں تو قلی کا سوال ہی نہ تھا۔ مجھے اندھیرے میں کچھ سائے نظر آئے، معلوم ہوا کہ آواز لگانے والے کے ساتھ عورتیں بھی ہیں۔ انہوں نے بہت آوازیں دیں، مگر جب کوئی قلی نہ آیا تو ان کی آواز میں گھبراہٹ محسوس ہونے لگی۔ میں نے سوچا کہ سردی کی راتیں ہیں۔ سامان بھی ہے اور اہل خانہ بھی ہیں۔ میں نے جو مزید توجہ کی تو معلوم ہوا کہ یہ صاحب تو حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے ہیں اور ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے بھی ہیں۔ اگر جا کر کہوں کہ میں یہ سامان اُٹھا لوں تو وہ اُٹھانے نہیں دیں گے۔ جب انہوں نے آخری مرتبہ انتہائی گھبراہٹ سے آواز لگائی تو مجھے ایک ترکیب سوجھی، میرے پاس ایک چادر تھی۔ میں نے اسے منہ پر لپیٹ لیا اور قلیوں کا سا حلیہ بنا کر کہا کہ قلی آگیا ہے۔ انہوں نے ایک صندوق اٹھایا اور میرے سر پر رکھ دیا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں گردن ہی نہ مڑ جائے، وہ دوسرا سامان بھی رکھنے لگے تو میں نے کہا صاحب بس دوسرا کوئی چھوٹا سامان میرے ہاتھ میں دے دو۔ پھر میں ان کے آگے آگے چلا کہ وہ مجھے پہچان نہ سکیں یہاں تک کہ بستی آگئی۔ میں نے ان کے مطلوبہ گھر میں سامان رکھا۔ انہوں نے کہا باہر ٹھہرو، لیکن میں چلا آیا۔ اگلے دن مجلس میں ان صاحب سے ملاقات ہوئی لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ رات کا قلی کون

تھا۔ اور پھر ساری عمر ان کو اسی قلی کے بارے میں علم نہ ہوسکا۔ یہ راز اللہ کے اور میرے علاوہ کسی کو معلوم نہ تھا آج تمہیں سمجھانے کے لئے ظاہر کرنا پڑا۔[1]

رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی و ہمدردی

تمام انسان آپس میں رشتہ دار ہیں:

یوں اگر دیکھا جائے تو سارے ابن آدم اور سارے انسان آپس میں رشتہ دار ہیں، جیسا کہ حضور اقدس ﷺ نے حدیث میں بھی اس کا ذکر فرمایا ہے، کیوں کہ تمام انسانوں کے باپ ایک ہیں، یعنی حضرت آدم عَلَیْہِ السَّلَام، جن سے ہم سب پیدا ہوئے۔ بعد میں آگے چل کر شاخیں ہوتی چلی گئیں، خاندان اور قبیلے تقسیم ہوتے چلے گئے۔ کوئی کہیں جا کر آباد ہوا، اور کوئی کہیں، اور دور کی رشتہ داریاں ہوگئیں۔ جس کی وجہ سے آپس میں ایک دوسرے کو رشتہ دار نہیں سمجھتے، ورنہ حقیقت میں تو سارے انسان ایک دوسرے کے قرابت دار اور رشتہ دار ہیں۔ البتہ کسی کی رشتہ داری قریب کی ہے، کسی کی رشتہ داری دور کی ہے، لیکن رشتہ داری ضرور ہے۔

حقوق کی ادائیگی سکون کا ذریعہ ہے:

جو قریب ترین رشتہ دار ہوتے ہیں۔ جن کو عرف عام میں رشتہ دار سمجھا جاتا ہے۔ جیسے بھائی، بہن، چچا، تایا، بیوی، شوہر، خالہ، ماموں، باپ اور ماں —— ان رشتہ داروں کے کچھ خاص حقوق اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں۔ اور ان حقوق کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اگر ان رشتہ داروں کے حقوق صحیح طور ادا کئے جائیں تو اس کے نتیجے میں زندگی پرامن اور پرسکون ہو جاتی ہے۔ یہ لڑائی اور جھگڑے یہ نفرتیں اور عادتیں، یہ مقدمہ بازیاں، یہ سب ان حقوق کو پامال کرنے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اگر ہر

[1] اصلاحی تقریریں: ۶۰/۳

شخص اپنے اپنے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرے تو پھر کبھی کوئی جھگڑا اور کوئی لڑائی نہ ہو، کبھی مقدمہ بازی کی نوبت نہ آئے ــــــ اس لئے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر یہ حکم دیا کہ اگر تم ان حقوق کو ادا کرو گے تو تمہاری زندگی پرسکون ہوگی۔ ــــــ ”خاندان“ کسی بھی معاشرے کی بنیاد ہوتی ہے، اگر ”خاندان“ متحد نہیں ہے اور خاندان والوں کے درمیان آپس میں محبتیں نہیں ہیں، آپس کے تعلقات درست نہیں ہیں، تو یہ چیز پورے معاشرے کو خراب کرتی ہے، اور پورے معاشرے کے اندر اس کا فساد پھیلتا ہے، اس کے نتیجے میں پوری قوم خراب ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا خاص طور پر حکم دیا ہے۔

اللہ کے لئے اچھا سلوک کرو:

ویسے تو ہر مذہب میں اور ہر اخلاقی نظام میں رشتہ داروں کے حقوق کی رعایت کا سبق دیا گیا ہے، اور ہر مذہب والے یہ کہتے ہیں کہ رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ لیکن حضور اقدس نبی کریم ﷺ نے ان حقوق کے بارے میں ایک ایسا اصول بیان فرمایا ہے جو تمام دوسرے مذاہب اور اخلاقی نظاموں سے بالکل ممتاز اور الگ ہے۔ اگر وہ اصول ہمارے دلوں میں بیٹھ جائے تو پھر کبھی بھی رشتہ داروں کے حقوق کی خلاف ورزی نہ ہو، اور ان کے ساتھ کبھی بھی بدسلوکی نہ کریں ــــ وہ اصول یہ ہے کہ جب بھی ان کے ساتھ اچھا برتاؤ یا اچھا سلوک کرو تو یہ کام ان کو خوش کرنے سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لئے کرو۔ یعنی رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے وقت یہ نیت ہونی چاہئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور اس عمل سے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا مقصود ہے، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر یہ سلوک کر رہا ہوں، جب انسان اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر اچھا سلوک کرے گا تو اس کا لازمی نتیجہ

یہ ہوگا کہ وہ اپنے رشتہ داروں سے کسی ”بدلے“ کی توقع نہیں رکھے گا۔ بل کہ اس کے ذہن میں یہ ہوگا کہ میں تو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے ان کے ساتھ اچھا سلوک کر رہا ہوں، میرے اچھے سلوک کے نتیجے میں یہ رشتہ دار خوش ہو جائیں، اور میرا شکریہ ادا کریں، اور کوئی بدلہ دیں تو وہ ایک نعمت ہے، لیکن اگر وہ خوش نہ ہوں، اور بدلہ نہ دیں تو بھی مجھے ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہے، مجھے اپنا وہ فریضہ انجام دینا ہے جو میرے اللہ نے میرے سپرد کیا ہے۔

شکریہ اور بدلے کا انتظار مت کرو:

رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کے بارے میں ہر شخص یہ کہتا ہے کہ یہ حقوق ادا کرنا اچھی بات ہے، یہ حقوق ادا کرنے چاہئیں۔ لیکن سارے جھگڑے اور سارے فساد یہاں سے پیدا ہوتے ہیں کہ جب رشتہ دار کے ساتھ اچھا سلوک کر لیا تو اب آپ اس امید اور انتظار میں بیٹھے ہیں کہ اس کی طرف سے شکریہ ادا کیا جائے گا۔ اس کی طرف سے اس حسنِ سلوک کا بدلہ ملے گا، اور اس انتظار میں ہیں کہ وہ میرے حسنِ سلوک کے بارے میں خاندان والوں میں چرچا کرے گا، اور میرے گن گائے گا۔ لیکن آپ کی یہ اُمید پوری نہ ہوئی، اس نے نہ تو شکریہ ادا کیا، اور نہ ہی بدلہ دیا، تو اب آپ کے دل میں اس کی طرف سے برائی آگئی کہ ہم نے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا، لیکن اس نے پلٹ کر پوچھا تک نہیں، اس کی زبان پر کبھی ”شکریہ“ کا لفظ ہی نہیں آیا، اس نے تو کبھی بدلہ ہی نہیں دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے اس کے ساتھ جو حسنِ سلوک کیا تھا اس کے ثواب کو ملیامیٹ کر دیا۔ آپ اپنے دل میں اس کی طرف سے برائی لے کر بیٹھ گئے، اور آئندہ جب کبھی حسنِ سلوک کرنے کا موقع آئے گا تو آپ یہ سوچیں گے کہ اس کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے سے کیا فائدہ اس کی زبان پر تو کبھی ”شکریہ“ کا لفظ بھی نہیں آتا، میں اس کے ساتھ کیا اچھائی کروں۔

چناں چہ آئندہ کے لئے اس کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا چھوڑ دیا، اور اب تک جو اس کے ساتھ حسنِ سلوک کیا تھا، اس کا ثواب بھی اکارت گیا۔ اس لئے کہ اب تک بھی اس کے ساتھ جو حسنِ سلوک کیا تھا، وہ اللہ کے لئے نہیں کیا تھا بل کہ وہ تو ''شکریہ'' اور ''بدلہ'' لینے کے لئے کیا تھا۔ اس لئے حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب کسی کے ساتھ حسنِ سلوک کرو تو صرف اللہ کو راضی کرنے کے لئے کرو، اس خیال سے مت کرو کہ یہ میرے ساتھ بھی بدلے میں حسنِ سلوک کرے گا، یا میرا شکریہ ادا کرے گا۔

صلہ رحمی کرنے والا کون ہے؟

ایک حدیث جو ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے۔ وہ یہ کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِي لٰكِنِ الْوَاصِلُ الَّذِيْ إِذَا قُطِعَتْ رَحِمُهٗ وَصَلَهَا."[1]

یعنی وہ شخص صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہے جو اپنے کسی رشتہ دار کی صلہ رحمی کا بدلہ دے کہ دوسرا رشتہ دار میرے ساتھ جتنی صلہ رحمی کرے گا میں بھی اتنی ہی صلہ رحمی کروں گا، اور اگر وہ صلہ رحمی کرے گا تو میں بھی کروں گا، اگر وہ نہیں کرے گا تو میں بھی نہیں کروں گا، ایسا شخص صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہے۔ اس کو صلہ رحمی کا اجر و ثواب نہیں ملے گا، بل کہ صلہ رحمی کرنے والا حقیقت میں وہ شخص ہے کہ دوسرا تو اس کا حق ضائع کر رہا ہے، اور اس کے ساتھ قطع تعلق کر رہا ہے، لیکن یہ شخص پھر بھی اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی خاطر اس کے ساتھ اچھا معاملہ کر رہا ہے، یہ شخص حقیقت میں صلہ رحمی کرنے والا ہے اور صلہ رحمی کے اجر و ثواب کا مستحق ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب لیس الواصل بالمکافی، رقم: ۵۹۹۱

ہمیں رسموں نے جکڑ لیا ہے:

آج جب بھی کسی شخص سے پوچھا جائے کہ رشتہ داروں کا بھی کچھ حق ہے؟ ہر ایک ہم میں سے یہی جواب دے گا کہ رشتہ داروں کے بہت حقوق ہیں۔ لیکن کون شخص ان حقوق کو کس درجے میں کس طرح ادا کر رہا ہے، اگر اس کا جائزہ لے کر دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ ہمارے سارے معاشرے کو رسموں نے جکڑ لیا ہے، اور رشتہ داروں سے جو تعلق ہے وہ صرف رسموں کی ادائیگی کی حد تک ہے اس سے آگے کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً اگر کسی کے گھر شادی بیاہ ہے تو اس موقع پر اس کو کوئی تحفہ دینے کو دل نہیں چاہ رہا ہے، یا دینے کی طاقت نہیں ہے تو اب یہ سوچ رہے ہیں کہ اگر تقریب میں خالی ہاتھ چلے گئے تو برا معلوم ہوگا۔ چناں چہ اب باوِل ناخواستہ اس خیال سے تحفہ دیا جا رہا ہے کہ اگر نہ دیا تو ناک کٹ جائے گی، اور خاندان والے کیا کہیں گے اور جس کے یہاں شادی ہو رہی ہے وہ یہ کہے گا کہ ہم نے تو اس کی شادی میں یہ تحفہ دیا تھا، اور اس نے ہمیں کچھ نہ دیا۔ چناں چہ یہ تحفہ دل کی محبت سے نہیں دیا جا رہا ہے بل کہ رسم پوری کرنے کے لئے نام و نمود کے لئے دیا جا رہا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس تحفہ دینے کا ثواب تو ملا نہیں، بل کہ بنام و نمود کی نیت کی وجہ سے اُلٹا گناہ ہوگیا۔

تقریبات میں ''نیوتہ'' دینا حرام ہے:

ایک رسم جو ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہے، کسی علاقے میں کم اور کسی علاقے میں زیادہ ہے، وہ ہے ''نیوتہ'' کی رسم۔ تقریبات میں لینے دینے کی رسم کو ''نیوتہ'' کہا جاتا ہے، ہر ایک کو یہ یاد ہوتا ہے کہ فلاں شخص نے ہماری تقریب کے موقع پر کتنے پیسے دیئے تھے، اور میں کتنے دے رہا ہوں۔ بعض علاقوں میں تو تقریبات کے موقع پر باقاعدہ فہرست تیار کی جاتی ہے کہ فلاں شخص نے اتنے پیسے

دیئے، فلاں شخص نے اتنے پیسے دیئے، پھر اس فہرست کو محفوظ رکھا جاتا ہے، اور پھر جس شخص نے پیسے دیئے ہیں، اس کے گھر جب کوئی شادی بیاہ کی تقریب ہوگی تو اب یہ ضروری ہے کہ جتنے پیسے اس نے دیئے تھے، اتنے پیسے اس کی تقریب میں دینا لازم اور ضروری ہے۔ چاہے قرض لے کر دے، یا اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر دے، یا چوری اور ڈاکہ ڈال کر دے، لیکن دینا ضرور ہے، اگر نہیں دے گا تو یہ اس معاشرے کا بدترین مجرم کہلائے گا۔ اسے "نیوتہ" کہا جاتا ہے۔ دیکھئے اس میں یہ پیسے صرف اس لئے دیئے جارہے ہیں کہ میرے گھر میں جب تقریب کا موقع آئے گا تو وہ بھی دے گا، لہٰذا "بدلہ" کے خیال سے جو پیسے دیئے جارہے ہیں یہ حرام قطعی ہیں، قرآن کریم نے اس کے لئے "ربوا" کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ چناں چہ فرمایا:

﴿وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ﴾[1]

"تم لوگوں کو نیوتہ کے طور پر جو کچھ ہدیہ یا تحفہ دیتے ہو (لیکن اس خیال سے دیا کہ وہ میری تقریب پر یا تو اتنا ہی دے گا، یا اس سے زیادہ دے گا) تاکہ اس سے مال کے اندر اضافہ ہو، تو یاد رکھو کہ اللہ کے نزدیک اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا، اور جو زکوۃ یا صدقہ تم اللہ کی رضا مندی کی نیت سے دیتے ہو تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے مال میں چند در چند اضافہ فرماتے ہیں۔"

تحفہ کس مقصد کے تحت دیا جائے؟

لہٰذا اگر کسی شخص کے دل میں خیال آیا کہ میرے ایک عزیز کے یہاں خوشی کا موقع ہے، میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کو کوئی ہدیہ پیش کروں، اور اس کی خوشی کے

[1] سورۃ الروم: ۳۹

اندر میں بھی شریک ہو جاؤں، اور ہدیہ دینے سے "بدلہ" اور نام نمود اور دکھاوا پیش نظر نہیں ہے، بل کہ اپنی رشتہ داری کا حق ادا کرنا ہے اور اللہ کو راضی کرنا ہے تو اس صورت میں تحفہ دینا اور پیسہ دینا اجر و ثواب کا باعث ہوگا، اور یہ تحفے اور پیسے صلہ رحمی میں لکھے جائیں گے۔ بشرطیکہ ہدیہ دینے سے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا مقصود ہو۔

مقصد جانچنے کا طریقہ:

اس کی پہچان کیا ہے کہ ہدیہ دینے سے اللہ کو راضی کرنا مقصود ہے یا "بدلہ" لینا مقصود ہے، اس کی پہچان یہ ہے کہ اگر ہدیہ دینے کے بعد اس بات کا انتظار لگا ہوا ہے کہ سامنے والا شخص اس کا شکریہ ادا کرے، اور کم از کم پلٹ کر اتنا تو کہہ دے آپ کا بہت بہت شکریہ، یا اس بات کا انتظار ہے کہ جب میرے گھر کوئی تقریب ہوگی تو یہ تقریب کے موقع پر کوئی ہدیہ تحفہ پیش کرے گا، یا اگر بالفرض تمہارے ہاں کوئی تقریب ہو تو وہ کوئی ہدیہ تحفہ نہ لائے تو اس وقت تمہارے دل پر میل آجائے اور اس کی طرف سے تمہیں شکایت ہو کہ ہم نے تو اتنا دیا تھا، اور اس نے تو کچھ بھی نہیں دیا، یا ہم نے زیادہ دیا تھا، اور اس نے ہمیں کم دیا ہے۔ یہ سب اس بات کی علامت ہیں کہ اس دینے میں اللہ تعالیٰ کی خوش نودی مقصود نہیں تھی۔ لہٰذا دیا بھی، اور اس کو ضائع بھی کر دیا، لیکن اگر ہدیہ دینے کے بعد ذہن کو فارغ کر دیا کہ چاہے میرا شکریہ ادا کرے یا نہ کرے، میرے یہاں تقریب کے موقع پر چاہے دے یا نہ دے، لیکن مجھے اللہ تعالیٰ نے دینے کی توفیق دی تو میں نے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے اپنے رشتہ داروں کی خوشی کے موقع پر اس کی خدمت میں ہدیہ پیش کر دیا، نہ تو مجھے شکریہ کا انتظار ہے، اور نہ بدلے کا انتظار ہے، اگر میرے گھر میں تقریب کے موقع پر یہ کچھ نہ دے تو بھی میرے دل پر میل نہیں آئے گا، میرے دل میں شکایت پیدا نہیں ہوگی تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ ہدیہ اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کی خاطر دیا

گیا ہے، یہ ہدیہ دینے والے اور لینے والے دونوں کے لئے مبارک ہے۔[1]

❶ حضرت مفتی رفیع عثمانی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں: الحمدللہ ہم نے والدِ ماجد رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ کا یہ عمل دیکھا کہ وہ اپنے رشتہ داروں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ان کی دو بہنیں بیوہ تھیں اور دونوں بہنوں کی کافی اولاد تھی۔ ان بہنوں اور ان کی اولاد کی کفالت والد صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ کیا کرتے تھے۔ والدہ (یعنی ہماری دادی) بھی بیوہ تھیں، ان کی کفالت بھی انہی کے ذمہ تھی اور ہم ماشاء اللہ نو بہن بھائی تھے۔ والد اور والدہ ملا کر گیارہ آدمی گھر کے تھے۔ بارہویں دادی جان تھیں۔ دو بہنوں اور ان کی اولاد کی کفالت کا مسئلہ بھی تھا۔ تنخواہ کیا تھی؟ دارالعلوم دیوبند کی ملازمت کے آخری زمانے میں ساٹھ روپے تنخواہ تھی۔

❷ حضرت مفتی شفیع صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ جب جمعہ کی نماز کے لئے جاتے تھے تو نماز سے فارغ ہو کر پھل لیتے اور اس بہن کے گھر جاتے جو دیوبند میں رہتی تھیں (دوسری بہن کسی اور شہر میں رہتی تھیں) اور ان کے ہاں پھل دے کر آیا کرتے تاکہ یتیم بچوں کو موسم کے پھلوں کی کمی محسوس نہ ہو اور دوسری بہن کے ہاں مختلف اوقات میں رقم بھجواتے رہتے۔ پاکستان آنے کے بعد بھی ان کا یہ معمول جاری رہا۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں رہائش پذیر اپنے ننھیال ماموں زاد بھائی اور خالہ زاد بھائی بہنوں کا ایسا خیال رکھتے کہ ان کو یہاں سے ماہانہ خرچ بھیجتے تھے۔ اور جب قانونی طور پر یہاں سے روپیہ بھیجنے پر پابندی لگ گئی تو دوسرے ملکوں کے ذریعے بھیجتے تھے۔ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے کہ ان کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ ان کا گھر گر چکا ہے اور ان کے بارے میں یہ خدشہ بھی تھا کہ اگر انہیں مرمت کے لئے نقد رقم دی جائے گی تو وہ کھا پی کر ختم کر دیں گے تو ایسی صورت میں کسی اور رشتے دار کو رقم بھیجی کہ تم ان کے گھر کی مرمت کرا دو۔

---

[1] اصلاحی خطبات: ۱۷۸/۸ تا ۱۸۵

رشتے داروں کا معاملہ معمولی نہیں، رشتے داروں کے زبردست حقوق ہیں اور ان کی ادائیگی کا اجر و ثواب بھی بہت زیادہ ہے۔ لیکن افسوس کہ آج کل اس کی طرف دھیان بہت کم دیا جاتا ہے۔ جہاد، تبلیغ، علمِ دین، حج اور عمرے وغیرہ کے فضائل خوب سننے کو ملتے ہیں لیکن صلہ رحمی اور رشتے داروں کے حقوق کا بیان شاذ و نادر ہی سننے میں آتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس معاملے میں بہت غفلت پائی جاتی ہے۔[1]

دوسروں کو تکلیف سے بچانے کا اتنا اہتمام!!!

ہمارے والدِ ماجد حضرت مفتی شفیع صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ اپنی زندگی کے آخری چار سال صاحبِ فراش رہے، دل کی تکلیف تھی، ہمارے دو بڑے بھائی شہر میں رہتے تھے۔ اس زمانے میں بھی اتوار کی چھٹی ہوتی تھی۔ ان کا معمول تھا کہ وہ اپنی بیوی بچوں کو لے کر ہر اتوار کو ملنے آیا کرتے تھے۔ ہمارے والدین ہفتہ بھر ان کی انتظار میں رہتے، اور اتوار کے دن تو دھیان بالکل اسی طرف لگا رہتا۔ شام کے قریب آیا کرتے تھے۔ عصر کے بعد والد صاحب کی نظریں دروازے پر ہوتیں۔ پانچ منٹ بھی دیر ہو تو انہیں مشکل محسوس ہوتی تھی۔ جب وہ آ جاتے تو ہمارے گھر میں عید کا سماں ہو جاتا۔ سب خوش ہوتے، ہنستے بولتے، والد صاحب کے پاس بیٹھتے۔

کبھی وہ رات کو رہنے کے ارادے سے آتے، کبھی صرف رات کا کھانا کھا کر واپس جانے کے ارادے سے آتے اور کبھی کھانا کھائے بغیر ہی واپس جانے کا پروگرام ہوتا تھا۔ مگر جو کچھ بھی ہوتا تھا پہلے سے طے ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ آئے ہوئے تھے اور پروگرام کھانا کھانے کا نہیں تھا، رہنے کا بھی نہیں تھا۔ مغرب کے بعد جانے کا تھا۔ ہم دونوں بھائی، میں (مفتی رفیع عثمانی

---

[1] اصلاحی تقریریں: ۱۰۵/۵، ۱۰۶

صاحب) اور مولانا تقی عثمانی صاحب، اپنے بڑے بھائیوں کے سر ہوگئے کہ ہم نہیں جانے دیں گے۔ آج رات آپ یہیں رہیں یا کم از کم کھانا کھا کر جائیں۔ لیکن وہ جانا چاہ رہے تھے۔

ہماری یہ باتیں والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سن رہے تھے جو برابر کے ایک کمرے میں تھے۔ انہوں نے مجھے اور مولانا تقی عثمانی صاحب کو علیحدگی میں بلایا اور فرمایا: تم تو انہیں رکنے پر اصرار کر رہے ہو۔ تم نے اپنی اپنی بیویوں سے پوچھ لیا ہے یا نہیں کہ کیا ان کے پاس اتنے آدمیوں کے کھانے کا انتظام ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ ہم نے تو نہیں پوچھا۔ فرمایا کہ تمہاری تو زبان ہلے گی۔ ساری مشقت تو تمہاری بیویوں پر پڑے گی۔ اگر انہوں نے پہلے سے تیاری نہیں کر رکھی تو انہیں پریشانی ہوگی، انہیں روکنے سے پہلے تمہیں یہ بات دیکھنی چاہئے تھی کہ آپ کی بیویاں آسانی اور خوشی سے ان کے کھانے کا انتظام کر سکیں گی یا نہیں۔ ایسا سبق دے گئے کہ الحمدللہ، اب وہ ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ رکتے تو خود انہیں کتنی خوشی ہوتی، ہم سے کہیں زیادہ خوشی ہوتی لیکن ہمارے اس عمل پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہ شریعت کی رعایتیں ہیں، جنہیں اللہ والے جانتے ہیں۔[1]

خدمت کا صلہ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”جو دنیا میں کسی کی تکلیف دور کرے گا آخرت میں اللہ تعالیٰ اس کی تکالیف کو دور فرما دے گا۔[2]“ اور صرف اسی بنیاد پر اس کی تکلیف کو دور کیا جائے گا کہ اس نے دنیا میں لوگوں کی تکلیف کو دور کیا تھا۔

ایک اور حدیث میں فرمایا گیا کہ جب کوئی مؤمن اپنے مؤمن بھائی کے کام کے لئے کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو جہنم سے تین خندقیں دور کر دیتے ہیں اور ہر

[1] اصلاحی تقریریں: ۱۴۵/۵

[2] مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم، رقم: ۲۵۸۰

خندق کی چوڑائی زمین آسمان کے درمیان میں فاصلہ کے برابر ہے۔[1]

اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو آدمی میری اُمت میں سے کسی شخص کی کسی (دینی یا دنیاوی) حاجت وضرورت کو پورا کرے اور اس سے اس کا مقصد اس کو خوش کرنا ہو تو اُس نے مجھ کو خوش کیا (کیوں کہ مسلمان کی خوشی ہوتی ہے) اور جس نے مجھ کو خوش کیا اُس نے اللہ کو خوش کیا اور جس نے اللہ کو خوش کیا اس کو اللہ جنت میں داخل کرے گا۔[2]“

تشریح: مسلمان کی حاجت روائی کی فضیلت کو ”جامع صغیر“ کی روایت میں جس کو خطیب رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے یوں بیان کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس شخص نے اپنے بھائی مسلمان کی کسی حاجت وضرورت کو پورا کیا تو اُس کو حج وعمرہ کرنے والے شخص کے ثواب کی مانند ثواب ملتا ہے۔“

اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص مظلوم کی فریاد رسی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کے لئے تہتر بخششیں لکھ دیتا ہے اور اُن میں سے ایک بخشش تو وہ ہے جو اس کے تمام (دنیاوی واُخروی) امور کی اصلاح کی ضامن بن جاتی ہیں اور باقی بہتر بخششیں قیامت کے دن اس کے درجات کی بلندی کا سبب ہوں گی۔[3]“

اور حضرت انس اور حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما دونوں کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مخلوق خدا کا کنبہ ہے لہٰذا خدا کے نزدیک مخلوق میں سے بہترین وہ شخص ہے جو خدا کے کنبہ کے ساتھ احسان اور حسنِ سلوک کرے۔“ ان

[1] مجمع الزوائد، البر والصلة، باب فضل قضاء الحوائج: ۲۵۱/۸

[2] شعب الایمان، باب الشفقة: ۱۱۵/۶

[3] شعب الایمان، باب الشفقة: ۱۲۰/۶

تینوں روایتوں کو بیہقی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔[1]

تشریح: ''عیال'' کے معنی متعلقین کے ہیں اور کسی شخص کے متعلقین کا اطلاق اُن (افراد پر ہوتا ہے جن کی پرورش، جن کا کھانا پینا اور جن کی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل اس شخص کے ذمہ ہوتی ہے اور وہ اُن کے اخراجات اپنے روپیہ پیسے سے پورا کرتا ہے، لہٰذا اس معنی میں عیال کی نسبت غیر اللہ کی طرف تو مجازی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف حقیقی ہے، کیوں کہ رزاقِ مطلق حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی ہے جیسا کہ خلاقِ مطلق اُسی کی ذات ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾[2]

ترجمہ: ''زمین پر چلنے والا کوئی ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو۔''[3]

حدیثِ بالا کی تشریح میں حضرت مولانا منظور نعمانی صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ فرماتے ہیں ہماری اِس دنیا کا دستور بھی یہی ہے کہ جو کوئی کسی کے اہل وعیال کے ساتھ احسان کرے اُس کے لئے دل میں خاص جگہ ہو جاتی ہے۔ اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی یہی ہے کہ جو کوئی اُن کی مخلوق کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرے (جس کی مختلف صورتیں اوپر ذکر کی جا چکی ہیں) وہ اللہ تعالیٰ کو محبوب ہو جاتا ہے۔

فائدہ: یہ بات پہلے بھی بار بار ذکر کی جا چکی ہے، اور یہاں بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ اِس قسم کی بشارتوں کا تعلق صرف اُن بندوں سے ہوتا ہے جو کسی ایسے سنگین جرم کے مجرم نہ ہوں جو آدمی کو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور محبت سے بالکل ہی محروم کر دیتا ہو۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک بادشاہ اعلان کرتا ہے کہ جو کوئی میری رعایا کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا وہ میری محبت کا مستحق ہوگا، اور میں اُس کو انعامات

[1] شعب الایمان، باب الشفقة: ۶/۴۳

[2] ھود: ۶ [3] مظاھر حق: ۴/۵۵۹

سے نوازوں گا، تو ظاہر ہے کہ جو لوگ خود اس بادشاہ کے باغی ہوں یا دوسرے قابلِ معافی جرائم بطورِ پیشہ کے کرتے ہوں، (مثلاً قتل وغارت گری، ڈاکہ زنی وغیرہ) وہ اگر رعایا کے کچھ افراد کے ساتھ بڑے سے بڑا سلوک بھی کریں تب بھی وہ اس اعلان کی بنیاد پر بادشاہ کی محبت اور انعام کے مستحق نہیں ہوں گے، اور یہی کہا جائے گا کہ اس شاہی فرمان کا تعلق ایسے باغیوں اور پیشہ ور مجرموں سے نہیں ہے۔[1]

خدمت سے کیا ملتا ہے

حضرت مولانا حسین احمد مدنی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ اپنے استاد حضرت مولانا محمود الحسن رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ کے ہمراہ مالٹا میں نظر بند تھے، سخت سردیوں کا موسم تھا، حضرت شیخ الہند رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ کا معمول تہجد میں اٹھنے کا تھا۔ حضرت مدنی عشا کے بعد لوٹے میں پانی بھر لیتے اور اسے زمین پر رکھ کر ساری رات سجدے کی حالت میں خود اس کے اوپر سوئے رہتے تاکہ پانی ٹھنڈا نہ ہو اور تہجد میں حضرت شیخ الہند کو اس گرم پانی سے وضو کرواتے۔

حضرت مدنی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ نے اٹھارہ سال مسجد نبوی میں حدیث کا درس دیا۔ جب ہندوستان واپس آئے تو اپنے شیخ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بہت دن قیام کیا اور روزانہ خانقاہ کے لئے بازار سے سبزی لینے آپ خود تشریف لے جاتے اور فرماتے تھے کہ جو روحانی ترقی وخوشی مجھے مسجد نبوی میں درس دینے پر ملتی تھی وہی شیخ کی خدمت سے ملتی ہے۔ سبحان اللہ۔[2]

حضرت مولانا غلام رسول پونٹوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ کا مقام

ملتان سے آگے شجاع آباد کے علاقہ میں ایک بزرگ رہے ہیں، جن کا نام

[1] معارف الحدیث: ۲/۱۸۸ [2] مکتوبات فقیر: ص ۵۶

حضرت مولانا غلام رسول پونٹوی رحمہ اللہ تعالیٰ تھا، پونٹہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے وہ اس گاؤں سے تعلق رکھتے تھے، انہوں نے شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ سے دورۂ حدیث کیا، ان کو شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ سے ایسی والہانہ محبت تھی کہ حضرت جس راستے سے دارالحدیث آیا کرتے تھے یہ رات کو چھپ کر اس راستے کو اپنے عمامہ کے ساتھ جھاڑو کیا کرتے تھے، وہ اس لئے چھپتے تھے تاکہ دوسرے طلباء ان کو دیکھ نہ لیں۔

ایک مرتبہ شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عمامے سے جھاڑو دیتے ہوئے دیکھ لیا۔ انہوں نے پوچھا، غلام رسول! یہ کیا کر رہے ہو؟ بالآخر بتانا پڑا۔ شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ نے خوش ہو کر ان کو دعا دے دی۔ بس استاذ کی دعا شاگرد کے کام آگئی۔

ایک ہوتا ہے دعائیں کروانا اور ایک ہوتا ہے دعائیں لینا، ان دونوں میں فرق ہوتا ہے۔ دعائیں کروانا تو یہ ہوا کہ بیٹا کہے، امی! میرے لئے دعا کر دیں، ابو! میرے لئے دعا کر دیں، حضرت! میرے لئے دعا کر دیں۔ اور دعا لینا یہ ہوتا ہے کہ انسان اتنا نیک اور مؤدب بنے کہ اس کی نیکی کو دیکھ کر اس کے بڑوں کے دل سے دعائیں نکل رہی ہوں۔ آج کے دور میں دعائیں کروانے والے بڑے ہوتے ہیں مگر دعائیں لینے والے بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔

حدیث پاک میں آیا ہے کہ تین صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم تھے، تینوں کی اٹھتی جوانیاں تھیں اور تینوں کا نام عبداللہ تھا۔ یہ ایسے عباداللہ تھے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صحبت میں علم حاصل کرنے کے لئے اور آپ کی خدمت کے لئے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کے شوق اور جذبے کو دیکھ کر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دل اتنا خوش ہوتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کی نماز میں ان کا نام لے لے کر اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں فرماتے تھے۔ چناں چہ نبی علیہ السلام کی دعائیں

ایسی قبول ہوئیں کہ ان تینوں کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کے اندر امتیازی شان عطا کی۔ ان میں سے حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ امام الفقہاء بنے، حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما امام المفسرین بنے اور حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما امام المحدثین بنے۔

حضرت مولانا غلام رسول پونٹوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ سے دعا لی اور ان کا فیض چلا۔ شجاع آباد سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر ان کا گاؤں پونٹہ تھا۔ انہوں نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "شرح مائۃ عامل پونٹوی" ہے۔ ممکن ہے کہ کچھ علماء کی نظر سے وہ کتاب گزری ہو۔ طلباء شجاع آباد شہر میں بس سے اترتے اور تین کلومیٹر پیدل چل کر اپنا بستر اور سامان اپنے سروں پر رکھ کر پونٹہ جایا کرتے تھے۔ ان کے پاس تقریباً ساڑھے تین سو شاگرد ہوتے تھے۔ ان کا بھی خوب فیض پھیلا۔

ان کے دو شاگردوں کا نام عبداللہ تھا۔ ایک عبداللہ درخواستی رحمہ اللہ تعالیٰ جو کہ حافظ الحدیث تھے اور دوسرے حضرت مولانا عبداللہ بہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ جو شجاع آباد کے شیخ تھے۔ وہ ہزاروں علماء کے شیخ تھے۔ ان کا درس قرآن بہت معروف تھا۔

حضرت مولانا غلام رسول پونٹوی رحمہ اللہ تعالیٰ ایک مرتبہ خیر المدارس کے سالانہ جلسہ میں تشریف لائے۔ اس وقت پاکستان کے بڑے بڑے علماء موجود تھے۔ اس وقت حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان کو "شمس النحاۃ" کے لقب سے پکارا۔ اتنے علماء کی محفل میں جن کو شمس النحاۃ کہا جائے ان کے علم کا کیا عالم ہوگا۔ وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ اگر پوری دنیا سے شرح جامی کو ضبط کر لیا جائے اور کوئی بندہ میرے پاس آکر کہے کہ حضرت! مجھے شرح جامی کی ضرورت ہے تو میں شرح جامی کو متن اور اس کے حاشیہ کے ساتھ دوبارہ لکھوا سکتا

ہوں۔ [1]

خدمت کے بارے میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے چند ارشادات

مسلمانوں کی خدمت:

1. فرمایا کہ میں مسلمانوں کی خدمت کو طاعت اور سعادت سمجھتا ہوں بشرطیکہ کوئی مانع شرعی نہ ہو۔
2. فرمایا کہ میں بوڑھوں، سیدوں اور ذاکرین سے خدمت نہیں لیتا۔
3. فرمایا کہ میں نے نہ کسی کی خدمت کی نہ کسی سے خدمت لی۔ بزرگوں کی بھی خدمت نہیں کی۔ یہ اپنی اپنی عادت ہے، مجھ کو عادت ہی نہیں ہوئی۔ ہاں ایسوں سے خدمت لے لیتا ہوں جن کو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ ہم خدمت کر رہے ہیں نہ اس کو گمان خصوصیت کا ہو نہ دوسروں کو بھائی یہ مقرب ہے۔
4. ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ کوئی طریقہ سے خدمت لے تو خدمت کے لئے آدھی رات موجود ہوں۔ بے طریقہ خدمت سے معذور ہوں۔
5. ہر شخص کے رتبہ کے موافق اس کی قدر و منزلت کرو سب کو ایک لکڑی سے مت ہانکو۔
6. کسی کو سختی، تنگی میں مبتلا دیکھو تو حتی الامکان اس کی مدد کرو۔
7. حاجت مند کی کار برآری میں حتی الامکان سعی کرو اگر خود استطاعت نہ ہو کسی سے سفارش ہی کر دو بشرطیکہ جس شخص سے سفارش کرتے ہو اس کو کوئی ضرر یا تکلیف نہ ہو۔

[1] خطبات فقیر: ۸/۷۶

8. یتیم خواہ اپنا ہو یا غیر ہو اس کی کفالت سے سرکار نبوی ﷺ کی معیت بہشت میں ہوگی۔
9. جو کما کما کر بیواؤں اور عزیزوں کی خبر گیری کرے اس کو جہاد کے برابر ثواب ملتا ہے۔
10. ظالم کی خیر خواہی اس طرح کرو کہ اس کو ظلم سے باز رکھو اور مظلوم کی نصرت تو بہت ہی ضروری ہے۔
11. پانی پلانا بڑا ثواب ہے جہاں پانی کثرت سے ملتا ہے وہاں تو ایسا ہے جیسے غلام آزاد کیا اور جہاں کم ملتا ہے وہاں ایسا ثواب ہے جیسے کسی مردہ کو زندہ کر دیا۔
12. اگر کھانا پکانے کو کسی کو آگ دے دی یا کھانے میں ڈالنے کو کسی کو ذرا سا نمک دے دیا تو ایسا ثواب ہے جیسے وہ سارا کھانا اس نے دے دیا۔
13. ماں باپ کی خدمت کرو گو وہ کافر ہی ہوں اور ان کی اطاعت کرو۔ [1]

خدمت کی تین شرط ہیں:

فرمایا کہ خدمت سے گو راحت تو ہوتی ہے لیکن خدمت کے لئے تین شرطیں ہیں: ایک تو یہ کہ خلوص ہو یعنی اس وقت کوئی غرض اس خدمت سے نہ ہو محض محبت سے ہو۔ اکثر لوگ خدمت کو ذریعہ بناتے ہیں عرضِ حاجت کا، یہاں تک کیا ہے کہ بعد عشاء کے میں تھوڑی دیر لیٹ رہتا ہوں طالب علم بدن دبانے لگتے ہیں۔ چوں کہ بدن دبانے سے راحت ہوتی ہے۔ میری آنکھ لگنے لگتی ہے۔ جس وقت میری آنکھ لگنے لگی تو ایک صاحب نے جو بدن دبانے میں شریک ہو گئے تھے، مجھ سے کہا کہ مجھے کچھ پوچھنا ہے۔ انہیں واقعات سے میں دوسروں پر بدگمانی کرنے لگا۔ اس

[1] آداب المعاشرت: ۱۲٤

لئے میں تحقیق کر لیتا ہوں کہ کون کون بدن دبا رہا ہے۔ سوائے دو چار طالب علموں کے باقی سب کو رخصت کر دیتا ہوں۔ دوسری شرط خدمت کی یہ ہے کہ دل ملا ہو۔ ایک نووارد آکر بدن دبانے لگے یا پنکھا جھلنے لگے تو لحاظ بھی ہوتا ہے، شرم بھی آتی ہے۔ اب آدمی تختۂ مشق کیسے سب کا بن جائے۔ تیسرے یہ کہ کام بھی آتا ہو مثلاً بعضوں کو بدن دبانا نہیں آتا اور بعض موقعہ لحاظ کا ہوتا ہے اب ان سے کیسے منہ پھوڑ کر کہہ دیا جائے کہ آپ سے بدن دبانا آتا نہیں، آپ چھوڑ دیجئے مجبوراً چپ رہنا پڑتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم خدمت کر رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں ان کی خدمت کر رہا ہوں کہ کچھ بولتا نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ہم تکلیف اٹھا رہے ہیں، اس کے واسطے، اور میں سمجھتا ہوں کہ میں ان کے واسطے تکلیف اٹھا رہا ہوں۔ طالب علموں سے دل کھلا ہوا ہے اور ان کو طریقہ بھی آتا ہے ان سے کچھ تکلف بھی نہیں ہے، چاہے پاؤں پھیلا دیا، چاہے بیٹھ کر کے سو رہا، اب دو چار تو ایسے ہوتے ہیں، سب ایسے کہاں ہو سکتے ہیں۔[1]

[1] آداب المعاشرت: ۱۲۳

زیر نظر کتاب ''کسی کو تکلیف نہ دیجئے'' کا چند مقامات سے مطالعہ کیا، ماشاءاللہ بہت اچھی کاوش ہے، نیز حسن ترتیب اور معتبر حوالوں سے مزین بھی ہے، ان وجوہ تکلیف کی طرف اشارہ کیا گیا جن سے لوگ عموماً غافل ہوتے ہیں، نیز بعض مثالیں نہایت دل چسپ اور سہل انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ مؤلف کو بہترین صلہ عطا فرمائے اور ان کی اس خدمت کو قبول و مقبول فرمائے اور مخلوق کے لئے اصلاح و ہدایت کا ذریعہ بنائے، اور ادارہ کو زیادہ سے زیادہ قبولیت عامہ اور تامہ سے نوازے، اور ہم سب کو حسن معاشرت کے ساتھ زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے جو اللہ کو راضی کرنے کے لئے ہو، اور ہمیں دین کے تمام شعبوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

استاد حدیث **محمد انور بدخشانی**

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوریؒ ٹاؤن کراچی

۳۰ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ